حاصل گھاٹ

ہجرت کرنے والوں کے نام

بانو قدسیہ

☆

ہمارا نوساختہ گھر پہلی منزل پر ہے۔گیراج سے نکلتے ہی لش لش چمکتی پکی سڑک ہے۔یہ سڑک سرکاری نہیں۔اس ایریا کی ہاؤسنگ نے اسے تعمیر کیا ہے،لیکن اپنی پختگی ،صفائی ،ستھرائی میں یہ کسی بھی ہائی سے کو مات کرتی ہے۔امریکہ کا عمومی معجزہ جینز سڑکیں اور سپر مارکیٹ ہیں۔یہاں یورپ جیسے میوزیم ،گرجا گھر اور ثقافی عجائب گھر اپنی جغرافیائی شکل میں نہیں ہے۔امریکہ نیا نیا ،سادہ اور نوجوان ہے،امریکن نو دریافت براعظم سے اٹھ اٹھ کر جب یورپ کی پرشکوہ تہذیبوں سے بسی ہوئی پرانی بستیوں کو اپنی پھسلتی ٹوپی سنبھالتے ہوئے گردن اٹھا کر دیکھتے تھے تو بے مہر اطالوی فرانسیسی ،جرمن باسندے انہیں ککرمتوں کی طرح ہیچ اور نو دولتے سمجھ کر درخوار اعتنا نہیں سمجھتے تھے ۔پرانی تہذیبوں کے ٹھیکے دار لمبے تڑنگے ،ڈھیلے ڈھالے ان فصلی بٹیروں کو ابرو اٹھا کر دیکھنے کے عادی تھے پتہ نہیں کس وقت خدا نے ان کا بدلہ لینے کی ٹھانی نام دھرم نے والوں کو علم نہیں ہوتا کہ وقت کسی کو معاف نہیں کرتا پھر انہی اونچے شملے والوں کو اسی چوکھٹ پر ماتھا رگڑنا پڑتا ہے جہاں گردن اکڑائے فوں فوں کرتے وہ گزرتے جایا کرتے تھے ،اب امریکن یونیوسٹیوں ،بازاروں، دفاتر ،غرضیکہ سارے شعبہ ہائے دارورسن میں تارکین وطن کا ایک ریلا نہہ رہا ہے۔چینی، ہندوستانی، جاپانی، پاکستانی ،عربی ،حتیٰ کہ یورپی جو مدتوں اپنی شناخت پر نازاں رہے، اپنے آبائی لباس چھوڑ کر جینز بنیان میں ملبوس امریکنوں کے نقال بننے میں فخر محسوس کر رہے تھے۔

میرے گھر والے بھہ مور پنکھ لگا کر ہنس کی چال چلنے میں برتری محسوس کر رہے تھے اور گویا چتسمہ لے کر نو امریکن ہو گئے تھے۔میں اپنی بیٹی کے گھر اس لئے اجنبی سا لگا پھرتا تھا کہ یہاں پاکستانی ہونا ہی سب سے بڑا قصور ہے اور جو نالایق امریکن میں ہے

وہ ’’Itsbuthuman‘‘ کے ذیل آتی ہے۔

میری بیٹی سنگل فیملی گھر میں رہتی ہے۔اس کے سامنے سڑک پار کرتے ہی ایک تین منزلہ مخملی جلد والی بلڈنگ ہے،جس میں تین منزلہ اپارٹمنٹس ہیں۔سارے مکان ایک وضع کے بنے ہوئے ہیں۔جب میں گیراج کے اوپر بنی بیلکونی میں بیٹھ کر سڑک پار دیکھتا ہوں تو عموماً میری نظر سامنے والے اپارٹمنٹوں پر پڑتی ہے دوسری منزل جس مکان میں بیلکونی کے ساتھ تھوڑی سی کھلی جگہ میں جرنیم کے گملے پڑے ہیں،وہاں ایک گریک گھرانہ رہتا ہے۔یونانی فلسفہ اور تھیٹر کی روایت سے بچھڑے ہوئے یہ لوگ عماً بیلکونی پر آکر سگریٹ پیتے ہیں۔بیٹا ٹرک چلاتا ہے۔اتنا بڑا ٹرک جس میں پورا اپارٹمنٹ سما جائے اس کی امریکن بیوی شہر سے دور کسی فیکٹری میں کام کرتی ہے کیونکہ صبح چار بجے اس کی ٹھنڈی فوکس کو بار بار کلچ دبا کر گرم کرنے کی ضرورت پڑتی ہے ۔میں بیلکونی میں بیٹھا بوڑھے گریک کو دیکھتا ہوں۔وہ بھی کبھی کبھی ہاتھ ہلا کر مجھے وِش کر دیتا ہے مجھے کس زبان میں سلام کرتا ہے،میں نہیں جانتا اسی لئے انٹرنیشنل ازارہ ہی سلامتی برادر بنتا ہے۔ویسے بھی اب انٹرنیشنل طریقہ سلام میں لفظ اہم نہیں رہے.....ہاتھ اٹھا کر صبح بخیر کا اشارہ ہی بہت ہے۔امریکہ میں سلام کرنے کا رواج عام ہے۔جنگلوں میں،راستوں پر،بازاروں میں لوگ ایک دوسرے کو ہائے کہہ کر صبح بخیر،شام بخیر کہنے کے عادی ہیں..... ہلکی سی مسکراہٹ اور.....انسان کی انسان شناسی اور خدا حافظ......بوڑھا یونانی سانولی رنگت کا مالک ہے۔اس کا سر قریباً گنجا ہے اور کان سے کان تک گردن سفید بالوں کی جھالر ہے۔وہ دنیا کو قانونی عطا کرنے والوں سے نکل کر یونان کو چھوڑ کو امریکی قانون پرست ہو چکا ہے۔ہاؤسنگ والوں کا حکم ہے کہ کوئی مکین گھر کے اندر سگریٹ نہیں پی سکتا کیونکہ لکڑی کے گھروں میں آگ کی واردات عموماً چپکے سے ہو جاتی ہے۔اسی لئے یہ بہو،بیٹا باپ سب جرنیم والی بیلکونی پر کل کر سگریٹ پیتے ہیں۔چونکہ گرمیوں کا موسم ہے،اس لئے یونانی بر موڈا نیکر پہنے رکھتا ہے۔اس کے گھٹنوں کو اسی لیے میں دیکھ سکتا۔ایسی نیکر کا برموڈا نیکر

نام نہ جانے کیوں رکھا گیا۔کیا اس کا تعلق برموڈا تکون سے ہے؟

اس سائنسی دور میں بھی انسان اسرار سے محبت کرتا ہے۔ان دیکھی ان چاہی ان سمجھی منزلیں اسے کھینچتی ہیں۔ایک مدت سے برموڈا تکون بھی ایک الجھن ایل پہیلی بنی ہوئی ہے۔اٹلانٹک میں برموڈا،میامی،فلوریڈا، سان جوآن،پورٹوریکو کے درمیان ہے،اس علاقے میں ان گنت ہوئی اور بحری جہاز راستہ بھولے،غرقاب ہوئے ان کی پر اسرار گمشدگی سے متاثر ہو کر بے سمار لوگوں نے اس پر ریسرچ کی ۔قریباً2000 کشتیاں یہاں راستی بھولیں اور زیر آب ڈوب گئیں۔سنتے ہیں سن 1991ء میں ہالووین رات تھی ،جو ورڈی پائیلٹ Talla Hasse کی جانب جہاز لے جا رہا تھا کہ برموڈا تکون میں پھنس گیا یکدم اس کی آواز بگڑ گئی۔وہ خوفزدہ ہو کر رطب ویابس بکنے لگا۔۔۔"نومبر کی دوسری تاریخ ..... چار وہسکی جولیٹ میں ...... ہٹاؤ دو پانچ تین ...... زیرو زیرو...... اور پر چڑھنے کی درخواست دو مرتبہ نوصفر .... اوور........ اوور....... "آواز ختم .... جہاز غائب .... کنٹرول روم دم بخود ...... اسرار آج تک لاینحل ..... ہولووین کی پر اسرار رات...... سن 1991ء کا سال۔

واقعات کے تواتر کے باعث سائنس دان اسرار معلوم کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔کچھ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اس تکون میں دارصل شمالی اور مقناطیسی شمال میں بنیادی فرق ہے۔اسی بیس ڈگری کے فرق کے باعث حادثات ہوتے ہیں۔دنیا کا مقناطیسی شمال نارتھ پول سے 1500 میل دور ہے۔اس بات کا دھیان جب نہیں کیا جاتا تو بحری اور ہوائی جہاز شمالی پہنچنے کی بجائے پرنس آف ویلز کے جزیرے پر پہنچ سکتے ہیں اور اسی غلطی کے باعث برموڈا تکون حادثاتی کہانیوں کی دیومالا بن گیا ہے۔

ساحلی گارڈوں نے اس اسرار میں کئی قسم کے اضافے کیے ہیں۔کچھ سائنس دان اس نتیجے پر پہنچے ہے کہ ان حادثات کی بنیادی وجہ Static بجلی ہے..... متجس

لوگ خود جا کر تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔سر پھرے کہانی گھڑنے کے شوق میں پہنچ جاتے ہیں۔اخباری دنیا ویسے ہی خبر بنانے کی خاطر اس ابلیسی تکون میں گہری دلچسپی رکھتی ہے۔

ایک بات طے ہے کہ انسان تحقیق کے باوجود ابھی تک یہاں کے اسرار کو جان نہیں پایا۔اس 1,50,00 مربع میل کے علاقے، سے متعلق ان گنت کہانیاں گھومتی پھرتی ہیں۔کچھ دیو مالائی، کچھ من گھڑت .... یہ انسانی ذہن کا تضاد وصف ہے کہ وہ ہمیشہ حقیقت سے خیال اور خیال سے حقیقت کی طرف سفر کرتا ہی رہتا ہے۔اسے تحقیق اور خواب سے برابر کی محبت ہے اور وہ ان دونوں کے درمیاں جھولے کی مانند آتا جاتا ہے۔جسم ہمیں اندر کی جانب دھکیلتا ہے اور روح کی وسعت سمٹ سمٹا کر ہمیں باہر کی جانب دھکیل دیتی ہے۔انسان کے اندر بھی ایک برموڈا تکون ہے جس میں اس کے جہاز کشتیاں غرق ہوجاتی ہے اور پھر ساری زندگی ان غرقاب جہازوں کے لئے Rescue Parties بھیجتا رہتا ہے.... کبھی سائنس تحقیقی تاویلین دیتا ہے، کبھی بھید بھاؤ کے انتر دریافت کرنے میں گزرتا ہے.... کسی مقام، وقت اور حالات میں اس کے اندر باہر طمانیت کی نرم ہوا نہیں چلتی تا آنکہ.... اوپر سے فضل نہ ہوجائے۔

''ابا جی.....''

''جی بیٹا......''

''ہم ایک دن Left Overs کھاتے ہیں اور سنڈے کو میں کوکنگ کرتی ہوں اور سارے ہفتے کی dishes تیار کر کے فریزر میں رکھ دیتی ہوں۔میرا خیال ہے آپ مائنڈ نہیں کریں گے۔دیکھئے ناں مجھے بھی کام پر جانا ہوتا ہے۔آپ فریزر میں سے کچھ نہ نکالیں اور جو کچھ فریزر میں رکھا ہوا ہے، آپ مائیکرو ویو اوون میں ڈال کر گرم کر لیں۔ہم ڈسپلن سے Organize ہوکر زندگی گزارتے ہیں

...... افسوس میں آپ کی ویسی خدمت نہیں کرسکتی جیسی پاکستان میں کرتی تھی، لیکن امید ہے آپ یہاں کے طریقے سیکھ جائیں گے۔" ارجمند کے لہجے میں وضاحت ہے۔ جیسے وہ

کسی سیمینار سے مخاطب ہو۔

"بالکل بالکل میں سمجھ گیا ہوں۔ یہاں کی زندگی اور ہے، وہاں کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔"

"ابا جی دیکھئے نا وہاں سارا گھریلو نظام ملازموں کے سہارے چلتا ہے۔ پھر عورتیں گھر پر ہوتی ہیں۔ تازہ پھلکا روٹی مل سکتی ہے۔ یہاں تو پیتا بریڈ سے ہی کال چلانا پڑتا ہے......"

"بالکل بالکل..... میری فکر نہ کرو..... میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔"

"خیر جی Worry تو ہوتی ہی ہے ابا جی۔ آپ کے دانت بھی خراب ہیں۔ میں آپ کے لئے کسی قسم کی بریڈ لائی ہوں، لیکن پھلکا پراٹھا نہیں پک سکتا پراٹھے تو شاید پکا کر رکھا جا سکتا ہے، لیکن روٹی خشک ہو جاتی ہے.... آپ لیٹ جائیں تھوڑی دیر کے لیے۔"

"نہیں ٹھیک ہے......"

"کوئی فلم لگا دوں؟..... ٹی وی پر... وہ سی آر والی"

"نہیں نہیں تم میری فکر نہ کرو ارجمند .... میں وہاں بھی اکیلا تنہا تھا۔ مجھے تنہا رہنے میں وقت پیش نہیں آتی"

"کوئی چیز درکار ہو مارکیٹ سے؟..... میں آگ گروسیز کرنے جاؤں گی کام کے بعد....."

"مجھے کچھ نہیں چاہئے ارجمند"

"جمشید اور قیصر سکول بس سے آتے ہیں۔ وہ بل دیں گے تو دروازہ کھول دیجئے

گا"

مجھے پوچھنا تو نہیں چاہئے تھا، لیکن میرے منہ سے نکلا "بھائی جب میں نہیں تھا تو پھر بچے کیسے گھر میں داخل ہوتے ہیں...."

"ان دونوں کے پاس اپنی اپنی چابی ہے ابا جی ...." ارجمند ہنستے ہوئے بولی "دونوں بڑے Independent ہیں۔اگر کوئی ایمرجنسی ہو جائے تو ساتھ والے گھر میں ڈورتھی رہتی ہے وہ رات کو ڈیوٹی پر جاتی ہے۔دن کو گھر پر ہی ہوتی ہے ۔بچے اس سے ہلپ لے لیتے ہیں۔اگر کبھی وہ بھی گھر پر نہ ہو تو Alone Hotline Home کا نمبر دے رکھا ہے کئی Grandmas--Grandpas والنیٹر بھی تین سے لیکر چھ بجے تک فون پر مل جاتے ہیں۔بچوں کو کوئی دقت پیش نہیں"

"پھر بھی ارجمند..... بچے تو آخر بچے ہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں ابا جی ۔وہ آپ کو بالکل نہیں ستائیں دے وہ Sefl Sufficient ہیں۔فریج سے نکال کر کھا لیں دے۔ویسے قیصر تو دودھ اور چپس کچھ نہیں کھاتا..... ابھی مونٹسوری میں ہی تو جاتا ہے"

"ٹھیک ہے... ٹھیک ہے۔میں یہاں دخل اندازی اور مشورے دینے کے لئے نہیں آیا....."

"اچھا ہے ابا جی...... آپ کا چینج ہو جائے گا۔روٹین سے بریک مل جائے گی ۔ایک ہی جگہ رہ رہ کر آدمی بور جاتا ہے ۔مجھے خوشی ہے کہ آپ نے ہمت کی.... اور میرے پاس آ گئے.... میرے مان لی۔"

میں ارجمند کو بتا نہ سکا کہ مجھے نہ تو تبدیلی کی ضرورت تھی نہ ہی میں رٹین کو توڑنے کے لئے اس کے پاس آیا تھا۔مجھے پتہ نہیں کیوں ایک خوف تھا، ایک تشویش تھی کہ شاید ارجمند سات سمند پار ایک نئے معاشرے میں لب سیئے دبی دبی، گھٹن بھری زندگی بسر کر رہی ہو۔میں اپنی آنکھوں سے اپنے حساب کے مطابق اس کے ماہ و سال

کا اندازہ لگانا چاہتا تھا.... باپ کی بھی عجب مصیبت تھی۔ وہ بیٹی سے کٹ کر بھی علیحدہ نہیں ہو پاتا اور بیٹے کے ساتھ رہ کر بھی اسے مل نہیں پاتا۔

امریکہ پہنچ کر کسی نو وارد نے پڑتا لگایا کہ کسی ملک میں نوشہری ہونے کے معنی یہ ہیں کہ زیادہ سے زیادہ سوال نہ پوچھے جائیں، ورنہ لوگ آپ کو انجان سمجھ کر کمتر جانیں گے۔ لوگوں کو اشیاء کی طرح سمجھیں، استعمال کریں اور پھر آزاد چھوڑ دیں۔ درد دل اے اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔ اپنے آبائی وطن کو پہلی بیوی کی مانند کہیں اندا ینت کر رکھیں، لیکن اس کی خوبیوں خرابیوں کا قطعاً ذکر نہ کریں۔ پتہ نہیں سننے والے پر اس ذکر کا کیا اثر ہو..... ایک ہی شخص کو دو مرتبہ دھوکا نہ دیں۔ آپ کے وطن کی شہرت کا سوال ہے..... پس ماندہ ترقی پذیر ملکوں کے نادار لوگوں کی مدد کرنے والے اداروں کو چندہ نہ دیں۔ نہ جانے ان کے پیچھے سیاسی کٹھ جوڑ کیا ہو.... ہمیشہ ایسی تحریکوں میں شامل ہوں جو گلہریوں، Flaminqoes اور Skunks کے لئے پریشان ہیں۔ وائلڈ لائف میں دلچسپی لینے سے انسان زیادہ کلچرڈ لبرل اور انسان دوست شمار ہوتا ہے۔

یہ انفرمیشن مجھے ایک مقامی رسالے سے ملی تھی۔ ایسے اخبار رسالے سیروں کے حساب سے مغربی ممالک میں چھپتے ہیں۔ ان میں سیکنڈ ہینڈ قسم کی گوسپ، مشورے ار خبریں ہوتی ہیں۔ پہلے میں یہ تھبے اٹھا کر اندر لے آتا تھا اور بیلکونی میں بیٹھ کر وقت بے وقت پڑھتا رہتا تھا، لیکن اب ارجمند نے مجھے منع کر دیا ہے۔

''ابو یہ اخبار اندر کون لایا.... ردی انفرمیشن!''

میں اب یہ اخبار رسالے گھر کے پچھواڑے چھوٹے سے باغ میں بیٹھ کر پڑھتا ہوں اور تقابلی سوچوں میں ڈولتا رہتا ہوں۔

جب میں گیراج کے اوپر بیلکونی میں بیٹھ کر دیکھتا ہوں تو سامنے والے اپارٹمنٹس کی بلڈنگ کے ساتھ مجھے ایک ننھا منا سا باغ نظر آتا ہے۔ اس میں چھوٹا سا سلائیڈ

ہے، دو تین جھولے ہیں۔ایک جنگل جم ہے جو کافی خطرناک کھیل ہے۔لوہے کی اس بھول بھلیوں میں بچے الٹے لٹک کر اپنی گردن تڑوا سکتے ہیں۔اس پارک میں امریکن بچے عموماً اکیلے آتے ہیں۔خود اعتماد بچوں کے ساتھ کوئی نرس، آیا ماں یا دادا نہیں ہوتا لیکن کالے، امریکن، ہندوستانی، پاکستانی اور دوسرے تارکین اپنے بچوں کے ساتھ کسی نہ کسی بڑے کو ضرور بھیجتے ہیں۔میری گوری بیٹہ ارجمند اور اس کا دبلا پتلا لمبا ڈاکٹر میاں اپنے آپ کو ایشیائی نہیں سمجھتے۔جس طرح ترک نژاد اپنے آپ کو یورپ کا حصہ بنانے پر بضد ہیں، ایسے میری بیٹی اور ڈاکٹر داماد مصر ہیں کہ امریکن سیٹزن ہو جانے کے بعد اب ان پر امریکی مہر پکی ہو گئی ہے۔ان کا خیال ہے کہ امریکہ تو بنیادی طور پر تارکین ہی کا وطن ہے، اس لیے وہ بے وطنے نہیں ہیں۔وہ بھی قیصر اور جمشید کو اکیلے ہی باغ میں بھیج دیتے ہیں۔میں جب سے آیا ہوں، نہ جانے کس خوف کے تحت میں بھی کھسکتا کھسکتا ان کے پیچھے پہنچ جاتا ہوں حالانکہ انہیں میری ضرورت نہیں ہوتی۔پتہ نہیں یہ احساس کمتری ہے کہ احساس تحفظ!

باغ میں جمشید اور قیصر کو میری قطعاً ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔وہ Slides اور جھولے بڑی آزادی اور خوش اعتمادی سے استعمال کرتے ہیں۔اگر کبھی گر جائیں تو ریں ریں روں روں کر کے روتے نہیں دیکھا۔وہ آپس میں ایک جملہ بول کر معاملہ درست کر لیتے ہیں۔ It"Brave----"Don't be Sissy"---"Be a Man" میں بینچ پر بیٹھ کر چوری چوری ان کی نگرانی بھی کرتا ہوں اور سوچتا بھی رہتا ہوں کہ ایک بہادر آدمی کو ایک Bully بننے میں کتنی دیر لگتی ہے؟

1971ء میں جب روس نے اشتراکی نظام حکومت اپنایا اور دنیا میں دو بہادر سپر پاورز کا وجود ابھرنے لگا تو جلد ہی دنیا نے دیکھا کہ ساری دنیا کو ان دو بہادروں نے

بندر بانٹ کے فلسفے کے تحت، اپنے اپنے لیے مارکیٹ تلاش کرنے کے سلسلے میں اپنی حاکمیت جتانے کی خاطر تھرڈ ورلڈ کی اعنت شروع کر دی.... امریکہ اور روس کی دیکھا دیکھی یورپ اور انگلستان بھی اس دوڑ میں کود پڑے۔ اب تھرڈ ورلڈ میں اسلحہ ، دوائیں، ناکارہ اور کارآمد ٹیکنالوجی کے بازر لگ گئے۔ ابھی ترقی یافتہ مما لک Sick Industries کے تصور سے نا آشنا تھے۔ اسی لیے رفتہ رفتہ اپنے دباؤ اور بہادری کے ذریعے ساری دنیا Zone میں بٹ گئی۔ اب کچھ امریکہ کے بٹیرے تھے اور کچھ روس کے لوٹے۔

لیکن 1991ء میں جب روس کے اقتدار کے پرخچے اڑے اور دنیا میں ایک ہی سپر پاور رہ گئی .... تو ایک اور آدری تحریک فیل ہوگئی... حالات کچھ اور کے اور ہو گئے۔ اب امریکہ اور بھی بہادر، بولڈ اور دہشت پسند ہو گیا۔ وہ اپنے نیو ورلڈ آرڈر سے دنیا کے ممالک کے دھمکانے ، ڈرانے اور پچکارنے میں کامیاب ہونے لگا.... لیکن اندر ہی اندر اسے ایک طاقت کا خوف تھا.... روس کی آدرشی تحریک دم توڑ گئی، لیکن اسلام کی طاقت اندر ہی اندر امریکہ کو کہیں سہار ہی تھی..... اگر تمام مسلمان حکومتیں کسی طور پر یکجا ہو جائیں، پھر یہ اتنی لمبی چوڑی Belt کو توڑنا یا سنبھالنا اس کے لئے مشکل ہوتا۔ لکڑی کا یہ گھٹا توڑنا اس کے لئے ممکن نہ ہوتا، لیکن امریکہ کے بہادر جیالوں نے ہر مسلمان مملکت کے لئے الگ پلان بنایا۔ ایران اور عراق کی جنگ میں دو مسلم طاقتوں کو آپس میں لڑا کر دونوں طاقتوں کو کمزور کر دیا۔ ان طاقتوں کے دانت کھٹے کرنے کے بعد سعودی عرب کو یقین دلایا کہ اب عراق ان کی سالمیت کو دھچکا لگانے والا ہے۔ اس کے لیے کویت کی حکومت کو ایکشن پر اکسایا اور خود سعودی عرب میں اپنے جنگی سوائل لے کر ایسے بیٹھ رہا کہ ہلانا مشکل۔ سوڈان کو دہشت گرد بنا کر خانہ جنگی اس پر مسلط کر کے اسے تباہ کر دیا۔ پاکستان کو حکومتوں میں باہمی تنازعوں کو فروغ دے کر بدنظمی اور بدنظامی میں مبتلا کر کے دولخت کر دیا۔ ترکی کو یورپ کی منڈی کا حصہ

اس لئے بننے نہ دیا کہ وہ احساس کمتری کا شکار ہو کر امریکہ کے آگے کاسہ گیر رہے اور امریکہ کے لئے جاسوسی کرتا رہا۔الجزائر میں ڈیموکریسی کا پتا پھینکا اور جب دیکھا فنڈا منٹلسٹ کامیاب ہو گئے ہیں تو یہاں فوجی راج قائم کر دیا۔افغانستان کو روس کی آدرشی تحریک ختم کرنے کے لئے استعمال کیا اور بعد ازاں احسان فراموشی کا ثبوت دیا۔بوسنیا کو سربیا اور کروٹیز کے آگے پھینکا اور کچھ کرنے جوگا نہ چھوڑا۔

روس کی شکست کے بعد امریکہ نے مسلمان ملکوں میں اپنے اسلحہ کے مارکیٹ قائم کیے۔وہ ترقی پذیر ملکوں کو ایسا بیچتا جو زیادہ Sophisticated نہ تھا۔بہادر امریکہ کو علم تھا کہ جب کسی ملک میں اسلحہ ہوتا ہے تو وہ استعمال میں ضرور آتا ہے۔پھر ہر مظلوم اسی اسلحہ کے ہاتھوں کبھی کبھی ظالم بھی بن جاتا ہے،دین دار گروہ تک اپنی حفاظت کے لئے اسی اسلحہ کا سہارا لیتے ہیں۔سیاسی

جماعتیں اپنی مضبوطی اسی اسلحے سے قائم کرتی ہیں.... کمزور کو ان ہی ہتھیاروں سے طاقت ملتی ہے۔پھر اسی اسلحے کی برکت سے شہروں میں وارداتیں ہونے لگتی ہیں۔گروہی اجتماعی جھگڑے فروغ پاتے ہیں۔ڈاکو اٹھائی گیرے،دہشت گرد اسی اسلحے کی بنا پر زیادہ جی داری کے مظاہرے کرتے ہی۔ٹرینوں میں بم پھٹتے ہیں۔کاریں چرائی جاتی ہیں،ڈکیتیاں ہوتی ہیں۔ان تمام وارداتوں کی تفاصیل سپر پاور کے کارندے فتح مندی کے ساتھ اپنے مالکان تک پہنچاتے ہیں....ایسے ملکوں میں میر جعفر جیسے شخص تلاش کرنا بھی مسکل نہیں ہوتا۔شک وخوف سے لرزاں شہریوں کو دو نظریوں،دو پارٹیوں میں تقسیم کرنا بھی مشکل نہیں..... مسلمان ملکوں کو کسی وقت بھی کوئی میر جعفر اپنی حرص کے باعث اسلحے کی فراہمی کے ہاتھوں خانہ جنگی میں ڈبو سکتا ہے۔مسلمانوں کی زبوں حالی کسی وقت میرا ساتھ نہیں چھوڑتی اور میں اس سلسلے میں کچھ کر بھی نہیں سکتا۔تب ہی سانده کلاں میں رہتے تھے۔

کرشن نگر سے آگے متوسط لوگوں کی بستی تھی۔یہاں کے گھر پکے،صحن گھر کے اندر

اور گھروں میں بسنے والے نچلے درمیانی انکم کے لوگ تھے۔ان لوگوں کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ حیادار تھے۔اپنے آپ کو قسم کی حد تک شریف سمجھتے اور دوسروں کی نظروں میں شریف رہنے کے لئے بڑے جتن کرتے، بڑی بڑی قربانیاں دے کر بھی اپنا Image برقرار رکھتے۔قرضے لینے اور دینے سے گھبراتے۔بچوں کو گلیوں میں کھیلنے سے منع کرتے اور عورتوں کو چادر یا برقعے میں دیکھ کر اطمینان کا سانس لیتے، ہر وقت ناک کی سیدھ چلنے میں لگے رہتے۔ابا نے بھی قیام پاکستان کے بعد ایسے ہی ایک گھر کو پینتیس روپے ماہوار کرائے پر لے رکھا تھا۔ابا سیکرٹریٹ میں ملازم تھا اور کلرک ہونے کے ناطے اس کی ذہنیت میں مے ن میخ نکالنے کی عادت تھی۔جس طرح کلرک کو رولز کا علم ہوتا ہے، ایسے کسی افسر کو اپنی طقت اور نا طاقتی کی حدود کا علم نہیں ہوتا۔کلرک ہی افسر کو صاحب بہادر بناتا ہے، وہی اسے من ماننا سکھاتا ہے اور وہی اس کا انفنٹری فورس بھی ہوا کرتا ہے۔افسر کی ساری جان اسی کلرک کی مٹھی میں ہوتی ہے۔پی اے اور کلرک کے سامنے افسر کی نجی اور سرکاری زندگی کے کئی ایسے صفحے موجود ہوتے ہیں جنہیں Confidential کہا جاتا ہے۔

ابا گھر میں گھستے ہی کلرک نہ رہتا۔وہ سیکریٹری ایجوکیشن بن جاتا جس کے سامنے کھڑے ہو کر آبا خود Dictation لیا کرتا تھا۔۔۔۔ہم پانچوں بھائی بہن ابا کو دیکھ کر پرندوں کی طرح اڑنچھو ہو جاتے۔بڑے بھائی شاہد البتہ ابا جی نہ دبتے تھے۔رفعت آپا اور شاہد بھائی کی اپنی Category تھی۔وہ دونوں ڈارکل اورینٹل نہیں تھے، لیکن غائب وہ بھی ہو جاتے لیکن بڑے رعب سے۔

تب شاہد بھائی فارتھ ائیر میں پڑھتے تھے۔ابا کے لئے سیکرٹریٹ دور نہ تھا تو شاہد بھائی کا ایم اے او کالج بھی قریب ہی تھا، لیکن شاہد بھائی اپنی نویافت آزدی میں سرشار تھے۔وہ اپنے بھانویں شاعر بن رہے تھے کالج کی سرگرمیاں تو انہیں گھر سے

دور لے جاتی ہی تھیں ۔اوپر سے رات کو کافی ہاؤس کی نشستیں بھی انہیں گھر سے غائب رکھتی تھیں ۔ابا کو جلد سونے کی عادت تھی اسی لیے ان کا ٹاکرا شاہد بھائی سے نہ ہوتا ۔اماں چولہے کے پاس بیٹھ کر شاہد بھائی کا انتظار کرتی رہتیں۔ان کے نزدیک محبت میں تکلیفیں سہنا، ایثار کرنا اور دوسرے کے آرام راحت کی خاطر اپنی ذات کو تلف کرنا دلیل محبت تھی ،شاہد بھائی کے لیے وہ اس طرح کنڈی کھولتیں کہ ذرا سا شور بھی نہ ہوتا ،چپاتی یوں پکائی جاتی کہ رتی بھر کھڑاک نہ گونجتا۔پھر اماں ستر پوش اتنی زیادہ تھیں کہ ابا تک یہ رپورٹ کبھی نہ پہنچی کہ رات شاہد دیر سے آیا.... اس محبت نے شاہد بھائی کو بے باک کر دیا۔انہیں وقت بے وقت کج راہ ہونے پر آمادہ کیا۔اس بات کا اماں کو نہ احساس تھا نہ ادراک، وہ تو بس اپنی توڑ نبھانے کی فکر میں تھیں ۔انہوں نے کبھی کسی سے کوئی توقع نہ رکھی..... نہ اپنے بچوں، نہ اپنے شوہر نہ اپنے کسی عزیز رشتہ دار سے ......وہ صرف اپنا لیکھا صاف رکھتی تھیں ۔ماں نے ساری عمر جھوٹ نہیں بولا، نہ اپنے آپ سے نہ کسی اور سے۔

جب انسان محدود خواہشوں اور ضرورتوں کا پابند ہوتا اسے زیادہ جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی، لیکن جب کبھی اسے گھر کے خرچ سے کچھ پیسے نکال کر شاہد بھائی کو دینے پڑتے تو وہ اس کا ذکر نہ اپنے آپ سے کرتیں، نہ ابا جی سے..... اور جھوٹ کے اس واحد کنوئیں میں گر جاتیں۔اس گھٹتی لڑائی سے پسپا ہو کر کبھی کبھی وہ اونچے اونچے استغفار پڑھنے لگتیں اور اپنے آپ کو عادی مجرم اور گناہ ہی سمجھنے پر مجبور ہوتیں، اماں کی اسی بے جان ،نا تواں محبت نے شاہد بھائی کو گرد ایسا حصار باندھ رکھا تھا جس سے نکل کر وہ کبھی دور نہ جا سکے ۔جس طرح مہارانی سیتا کی کٹیا کے باہر مہاراجہ رام چند نے ایک لکیر کھینچ دی تھی جس سے باہر نکلنے کا آڈر نہ تھا۔ایسے ہی اماں کی سب انتظاریوں نے شاہد بھائی کی شاعر مزاجی کو پابند کر لیا تھا۔وہ لمبی اڑانوں پر

جانے کی آرزو تو رکھتے تھے لیکن وہ کولمبس نہ بن سکے اور کسی نئی دنیا کا انکشاف ان کا مقدر نہ ہو سکا۔

افریقہ کی کھوسہ زبان میں جانوروں کے سینگوں کے لیے گیارہ مختلف لفظ ہیں۔ آگے جھکے ہوئے، پیچھے کی جانب باہر کو مڑے ہوئے، چھدرے، سخت، مڑ کنے وغیرہ۔ جنگل کے باسی ان الفاظ کے بغیر جانوروں کو بیان نہیں کر سکتے۔ جس طرح ایک آرٹسٹ رنگوں کے ہر شیڈ ول کے نئے لفظ سے واضح کرتا ہے۔ آج ترقی کے عہد میں بہت سے نئے الفاظ ایجاد کی تازگی کے ہمراہ در آئے ہیں۔ کمپیوٹر، فون، کریڈٹ کارڈ، سی ڈی ٹیلی ویژن، ای میل، فیکس، مائیکروا وون لیکن ان اشیاء کے درپردہ جو الجھنیں، تاویلیں، نظریئے، جو ازپیدا ہو رہے ہیں اور اندگی میں نئی ایجادات، حالات کے باعث جو دھارا بہہ رہا ہے۔ اس کی اصلاحات ابھی مکمل اور عام نہیں۔ افقی سوچ منفی رویے فوکس۔ ڈیزائین، ورلڈ آرڈر، ہیومن رائٹس، سسٹم، گڈ گورنس، ڈیموکریسی ڈیزائنر کپڑے ایسی بے شمار اصلاحات نئی ہیں۔ لیکن افسوس وہ اصطلاحات سوسائٹی سے غائب ہو رہی ہیں جو اماں کی انتظاریوں کو ظاہر کرتی تھیں.... زندگی کی رفتار تیز ہو جانے کے بعد اپنی من مانی کو شعار زندگی بنا کر محبت، گھائل بہادری، انتظار، ایثار ماحتا، سہاگ، حیا، وفا ایسے ہی الفاظ استعمال میں نہ ہونے کے باعث خوبیدہ الفاظ کی ذیل میں آنے لگے ہیں۔ طریق زندگی بدلنے کی وجہ سے یہ وہ معنی ظاہر نہیں کرتے جو کبھی استعمال میں تھے اور بامعنی بھی تھے۔

ہمارا گھرانہ گاؤں سے آیا تھا۔ اپنے ساتھ ہم گاؤں والوں کی خوش اعتمادی بھی لائے تھے۔ درختوں، کھیتوں، جنگلوں میں رہنے کے باعث پرندوں جانوروں کی ہم جنسیت کی وجہ سے گرائیں کا ذہن تروتازہ ہوتا ہے۔ وہ تجربے سے سیکھتا اور فوک

وزڈم پر بھروسہ کرتا ہے۔اس میں وہی معصومیت۔اکھڑپن، سادگی اور بے ساختگی بھی ہوتی ہے جو گاؤں والوں کے رسم ورواج اور لوک ریت میں نظر آتی ہے۔کھیتوں میں گھومتے پھرتے دیہاتی تازہ سبزی، گنے، بیر، پیلو، کروندے غرضیکہ ہر تازہ چیز کو بہ آسانی منہ مار سکتا ہے۔چونکہ کسان کی خوارک دودھ، دہی، مکھن، لسی، تازہ غلے اور گڑ شکر کا مجموعہ ہوتی ہے۔اس لیے اس کا توانا جسم جاندار ذہنیت کو جنم دیتا ہے۔وہ چلتے چلتے اکھان بناتا اور اندہ رکھتا ہے۔پینڈو کی زندگی اس کے تجربے اور مشاہدے کیا ہوتا ہے جس کا وہ ذکر کرتا رہتا ہے۔شہری انسان کا علم کتاب میڈیا اور سنی سنائی کا مرہون منت ہوا کرتا ہے۔کئی بار شہری کو اپنے شہر کا جغرافیائی نقشہ بھی معلوم نہیں ہوتا اور ان اشیا کی واقفیت بھی نہیں رکھتا جن کا خرچ اس کی جیب پر بار ہوتا ہے لیکن وہ ان چیزوں کا ذکر کرنے سے نہیں ٹلتا اور اپنے اکتسابی علم کی شیخی بگھارنے سے باز نہیں آتا۔

پینڈو روزی کی خاطر شہر کا رخ کرے تو وہ اپنی ذہانت ساتھ لاتا ہے، لیکن شہر میں آتے ہی اسے احساس کمتری ہونے لگتا ہے۔سب سے پہلے تو اسے وہ زبان ششدر کرتی ہے جس کا ماخز کتابیں، ابلاغ کے جملہ وسائل اور مارکیٹ جنم دیتے ہیں ..... لباس تو وہ جلد ترک کر دیتا ہے لیکن زبان سیکھنے کے لیے اسے کچھ مدت درکار ہوتی ہے، لیکن جسے پینڈو سمجھ کر شہری لوگ برخاست کرنا چاہتے ہیں، وہ اپنے تروتازہ دماغ کے باعث تجربے سے سیکھی ہوئی فہم وفراست کے باعث بہت جلد شہری کے سامنے سیڑھیاں چڑھنے لگتا ہے۔اسے آداب محفل سیکھنے میں دیر لگتی ہے کیونکہ یہ وہ پانی نہیں جن میں اس نے تیرنا سیکھا لیکن مجلسوں میں زندہ دلی پینڈو ہی کے دم قدم سے ہوتی ہے۔شہری انہیں ان پڑھ سمجھتے ہیں، لیکن پھر اسی کی گھڑت کے ٹوٹم اور Taboos شہری معاشرے میں لہو کی طرح ڈوڑنے پھرنے لگتے ہیں۔دیہاتی کی ترقی شہر میں اور بھی تیز ہوتی ہے جب یہ تعلیم کی سان ہر چڑھے الفاظ کا جنتر منتر سمجھ

پائے ارگفتگو کے اتار چڑھاؤ میں دیہاتی تجربے سمونے لگتے تو شہری اس کا مقابلہ نہیں کر پاتے۔

چاچا صمد ہمارے ساتھ والے گاؤں سے آیا تھا اور پکا پینڈو تھا۔

چانے مے ایک جیتی جاگتی، ہنس مکھ پر امید روایت زندہ تھی۔وہ مبالغے کی حد تک سوشل تھا اور کسی سیاسی لیڈر کی مانند اسے گفتگو کا فن ازبر تھا۔گھر کا دروازہ کھلتے ہی وہ برسات کی ٹھنڈی ہوا کی طرح خوشی کے جھونکے ساتھ لاتا تھا۔چاچا صمد کا سواگت سبھی کرتے۔سب سے پہلے وہ اماں کو تلاش کرتا۔ماں کے پاس پیروں بھار بیٹھ کر وہ ہر بات سرگوشی اور پریم سے کرتا۔

''کیا ہو رہا ہے بھابھی؟......''

''کچھ نہیں ویر۔گھٹنے میں درد ہو رہا ہے۔ذرا سینک دے رہی تھی''

چولہے کی لکڑی نکال کر چاچا صمد اپنا سگریٹ جلاتا اور ایک آنکھ میچ کر دھواں چھوڑتا۔

''بھابھی وہ میں ساہنے کا تیل چھوڑ گیا تھا۔اس کی مالش کر کے دیکھی''

''دو دن لگایا تھا۔آرام بھی آ گیا تھا تھوڑا بہت ....پر پھر نا جانے کدھر رکھ دیا تیل......''

''اور لا دوں گا....اور لا دوں گا تو فکر نہ کر..... ساہنے ہی ساہنے تیل ہی تیل۔''

''جیتا رہ خوش رہ''

اماں ساری کی ساری پسیج جاتیں۔ویسے بھی اماں کی محبت ہی ایسی تھی، جس کسی پر مہربان ہوتیں، اس کے خلاف کچھ نہ سن سکتیں۔پھر جو عیب بھی نکلتا کسی دوسرے کی غلطی

سے نکلتا۔ اپنی آنکھ سے دیکھ کر بھی انہیں یقین نہ آتا کہ جس بت کی پرستش وہ کرتی ہیں وہ ٹوٹ بھی سکتا ہے۔ گونگا، بہرہ ہے اور کسی کام نہیں آ سکتا۔

دیور کے معاملے میں وہ سکھ سردارنیوں کی طرح زدہ تھیں۔

وہ دیور سے اس طرح کا برتاؤ کرتی تھیں جیسے چھوٹے بیٹے سے معاملہ ہوتا ہے۔ الجھتیں جھڑکتیں، ماتھا چومتیں، بازو پکڑ کر جھنجھوڑتیں، دوپٹے سے پسینہ پونچھتیں، گرم گرم پھلکے کو دیسی گھی سے چوپڑ کر پیش کرتیں، غریبی کے باوجود انڈے تل کر دیتیں، دیور بھی خوش دلی کا بادشاہ تھا۔ فلمی ڈائیلاگ بول بول کر اماں کو لارے لگائے رکھتا۔ جو چیز اس کے کام کی نہ ہوتی۔ اسے بڑے تپاک اور حساب سے اماں کو پیش کرتا۔ اماں سے چاچا صمد کو رشتہ استوار کرنے کی کوئی ضرورت پیش نہ آتی۔ یہ رشتہ بنا بنایا آیا تھا۔ جس روز اماں بیاہ کر آئی تھیں اس روز اپنے سے دس سال چھوٹے دیور کو گودی میں بٹھا کر سارے گھر والوں نے صمد چاچا کو اماں کا متبنیٰ بنا دیا۔ اس دن کے بعد چاچا اور اماں کا رشتہ عاشق سے کم کم اور دوست سے زیادہ رہا۔ ابا اسچے منہ، بند آنکھوں، سر دہاتھوں والا ایک ملاقاتی تھا۔ اس لئے چاچا صمد کی

گرم جوشی نے اماں کے دل چولہے کو گرم رکھا۔

چاچا گھر میں یوں بکھرتا جیسے کبھی سوڈے کی بند بوتل کھلتے ہی جھاگ سمیت ادھر اُدھر بکھر جاتی ہے۔ چولہے کے پاس بیٹھ کر ابلتی چائے، گرم روٹی اور تازہ لسی پی پا کر چاچا اوپر کی منزل میں چڑھ جاتا ہے۔ شاہد بھائی چونکہ شاعر طبع تھے اس لیے کوٹھے کے اکلوتے کمرے میں ان کا بسیرا تھا۔ وہ پڑھائی کے بہانے کبھی پتنگ اڑاتے، کبھی شعر گنگناتے۔ سردیوں میں سر میں تیل لگا کر دھوپ سینکتے۔ کوئی منع کرنے والا نہ تھا۔

''اوئے شاہد کیا بن رہا ہے کنجرا۔۔۔۔''

شاہد بھائی کی باچھیں کِھل جاتیں۔

''آؤ آؤ چاچا جی ۔۔۔۔آؤ۔۔۔۔''

''یہ ریڈیو لگا ہوا تھا۔آواز آرہی تھی سیڑھیوں پر۔بند کیوں کر دیا۔۔۔کس شاعر کا کلام تھا؟۔۔۔۔''تجاہل عارفانہ سے چاچا کہتا۔

''نہیں ۔۔۔۔چاچا جی میں ن خود پڑھ رہا تھا شعر۔۔۔۔''

''سنا مجھے کس کا شعر تھا۔۔۔۔؟''

''میرا اپنا شعر تھا چاچا جی''

''واہ بھئی واہ سبحان اللہ کمال کر دیا یار شعر لکھنے لگ پڑا۔۔۔''

اب شاہد بھائی اپنے بے وزنے شعر،نثر نظمیں اور انشائیے سنانے میں مشغول ہو جاتے۔چاچا صمد بغیر سنے کھل کھل کر داد دیتے۔۔۔بچہ پارٹی نچلی منزل سے سرکتی اوپر کوٹھے پر جا پہنچی۔چاچا صمد گھر کا پائیڈ پائیپر تھا۔سبھی اس کی آواز پر سرکتے کھسکتے چلے آتے۔بچوں کے ساتھ چاچا صمد کا معاملہ اور بھی کھلم کھلا تھا۔کسی کے پیٹ میں انگلی ٹھونسی۔اپنے کانوں کے ساتھ ہاتھ جوڑ کر پھٹپھٹائے اور ہاتھی بن کر ہنسا دیا۔بچوں کو پیچھے لگا

لیا۔ایسے موقعوں پر چاچا صمد Veutrilocust بھی بن جایا کرتے،کبھی بلی کی طرح میماتے،کبھی بندر بن کر خوخیاتے۔۔۔شیر بن کر دھاڑتے تو چھوٹے بچوں کی آنکھوں کا قرنیا پھیل جاتا۔چاچا کے آنے پر شاہد بھائی سے چھوٹے ہم تین تو موجود ہوتے ہی تھے،محلے کے دوسرے بچے بھی خود بخود آتے چلے جاتے۔

سارا گھرانہ چاچے کی آمد پر خوش ہوتا صرف ابا کے ماتھے پر بل سیدھے نہ ہوتے۔پاکستان آتے ہی اسے بیوی بچوں کی کفالت میں مشکل پیش آرہی تھی۔ابا اتنا سنجیدہ مزاج آدمی تھا کہ اس کے سامنے ہنس بول نہیں سکتا تھا۔خوشی کا یہ قاتل نہ خود خوش رہتا،نہ کسی اور کو خوش رہنے کی اجازت دیتا۔وہ عام طور پر چاچا صمد کے آتے ہی گھر چھوڑ کر باہر نکل جاتا اور کم از کم ہم سب کو اتنی آزادی بخش دیتا کہ ہم چاچا کی

صحبت سے لطف اندوز ہو سکیں۔

اب کے باہر جاتے ہی گھر میلے کی شکل اختیار کر لیات۔۔۔۔شاہد بھائی سے چھوٹی رفعت آپا کی سہیلیاں نہ جانے کہاں آ جاتیں حالانکہ سانده کلاں میں ہمارے پاس فون نہ تھا۔یہ لڑکیاں کھی کھی کر
ہنسنے، گوٹے کناری کو پسند کرنے والی اور فلمی گانوں پر جان چھڑ کنے والیاں تھیں۔چاچا صمد ان میں گدگدی کی کیفیت پیدا کرتا اور خود ہنسے بغیر کئی لطیفے بیان کرتا۔

لڑکیوں کے ساتھ چاچا صمد بالکل فطری تعلق بناتا۔اس میں مرد عورت کی ازلی بے تکلفی اور اعتماد ہوتا۔جھڑکنے، گستاخ ہونے، جھوٹ بولنے، حیلہ بازی کے باوجود رشتہ کبھی نہ ٹوٹتا اور لڑکیاں ہمیشہ گزشتہ رابطے کو بڑی آسانی سے جوڑ لیتیں۔چاچا صمد یہ جانتا تھا کہ لڑکیاں کسی بات کو دیر تک سنجیدگی سے نہیں لیتیں پھر اسے یہ علم تھا کہ بعض اوقات لڑکیاں چھوٹی سی چھوٹی بات کو بیحد سنجیدگی سے محسوس کرتی ہیں اور ساری زندگی نہیں بھولتیں۔دونوں طرح کی لڑکیوں میں چاچا صمد کا رویہ غیر زمہدارانہ رہتا لیکن کسی لڑکی نے چاچے کی بات پر دیر تک منہ نہیں تھتھایا، نہ ہی اس کی کسی سے شکایت کی۔چاچا چک چونڈی پر ایمان نہیں تکھتا تھا۔وہ ذہنی طور پر لڑکیوں کے اس قدر گدگدی کر لیتا کہ لڑکی ساری کی ساری زعفران زار بن جاتی، کیونکہ رابطوں کے لیے یہاں ہمیشگی کی شرط نہیں تھی، اس لئے گلہ گزاریاں کم ہوتیں۔

ہمارے گھر میں چاچا صمد کا آنا مثل عید کے تھا۔۔۔۔اور یہ بات ہے کہ وہ اپنی پتنگوں کی دوکان چھوڑ کر روز روز نہ آسکتے۔چاچا اوپر سے ہنسوڑ اور بچہ جمورا اور اندر سے حلال روزی کمانے والا سنجیدہ دوکاندار تھا۔اس کا یہ تضاد ہر گز تکلیف دہ نہ تھا۔

چاچا صمد کو جب بھی یاد کرتا ہوں، ایک بھولی بسری کہانی یاد آ جاتی ہے۔

خراسان کے ایک بادشاہ کے تین بیٹے تھے، بڑے دو ذہین فطین اور بڑے جی دار تھے جبکہ سب سے چھوٹا سادہ خاموش اور دنیا داری سے گھبرانے والا تھا، جونہی شاہ جم جاہ اپنی طبعی عمر کو پہنچا اور کار سلطنت اس کی طبعیت پر بوجھل محسوس ہوا، وہ متفکر رہنے لگا۔ ایک روز اپنے تینوں فرزندوں کو طلب کیا اور ان سے گویا ہوا۔۔۔۔ ''اے فرزندان عالی وقار میرا عہد اقتدار انجام کو پہنچا۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ میں اپنا ولی عہد مقرر کروں اور امور سلطنت میں اس کی تربیت کسی ایسے زیرک اور ذی ہوش اتالیق کے سپرد کروں کہ سلطنت کے رموز سے اسے بخوبی آگاہی ہو اور منزل بہ منزل رعایا کی فلاح کا باعث ہو۔''

بڑے بیٹوں نے نفرت سے اپنے کم علم بھائی کی جانب حقارت سے نظر کی اور کہا۔۔۔۔ ''عالم پناہ! ہمارا یہ بھائی نیم پاگل، ناخواندہ اور معاملہ فہم نہیں۔ یہ سلطنت دشمنوں کے حوالے نہ ہو جائے۔''

ظل الٰہی انصاف پسند تھا۔ فرمایا۔۔۔۔ ''شرط انصاف یہی ہے کہ تم تینوں اپنی قسمت آزماؤ دیکھو۔ میں اس شہزادے کو اپنا وارث بناؤں گا جو میرے لئے دنیا کا سب سے خوبصورت قالین لائے''۔ پھر وہ تینوں شہزادوں کو لیکر محل کی چھت پر پہنچا اور اپنے ہاتھ سے تین مور پنکھ دیئے۔۔۔۔ ایک پر مشرق کی جانب اڑتا گیا، دوسرے مور پنکھ نے مغرب کی سمت لی اور تیسرا پر کچھ دیر چکر پھریاں لیتا بے سمتا کچھ دور جا کر جنگل میں گر پڑا۔

بڑے بیٹے نے مشرق کی جانب مور پنکھ کا تعاقب کیا۔ منجھلے شہزادے مغرب کی جانب بھاگے اور سادہ لوح جنگل کی جانب نکل گیا۔ کچھ دیر بعد ایک مور پنکھ اڑتا ہوا آیا اور ایک شاخ میں اٹکا، پھر تا مک ٹوئیاں مارتا زمین پر ایک مینڈک پر جا گرا۔

مینڈک فوراً بولا۔۔۔۔ ''اے نوجواں اس رونے کی وجہ؟''

شہزادے مینڈک کی بات سن کر حیران ہوا۔ پھر اپنا ماجرا بیان کیا۔ مینڈک

پھدک کر کچھ فاصلے پر گیا اور شہزادے کو ایک پتھر پر مور پنکھ پھینکنے کو کہا۔ پتھر پر مور پنکھ کا گرنا تھا کہ شاخ سے آواز آئی۔ پتھر دولخت ہو گیا۔ نیچے کی جانب اترتا سنگ مرمر کا زینہ نظر آیا۔ اب آگے آگے مینڈک اور پیچھے پیچھے شہزادہ روانہ ہوا۔ نیچے اتر کر کیا دیکھتا ہے کہ ایک آراستہ پیراستہ کشادہ ہال ہے جس میں بھانت بھانت کے مینڈک کورس میں مل کر گا رہے ہیں۔۔۔۔ رہبر مینڈک نے کہا۔۔۔۔ ''سنو حاضرین! ہمارے مہمان کو ایک ایسا قالین درکار ہے جس کا کوئی ثانی نہ ہو''۔ سارے مینڈک تھوڑی دیر کے لئے غائب ہو گئے۔ پھر ایسا منقش صندوق اٹھا کہ بایدوشاید۔۔۔۔ شہزادے نے کانپتے ہاتھوں سے ڈھکنا کھولا۔ دیکھتا کیا ہے کہ ایک نادر زمانہ قالین ایسا کہ عقل دنگ رہ جائے۔ نقش و نگار دیدہ زیب، خوبصورتی میں لاثانی، اون ریشم سے بھی نرم اور چکیلی رنگوں کی نسبت بے مثل۔۔۔ شہزادے نے قالین کو کندھے پر دھرا، مینڈک کا شکریہ ادا کیا اور بادشاہ سلامت کی خدمت میں کورنش بجالایا۔ بڑے بھائی زیر لب مسکرائے۔ یقین پختہ تھا کہ اتنی کم علمی اور سادگی اسے کسی طور پر پسندیدہ قالین نہ لانے دے گی۔

پہلے بڑے شہزادوں نے اپنی دریافتیں دکھائیں۔ پھر چھوٹے شہزادے کو اذن ملا۔ جونہی قالین فرزد ہوا۔۔۔۔۔ سب دنگ رہ گئے۔ شاہ عالم پناہ بستر مرگ سے اٹھا اور نحیف آواز میں گویا ہوا۔۔۔ ''میرا فیصلہ مشیت نے کر دیا۔ آج کے بعد یہی میرا وارث ہے۔''

بڑے شہزادے نے کہا۔۔۔ ''اے آقا یہ اتفاق محض ہے، ورنہ یہ شہزادہ ایسی اہلیت نہیں رکھتا کہ امور سلطنت سنبھال سکے ناخواندہ مجبور محض ہے۔ زمانہ شناسی سے آشنا نہیں۔ گھڑسواری کا علم نہیں رکھتا۔ سپاہ گری میں کورا ہے۔۔۔ تو کیوں اپنی سلطنت کے امور ایک ایسے فاتر العقل کے سپرد کر رہا ہے جو ابتری کا باعث ہوں؟''

چند لمحے شاہ ذی جاہ نے توقف کیا۔ پھر گویا ہوا۔۔۔ ''یہ شرط انصاف نہیں کہ جو شرط میں نے پیش کی اس میں سبقت لے جانے والے کو حوالے سلطنت نہ کروں۔ یاد رکھو بادشاہت کے لئے انصاف اول و آخر شرط ہے اور یہ حقیقت کیسے جھٹلائی جائے کہ کبھی کبھی وہی چیز جو ہمیں بری لگتی ہے، ہماری بھلائی کے لیے اہم ہو اور وہ چیز جس پر ہم فریفتہ ہوں، ہمیں تباہی کی جانب کھینچے۔ کون جانے اسی سادہ لوح میں رعایا کی فلاح ہو اور تمہارے علوم کی دسترس منہ دیکھتی رہ جائے۔

سنا ہے سب سے چھوٹا شہزادہ برسوں حکمران رہا۔ بڑے شہزادوں کا سارا وقت بغاوت، سازش اور رزم گاہوں میں گزرا۔ بادشاہ چونکہ انصاف کے علاوہ کسی اور وصف سے آراستہ نہ تھا اس لئے اس کے عہد میں شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پانی پیتے رہے اور رعایا فلاح اور امن سے وابستہ خوشی اور خوشحالی کی زندگی بسر کرتی رہی۔

میں آج تک یہ روز نہ جان سکا کہ بعض کو بعض پر سبقت کیوں حاصل ہو جاتی ہے؟ کسی ایک وصف سے بیڑا پار کیسے ہو جاتا ہے؟ چاچا محمد صمد میں وہ کونسی خوبی تھی جس کی بنا پر وہ ہردلعزیز ٹھہرا اور میرا باپ جس کی ساری زندگی ذمہ داریاں اٹھاتے، وعدے نبھاتے، ناک کی سیدھ چلتے چلتے گزری، نہ اپنے لیے خوشی حاصل کر سکا نہ کسی اور کو مسرت کے حوالے کر سکا؟ بعض کو بعض پر ترجیح کیا کسی خوبی، محنت، منطقی چناؤ کے باعث ہے کہ یہ اوپر والے کی مرضی کی مرہون منت ہو اور جس کی لا جک تک ابھی انسان پہنچ نہیں پایا۔''

جرمن ٹاؤن کے اس محلے میں صفائی ستھرائی کا یہ عالم ہے کہ کبھی کسی کھڑکی دیوار پکی گلگڈنڈی پا کاغذ، مٹی، گھاس، کا تنکا بھی نظر نہ آیا۔ میں بیلکونی میں بیٹھ کر سڑک کا نظارہ کرتا رہتا۔ ہر پیر اور ہفتے کے روز گندی گاڑی آتی اس میں بڑے مظبوط جسموں والے نیلی رودیاں پہنے نیگرو، امریکن اور دوسرے تارکین وطن باہر نکلتے اور گھروں

سے باہر رکھے ہوئے پلاسٹک کے کالے ڈرموں میں سے کوڑا کرکٹ اٹھا کر لے جاتے۔ نہ سگریٹ پینے کے بہانے بیٹھتے، نہ ہی کسی دوسرے پر کام چھوڑ کر خود چمپت ہو جاتے۔ ہمارے دیس میں عام طور پر نماز پ

ڑھنے کے بہانے کارندے جاتے ہیں اور پھر لوٹ کر آفس میں واپس ہی نہیں آتے۔ جمعے کے روز تو معمول ہوتا کہ گو دفتر پانچ بجے تک کھلیں لیکن واپسی کی نفری ضرور کم ہو جاتی۔ سایداسی دکھ کے کارن بھٹو کے عہد حکومت نے جمعے کو سرکاری تعطیل ہی میں بدل دیا گیا لیکن بات پھر بھی نہ بنی کہ اس طرح ہفتے میں تین چھٹیاں رہنے لگیں۔ جمعے کو سرکاری چھٹی ہفتے کو فرنچ لیو اور اتوار کو سرکاری انگلشیہ کی رسم کے مطابق چھٹی ہی سمجھی جانے لگی۔

منگل کے روز گھاس کاٹنے والے آیا کرتے ہیں گھاس کاٹنے کے لیے عموماً ایسے طالبعلم ہوتے تھے جو اپنے سکول یا کالج کی فیس اکھٹی کرنے کے لیے یہ کام کرتے۔ ایک گھاس کاٹنے والی چھوٹی سی گاڑی آتی جسے طالب علم کار کی طرح طلاتا اور موٹی موٹی گھاس کاٹا جاتا ہے اس کے بعد ایک نوجوان لمبی بندوق نما مشین لایا جس کے سامنے چونچ میں گھاس کاٹنے کی پھرکی لگی ہوتی اور پھر کونے کھدروں میں سے ناممکن جھگوں سے بھی گھاس کاٹ جاتی۔۔۔۔

نہ تو کوڑا اٹھانے والے نہ گھاس کاٹنے والے نہ ہی شیشے صاف کرنے والوں کو کام کرنے میں کوئی دقت تھی۔ اپنے اپنے وقت پر آتے اور کام کرنے کے بعد پھر سے اڑ جاتے۔۔۔ پرندوں کی طرح یہاں نہ ڈراوغہ صفائی تھا نہ کوئی ایس میٹ جو کام کروائے مکھی کے چھتے کی طرح سارے کارکن پابندی کار تھے۔ ان ربوٹوں کو دیکھ کر مجھے خیال آتا کہ یہ کیسی دنیا ہے، کیسا نظام ہے۔۔۔ جہاں کام ہوتے چلے جاتے ہیں۔ نہ کوئی شخص روڑا بنتا ہے نہ کسی کو روکاوٹ بننے پر آمادہ کرتا ہے۔

دراصل امریکہ میں ساری اخلاقیات کام کی اخلاقیات کے بعد آتی ہیں اس معاشرے میں اسی انسان کی عزت ہوتی ہے جو کام میں پورا اترتا ہے۔سب کا رشتہ کام سے گہرا ہے اور فرد کا فرد سے رشتہ ناطہ اغراض کے باعث نہیں بلکہ ذاتی خوچی پر منحصر ہے۔یہاں سب کلام کی اہمیت کے لئے جڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔۔۔۔۔

یہ اور بات ہے کہ ابھی ایسی گوند ایجاد نہیں ہوئی جو انسان کو انسان سے مستقلاً جوڑ سے۔۔۔۔انسان ہمیشہ اپنی فردیت قائم رکھنا چاہتا ہے کسی اور میں نہ ضم ہوتا ہے اور کسی اور کو اپنے میں ضم ہونے کی اجازت دیتا ہے امریکہ میں بچھڑنے کا سلسلہ اور بھی تیز ہے۔یہ لوگ دل شکستہ ہو کر بھی Move On کرنا جاتے ہیں۔

''ابا جی آپ سارا دن بور تو نہیں ہوتے۔۔۔۔'' بلال بہت مودّب ہو کر پوچھتا ہے۔

''اوہ نہیں بابا۔۔۔میں نے کہا بور ہونا ہے اس عمر میں''

''میں آپ کو اس ویک اینڈ پر نیو یارک لے جاؤں یا آپ واشنگٹن ڈی سی جائیں گے میرے ساتھ۔''

''تم میری فکر نہ کرو بلال میں ایک مدت سے آزاد محسوس کر رہا ہوں۔۔۔۔''

بلال میرا داماد ہے، وہ ہر روز تازہ شیو کے بعد نیلگوں چہرہ لئے بریک فاسٹ ٹیبل پر آتا ہے۔الیکٹرک کیتلی میں چائے کے لئے پانی چڑھانے کے بعد وہ کئی چھوٹے موٹے کام کرتا ہےسب سے پہلے وہ ڈش واشر میں سے برتن نکال کر باورچی خانے کی Cabinets میں رکھتا ہے ان Cabinets کو ہمارے **ملک** میں الماریاں کہا جاتا تھا، ان میں ٹھکا ٹھک کٹا کٹ برتن دھرنے کے بعد وہ اپنے اور میرے لئے ٹی بیگز لے کر چائے بناتا ہے اس چائے کا لطف کبھی کڑک چائے جیسا

نہیں ہوسکتا، لیکن ڈاکٹر بلال پچھلے ذائقے بھلا چکا ہے۔وہ سری پائے، ٹکا ٹک ،نہاری، قیمے والے نان یاد نہیں کرتا۔ایک مدت سے اس کی زندگی مشینی ہے۔وہ عقل کے سہارے زندہ رہتا ہے۔ہم دونوں سب سے پہلے ناشتہ کرتے ہیں میری بیٹی اور اس کے دونوں بیٹے گھر سے ذرا لیٹ جاتے ہیں بلال کے ساتھ میری بے تکلفی نہیں ہوسکی۔کچھ حد تک میں آگے بڑھتا ہوں لیکن پھر خارپشت کی طرح میرے کانٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔میں کسی کو اپنے جھانکنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔کیونکہ زندگی کی کسی سٹیج پر مجھے علم ہوچکا ہے کہ رازداں ہمیشہ آپ کی کمزوریوں کو واشگاف کر کے انہیں استعمال کرنے کا فن بھی بخوبی جانتا ہے۔

بلال کچن اور ڈرائنگ ٹیبل تک کئی مرتبہ آتا جاتا ہے رہتا ہے۔کبھی ٹوسٹر سے ٹوسٹ برآمد کرنے، کبھی چیز اور جیم نکالنے۔۔۔۔اس لئے میں ناشتہ میں انڈہ نہیں کھاتا کہ پھر اسے یہ سروس بھی کرنا پڑے گی۔سارا دن ہسپتال مین سرکھپانے کے بعد جب وہ گھر پہنچتا ہے تو اسے کئی دوسرے کام کرنا ہوتے ہیں گروسریز بھی وہی لاتا ہے، کیونکہ میری بیٹی کام پر دیر سے جاتی ہے اردیر سے ہی لوٹتی ہے۔بلال عموماً دماغی طور پر غیر حاضر رہتا ہے۔مغربی لوگوں کا خدا کام ہے۔۔۔۔ہر تیسرا آدمی Workaholic ہے۔اس کی اخلاقیات میں سرفہرست محنت کی اخلاق قدر ہے۔۔وہ کام میں چوری نہیں کرتا۔اپنے Emploees کا ن وقت ضائع نہیں کرتا۔Work ethics نے اسے مشینی بننے میں مدد دی ہے اسی لئے بالآخر اسے کام سے بریک درکار ہوتی ہے اور وہ پورے پانچ دن مشین بنا ویک اینڈ کا انتظار کرتا رہتا ہے جن اس کے جسم کو تفریح اور آرام کی گریس دی جاسکے۔

’’کبھی تم نے سوچا بلالا؟‘‘

’’کیا ابا جی۔۔۔۔؟‘‘

''واپس جانے کے متعلق ۔۔۔وطن میں لوٹنے کی آرزو کبھی بیدار ہوئی تم میں ۔''

وہ زہر خند کے ساتھ مسکرا کر جواب دیتا ہے ۔۔۔''شروع شروع تو عجلیا ہوتا تھا ابا جی لیکن اب فیصلہ ہو چکا ہے ۔اب پیچھے دیکھوں گا تو پتھر کا بن جاؤں گا۔''

''وہاں تمہارے سٹیٹس کا آدمی عیش کرتا ہے دو دو ڈرائیور ۔۔۔محل جیسا گھر آٹھ سات ملازم ۔۔۔بچوں کے لئے فلپچو میڈ ،دو ساز کمپنیوں کی طرف سے یورپ امریکہ کے مفت سفر ۔۔۔جس قدر تم کماتے ہو بادشاہوں کی طرح رہ سکتے ہو وہاں ۔۔۔''

''پاکستان امیروں کی جنت ہے ابا جی ۔۔۔امریکہ غریبوں کا بہشت ہے ۔یہاں غریب آدمی عزت نفس سے محروم نہیں ہوتا ۔وہ نہ اپنے آپ کو کسی سے کمتر سمجھتا ہے نہ ہی کمتر ہوتا ہے آپ کے دیس میں ۔۔۔''

''کیا وہ تمہارا ملک نہیں ہے بلال ؟ ۔۔۔میں سوال کرتا ہوں وہ جواب نہیں دے پاتا ۔

بلال گھڑی دیکھتا ہے اسے آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کر کے ہسپتال پہنچنا ہے اور بقول اس کے وہ کبھی لیٹ نہیں ہوا ۔

''ابو جی ۔۔۔جب میں وہاں لاہور میں تھا تو پورے تین سال ملازمت کے لئے کوشش کرنے کے باوجود بیکار تھا ۔یہاں آ کر میں بڑے دھکے کھائے ۔ارجمند اور میں نے بڑی مشقتیں جھیلیں ،آپ کبھی اس سے پوچھئے گا ۔کیا کیا پاپڑ نہیں بیلے ہم نے ۔۔۔لیکن آج جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں ، اسی امریکہ نے ہمیں دیا ہے ۔۔۔۔''

''لیکن میرے نزدیک تو ابھی بھی تم دونوں کی مشقت کم نہیں ہوئی ۔۔۔جس

قدر کام تم اور ارجمند یہاں کرتے ہو اس کا تو تصور بھی پاکستان کے نوجوان نہیں کر سکتے ۔۔۔۔ پہلے دفتروں میں پستے ہو، پھر گھر آ کر گھریلو ملازم بن جاتے ہو، یہ بھی کوئی زندگی ہے ۔۔۔۔ کوئی فراغت نہیں آرام نہیں ۔۔۔۔ گھڑی بن ہو گھڑی"

"ٹھیک ہم کام کے عادی ہو گئے ہیں ابا جی ۔ آپ فکر نہ کریں ۔ کام ہماری زندگی ،خوشی ،سکون ہے ۔۔۔۔ یہاں کام مشقت نہیں لگن ہے لیکن ۔۔۔۔"

وہ اپنا بریف کیس لے کر گھر سے باہر نکلتا ہے ۔ اسے اپنے ہسپتال تک پہنچنے کے لئے آدھا گھنٹہ درکار ہے ۔ چار پانچ جملے بولنے میں اس کا وقت ضائع ہو جاتا ہے اس کی پاداش میں اسے گاڑی تیز چلانی پڑتی ہے ۔۔۔۔ Stress میں جانا پڑتا ہے ۔

امریکہ میں لوگ ڈالر نہیں بچاتے وقت بچاتے ہیں ۔ پھر جب وقت کا صحیح مصرف ہونے لگتا ہے تو ڈالر خود ہی پانداز ہونے لگتے ہیں ۔ اس طرح ایک خاص قسم کی Frustration جنم لیتی ہے ۔ مایا داس پر دولت کا بوجھ خود بخود بڑھتا ہے ۔ دولت اپنی مشغولیات خود بڑھاتی ہے ۔ محل نما گھر ان گھروں کے انتظاما ، بیرونی ممالک کے سفر، Designer کپڑوں اور جوتوں کی تلاش ، دولت کی بنا پر شہرت کی ہوس ۔۔۔۔ پارٹیاں ، پی آر، پرسنیلٹی پروبلمز نفسیاتی بیماریوں کا لا متخل سلسلہ جاری ہو جاتا ہے جب ڈالر بچنے لگتے ہیں تو پھر ایک اور قسم کا Stress شروع ہا جاتا ہے ڈراصل یہاں وہاں انسان پوری کوشش کرتا ہے کہ وہ ذہنی دباؤ سے نکلے ۔ اظمانیت قلب ،سکون اور شانتی ملے ۔۔۔۔ لیکن شاید معیشت اور معاشیات کو یہ کچھ درکار نہیں ۔ زندگی کا اصل راز اسی Stress میں ہے ۔۔۔۔ یہ اور بات ہے کہ فلاح کے راستے پر چلنے والے دباؤ کی گھڑی سر سے اتار کر ملکوتی مسکراہٹ کے ساتھ گرد و پیش میں ٹھنڈی چاندنی کی طرح پھرتے ہیں ۔ نہ جہاں سوزی کا باعث بنتے ہیں نہ خود سوزی کا ۔۔۔۔ لیکن اس سکون کے نسخے کا Patent وہ ایسی جگہ کراتے ہیں ، جہاں سے

نبیوں کا نسخہ سکون میسر آتا ہے اور اسے کسی اور زبان میں لکھا جاتا ہے۔

جب ہم سانڈہ میں رہا کرتے تھے تو نچلی منزل میں ہمارا قیام تھا اور اوپر والی منزل کے اکلوتے کمرے میں شاہد بھائی رہا کرتے تھے۔نیچے صرف تین کمرے تھے ۔ایک تو بیٹھک تھی جس میں بید کی کرسیوں کو لٹھے کی چولیاں پہنا کر پردہ پوش شکل دی گئی تھی ۔ایک کمرہ ابو امی کا تھا جس میں زیادہ وقت ابو اکیلے رہا کرتے ۔دوسرے کمرے آپیا چودھرائن تھیں اور ہم تینوں چھوٹے بہن بھائی کو سانٹا مار کر سٹ ڈاؤن سٹینڈ اپ کرایا کرتی تھیں ۔وہ میرے ہوش سے پہلے کی استانی تھیں۔ان کو یہ زعم تھا کہ وہ ساری کائنات سے بہتر جانتی ہیں۔

انسان کو غالباً سب سے زیادہ تحکم کا شوق ہے۔وہ دوسروں پر کبھی رعب کبھی خوشامد، کبھی سزا دے کر اپنی حکومت کا ثبوت اپنی انا کو پہنچاتا رہتا ہے۔تحکم زیادہ ہوتا چلا جائے تو خود اعتمادی میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے دوسروں کی مرضی پر اپنی مرضی مسلط کرنے کے مواقع کم ہوں تو احساس کمتری بڑھنے لگتا ہے۔مذہب، قانون، ماں باپ، استاد، رسم و رواج کسی قسم کی بھی اطاعت ہو تو انسان تابع کی حیثیت میں فیصلے کرتا ہے اسے فیصلوں کے لیے اپنے اندر کے بجائے باہر کی آواز حق پر اعتماد کرنا پڑتا ہے۔ماننے والے پر سے فیصلے کی ذمہ داری اٹھ جاتی ہے۔اس بوجھ کے اٹھرے ہی وہ صاحب اختیار بھی نہیں رہتا اور اسی لیے اپنے پر بھروسہ کرنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے ترقی کے لئے اپنے فیصلے پر اعتماد کرنا انتہائی اہم ہے۔اسی خود اعتمادی کے سہارے مغربی معاشرے میں ترقی کا پہیہ جام نہیں ہوتا ۔ہمارے گھر میں بھی غلطی کرنے کی اجازت نہ تھی ۔چونکہ ہم غلطیاں کرنے کے عادی نہ تھے اس لیے معافی مانگنے کا رواج بھی عام نہ تھا۔معافی مانگتے وقت ہم عجیب قسم کے گونگے، ضدی اور

شرمسار سے کونے کھدروں میں چھپتے پھرتے ۔ہم تینوں چھوٹے مدح وزم کے لئے آپا رفعت کی طرف دیکھتے رہتے ۔وہاں سے صاد مل جاتی تو ہمارے چہرے کِل اُٹھتے ۔گھور کر دیکھ لیتیں تو مرنے کا مقام ہوتا۔

''سنا نہیں کیا کہہ رہی ہوں میں۔''

''جی آپیا۔۔۔۔''

''چلو سیدھی طرح اور نہاؤ۔۔۔''

ٹھٹھرتی سردی میں جب گلی میں دھند کے باعث کچھ نظر نہ آتا ،نہانے کا حکم ملا کرتا ۔ہم قریب قریب برفیلے پانی سے نہا کر باہر نکلتے تو آپیا کانوں کے پیچھے گردن کے سامنے ناخنوں کو الٹا پلٹا کر حکم دیتیں ''چلو اب ناشتہ کرو۔۔۔دیر نہ لگے ۔سکول کا وقت ہوگیا ہے۔''

اسی طرح ٹھٹھرتے ،کانپتے فریدہ اور ظفر سکول پہنچتے تو ماسٹر غلام نبی ٹکر جاتے ۔وہ سخت کلامی کے ساتھ ساتھ ہاتھ چلاکی بھی کرتے ۔جب انہیں غصہ آجاتا تو جہاں کہیں دل چاہتا ،مکا چٹکی تھپڑ رسید کرتے اور لمحہ بھر کو بھی احساس جرم انہیں نہ ستاتا ۔انہوں نے خود اتنی سخت قسم کی زندگی بسر کی تھی کہ کسی سے نرمی برتنا انہیں اسراف لگتا ،ان کا بس چلتا تو تفریح کی گھنٹی بھی بند کرا دیتے ۔ہنستے ،مسکراتے ،چہکتے ،بولتے شرارتیں کرتے چہرے پر وہ عذاب بن کر نازل ہونے کو ڈسپلن کا نام دیتے تھے۔

واپسی پر پھر رفعت آپا کا تحکم سہنا پڑتا ۔ہوم ورک ،کھانا ،دوسرے دن کا یونیفارم تیار کرنا ،بستر بچھانا ،استری کرنا ،یہ سارے مشاغل ان کی مرضی کے مطابق ہوتے ۔وہ جب ہمیں جلد سلانے دینے میں کامیاب ہو جاتیں تو دونوں پورٹیوں کو چین پڑ جاتا ۔ہم آپیا سے چھوٹ جاتے ،بڑی ہونے کے ناطے انہیں کچھ ایسے حقوق حاصل تھے جن کا ہم تصور بھی نہ کر سکتے تھے ۔مجھ پر فسٹ ایر کا سال بھاری تھا ،کبھی کبھی مجھے نیند نہ

آتی۔

سانده کلاں کا یہ گھرانہ پرانا تھا۔اس میں کئی برسوں سے سفیدیاں نہ ہوئی تھیں ہمارے کمرے کی سفیدی جا بجا سے اکھڑی ہوئی تھی آپیا کے ڈر سے میں آنکھیں تو بند کر لیتا لیکن نیند کوسوں دور ہوتی۔میری دائیں جانب کھڑکی میں سے سٹریٹ لائیٹ آتی تھی، اس کی روشنی سیدھی اس طرف پڑتی تھی جس طرف ظفر سوتا تھا۔اسی دیوار پر سفیدی کچھ اس طرح اکھڑی تھی کہ ایک چیتا اندھیرے میں لپکتا دیکھتے ہی دیکھتے رنگ اختیار کر لیتا۔اس کی آنکھیں زرد شعلے برسانے لگتیں۔۔۔۔چہرے آہستہ آہستہ ٹوٹی پھوٹی دیوار کی سفیدی سے بنی ہوئی یہ وہم وگمان کی شبیہ مجھے حقیقتاََ رضائی یا چادر سے چہرہ ڈھانپنے پر مجبور کر دیتی آج بیلکونی میں بیٹھے بیٹھے چیتا مجھے ایک بار پھر یاد آ گیا۔۔۔۔میری زندگی مین وہ غم اور مظالم زیادہ تھے جنہیں ایسے چیتوں نے مجھ پر وار رکھا جو حقیقت میں موجود نہ تھے۔ہمارے گھرانے پر پاکستان کے اور اللہ کے احسانات ہی احسانات تھے،لیکن ہم نے اپنے شکوک وشبہات سے آستینوں میں چھپے بتان وگمان کی مدد سے زندگی میں زہر گھولنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی ۔۔۔۔ہم ان لوگوں سے خائف تھے جو ہماری طرح مہاجر ار بے یار و مددگار تھے۔۔۔۔ہم ان تعلیم گاہوں سے خوفزدہ تھے جہاں پڑھنے والے اور ہم بھی طالب علم ناآشنا چہروں والے تھے۔۔۔۔ہم شہر کی سڑکوں بازاروں،بس سٹاپوں کو دیکھتے رہتے۔خوف کے چیتے ہمیں ہر موڑ پر ہر نئ شکل میں کسئ نئے واقعہ کی ہیبت سے ڈراتے۔

ہم ہجرت کے ساتھ ہی یہ خوف نام چیتے لے کر آئے تھے۔۔۔۔ہم تو ان شہروں ،گھروں ،سڑکوں سے بھی ناواقف تھے جن کو ہمیں اپنانا تھا۔ہر موڑ پر وہی چیتا لپکتا چلا آتا تھا۔

اَن دیکھے کا کوف

اَن جانے کا خوف

اَن چکھے کا خوف

اَن چاہے کا خوف ----

وہم وگمان کا چیتا نئ شکلیں بنا کر ہمارے تعقب مین رہتا اور ہم اس سے ایسے بھاگتے جیسے پولیس سے چور بھاگتا ہے۔نہ ہم کہیں ٹھرتے نہ کسی مقام سے آشنائی حاصل کر سکتے ۔یوں پاکستان میں ہمارا سفر چیتا جھپٹی سے شروع ہوا۔

تین خوش فہمیاں ،جن میں عموماً لوگ زندہ رہتے ہیں۔

میں خوش ہوں کہ میں ایسی گلی میں بڑھا پلا، جہاں سب ایک دوسرے کو جانتے تھے۔

میں خوش ہوں کہ ایسے آزاد ملک میں پرورش پائی، جہاں کسی کو کسی سے سروکار نہیں ۔تیسری خوش فہمی یہ ہے کہ میرے وطن کے لوگ سب سے اچھے ہیں اور یہاں کوئی برائی نہیں۔

ارجمند سلور سپرنگ جاتی ہے۔ہر صبح بچوں کو منٹگمری کالج سے ملحق سکول میں ڈراپ کرنے کے بعد وہ پورے چالیس منٹ میں ہسپتال پہنچ جاتی ہے، جہاں اس کا شمار پیرا میڈیکل سٹاف میں شمار ہوتا ہے۔وہ ایک امریکن ڈاکٹر کی receptionist ہے۔اس کی چال ت پھرت میں بڑاا اعتماد ہے۔اس کا لباس تو ویسا شوخ وشنگ نہیں جیسا وہ لاہور میں پہنتی تھی۔لیکن اس کے انداز بہت شوخ ہو چکے ہیں۔امریکنوں کی طرح وہ جینز ٹی شرٹ پہنتی ہے۔کبھی کبھی جب ہسپتال میں کافی فارٹی یا گٹ ٹوگیدر ہوتا ہے وہ سکرٹ اور بلاؤز بھی پہن لیتی ہے۔ایسے میں اس کی

ٹانگیں سکرٹ کی بیک سلٹ کی وجہ سے پنڈلیوں تک نظر آتی ہیں اور بلاؤز بھی وہ کچھ ایسے اہتمام سے پہنتی کہ اوپر سینے سے دو تین بٹن کھلے ہی ہوتے ہیں۔ارجمند کو امریکی لباس پسند ہے۔وہ کہتی ہے یہ امریکی لباس بہت پریکٹیکل ہے۔۔۔اس میں کا کرنا دشوار نہیں۔

ابھی مجھے جرمن ٹاؤن میں آئے بہت دن نہیں ہوئے تھے۔ایک دن میں نے ارجمند سے پوچھا۔۔۔''یہ تم نے اپنی شلوار قمیض کیوں چھوڑ دی ارجمند؟۔۔۔۔''

ارجمند کچھ دیر منہ میں زبان گھماتی رہی۔شاید وہ مجھے اپنی بات سے زخمی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''بات یہ ہے ابو۔۔۔انسان کو پانی کی رو کے ساتھ بہنا پڑتا ہے۔میں شلوار قمیض میں بہت Odd محسوس کرتی ہوں۔۔۔mainstream سے کٹ جاتا ہے آدمی۔''

''لیکن اپنی شناخت تو رہتی ہے نا ارجمند۔۔۔''

''ہاں رہتی تو ہے ابو۔۔۔لیکن اگر لوگ اس شناخت کے باعث آپ سے نفرت کرتے ہوں آپ کو کمتر جانتے ہوں تو پھر اپنا لباس چھوڑنا پڑتا ہے۔نیا چولا پہننا پڑتا ہے۔''

میں خاموش ہو جاتا ہوں۔

''ابو شلوار قمیض گھریلو لباس ہے۔اوپر سے ڈھائی تین گز کا دوپٹہ بڑا Cumbersome ہوتا ہے۔کبھی میز میں پھنستا ہے کبھی کرسی میں۔۔۔کام پر تو یہی جینز کام آتی ہے بہت پریکٹیکل،،،،''

میں ارجمند سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

بیٹی بیٹی سے کوئی کیسے کہے کہ شلوار قمیض ستر پوش لباس ہے۔اگر دوپٹے کو سر

ڈھانکنے کے لئے استعمال کرو تو بھی یہ لبادے کا کام دیتا ہے۔۔۔مجھے یاد آیا کہ جب ہم سانده میں رہا کرتے تھے اور شاہد بھائی ایم اے او کالج جاتے تھے۔ان دنوں پتہ نہیں کیوں اور کیسے اماں نے اپنا بوسکی کا سفید شٹل کاک برقعہ اتار دیا اور چادر اوڑھنے لگی۔کچھ دیر آپا نے دو حصوں والا nuns جیسا سیاہ برقعہ پہنا، لیکن جب تک ہم سانده چھوڑ کر ٹمپل روڈ تک پہنچے۔آپا کا برقعہ بھی چھوٹ چکا تھا اور وہ چوبرجی سکول میں چادر اوڑھ کر ہی جایا کرتی تھیں۔لباس انسان کی اندرونی تبدیلیوں کا ایک مظہر ہی تو ہے۔

گیراج کے اوپر کی بیلکونی مین بیٹھ کر میں سارا دن تقابلی سوچوں میں گزارتا۔یہ سوچیں کبھی تفکرات میں بدل جاتیں، کبھی تضادات میں۔۔۔کبھی اپنی زندگی کو سمجھنے میں سہولت ملتی اور کبھی یہی سوچ مجھے الجھا کر رکھ دیتی۔ماضی کے لوگ واقعات نظریات یوں آتے، گویا میں رسی ٹاپنے کے عمل میں ہوں، میں رسی سے اچھل کر انہیں گزر جانے دیتا۔۔۔لیکن رسی پھر لوٹ آتی۔

سوچ بار بار آتی اور میں۔۔۔ٹاپتا رہتا

اچھلتا چلا جاتا۔بڑھاپے میں انسان کے پاس ان سوچوں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔وہ اپنی گدڑی پھرولتا رہتا ہے، جوئیں تلاش کرنے میں وقت گزارتا ہے اور کسی طور بھی مطمئن نہیں ہوتا۔

بیلکونی سے کبھی کبھی مجھے ایک نوجوان نظر آتا۔وہ گھروں کی پرائیویٹ سٹک پر چلتا بس سٹاپ کی طرف جاتا دکھائی پڑتا۔میں نے پتہ کیوں اس کا نام کاشف رکھ لیا۔ہوسکتا ہے وہ مہندر پرکاش ہو۔یہ بھی ممکن تھا کہ یہ ہسپانوی نژاد احمد نامی نوجوان انسلد سے فراف ہونے والے مسلمان پرکھوں کی اولاد ہو۔وہ جو کوئی بھی تھا میں نے اس کو کاشف کا بپت سمہ دے کر اپنا لیا تھا سنا ہے آج سے ہزار سال پہلے جب ہسپانیہ

سے مسلمان فرار ہوئے تو انہوں نے امریکہ آ بسیرا کیا۔ وہی پہلے تارکین وطن تھے جنھوں نے کولمبس سے پہلے یہ جزیرہ دریافت کیا، کیوبا، میکسیکو، ٹیکساس اور نیوادا میں مسجد میناروں اور قرآن آیات کے کھندرات ہیں۔ امریکہ اور کنیڈا مین ایسے لاتعداد شہر ہیں جن کے نام یہاں کے پہلے تارکین مسلمانوں نے رکھے واشنگٹن ،نیویارک، اور ٹیکساس میں مدینہ مکرمہ نام کے شہر اس بات کے گواہ ہیں کہ یہاں کے ہسپانوی تارکین نے یہ نام اپنی عقیدت کے اظہار میں رکھے تھے،

جب تک میں کمروں میں چلتا پھرتا ہوں، بڑی ٹھس سی نارمل زندگی گزارتا ہوں فریج سے لفٹ اوورز نکال کر کھا لیے۔ واشنگ مشین میں کپڑے ڈال کر دھو لیے ٹیلیویژن پر کیبل کی مدد سے سٹیشن بدل بدل کر مختلف ٹوٹے دیکھ لیے۔ ایسے اخبار جو سیروں کے حساب سے دروازے کے ساتھ ہی پڑے رہتے ہیں، اٹھائے اور پڑھ لیے۔ لیکن جونہی میں بیلکونی میں جا بیٹھتا ہوں۔ میرے دماغ کا اینٹینا ایسی باتیں سوچنے لگتا ہے جو خود میرے لیے بڑی نئ ہوتی ہیں۔ عام طور پر بڑھاپے کے پاس مستقبل کے لئے کوئی پلان نہیں ہوتے۔ بوڑھے ولولے اور امید سے عاری اپنا منہ ماضی کی طرف کیے رکھتا ہوں۔ دیکھی بھالی گلیاں، جانے پہچانے چہرے۔ گزرے ہوئے موسموں پر تارچ پڑتی ہے تو وہ اپنے اندھیروں سے چونک پڑتا ہے۔ اسے لگتا ہے جیسے واقعات، حادثات، معمولات ماضی کا نہیں حال ہی کا حصہ ہوں۔ بوڑھا مستقبل سے صرف موت کی جھلکیاں دیکھتا ہے اور یہ حقیقت کچھ ایسی پر امید نہیں ہوتی۔

دوسری منزل پر ایک بیلکونی سی ہے۔ میرا بیڈ روم ہے اور اس کا ایک دروازہ بیلکونی میں کھلتا ہے۔ اس کی لمبائی کوئی دس بارہ فٹ اور چوڑائی قریباً چار سے چھ فٹ

ہے، یہ چھوٹی بیلکونی لکڑیوں کی کھپچیوں سے بنی ہے ارجھکنے پر اس کی درزوں سے گیراج سے نکلتی گاڑیاں نظر آتی ہیں سامنے لکڑی کا جنگلا ہے۔اگر پاکستان ہوتا تو اس جنگلے پر تولیے، شلواریں، قمیص، بچوں کے جانگھیے ،فراکس غرضیکہ ہر سائز اور نمونے کا کپڑا سا کھنے کے لئے پڑا رہتا۔۔۔اندرون شہر اور پرانی انار کلی میں کپڑے سکھانے کا یہ منظر عام طور پر نظر آتا ہے۔چھوٹی بچیاں بیلکونی میں بیٹھ گڑیوں سے کھیلتی ہیں۔ جو ان لڑکیاں کپڑوں کی آڑ کے پیچھے کھڑی ہو کر بازار میں جھانکتی ہیں ۔ جو ان بازار والیاں ایسے ہی چھجوں پر ٹیک لگا کر نظر بازی اور رازاروں سے کام لے کر کمروں کا دھنا چلاتی ہیں۔یہ چھجے اندرون شہر کے کلچر، زندگی اور دھوپ کا منبع ہیں، لیکن اس پوش علاقے کہلاتے ہیں، ان کے رہن دار بھی خوشحال لوگ ہوتے ہیں۔

امریکہ میں مکان عموماً بنکوں کے پاس رہن ہوتے ہیں۔ایک مدت سود اور اصل زر کو قسطوں پر ادا کرتے رہنے سے بنک میں گروی رکھا ہوا گھر ذاتی ملکیت بنتا ہے۔

سفید آدمی اپنی زندگی زیادہ تر قرض پر کاٹتا ہے۔امریکہ مین ہیرے تک قسطوں پر مل جاتے ہیں ۔ہمارے ہاں ابھی انسٹالمنٹ کا رواج اتنا عام نہیں اور ڈاؤن پے منٹ بھی آسانی سے ادا نہیں کی جس سکتی۔یہ گھر جو میری بیٹی اور داماد کا ہے امریکہ کے اعتبار سے کافی کشادہ ہے اور اس کی ڈاؤن پے منٹ کے بعد وہ ہر ماہ قریبا دو ہزار ڈالر کی قسط ادا کرتے ہیں اس کے علاوہ کچھ فرنیچر، ڈی وی ڈی، کیبل، کار نہ جانے کتنا کچھ قسطوں پر ہے۔قرض کی مئے پینے کے بعد ان دونوں کو فاقہ مستی پر کوئی گلہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ بڑے خوش و جزبے کے ساتھ امریکہ کے گن اور پاکستان کے اوگن بیان کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔قرض پر معیار زندگی وقت سے پہلے حاصل کر کے وہ پھولے نہیں سماتے۔ بلکہ سمجھتے ہیں انہوں نے بدقسمتی کو جل دے دیا ہے۔

یہاں بیلکونی میں پلاسٹک کی کرسی پر بیٹھ کر میں سامنے والی بلڈنگ اور خوبصورت

ڈھلی ڈھلائی سڑک، آنے جانے والے لوگ اور اپارٹمنٹس میں بسنے والوں کی آمدو رفت کو دیکھتا رہتا ہوں۔یہ منظر میرے سلور سکرین کا کام دیتا ہے۔

میرے دماغ کی سکرین پر امریکہ اور پاکستان دونوں باری باری اور کبھی ساتھ ساتھ بھی چلتے ہیں۔میرے اردگرد کپلنگ کا مقولہ گھومتا رہتا ہے کہ مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق، یہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے۔

سوچتا ہوں مل بھی کیسے سکتے ہیں؟ مشرق میں جب سورج چڑھتا ہے،مغرب میں ؔ ین اسی وقت آغاز شب کا منظر ہوتا ہے۔سورج انسان کے دن اور رات کو متعین کرنے والا ہے۔پھر جب ایک رات ہو اور دوری جگہ سورج کی کرنیں پھیلی ہوں تو بھلے ہی سارے فرق مٹائیے ایک مخلوق سوتی ہے دوسری جگہ بیداری ہوتی ہے۔فاصلے کم ہونے میں نہیں آتے۔

مشرق کے لوگوں کی رنگت اور مغربی لوگوں کی جلد دوسرا فاصلہ ہے جسے عام انسان پاٹ نہیں سکتا۔

لیکن سب سے بڑی مشکل آج کے عہد میں ترقی کی ہے۔۔۔ایک وقت تھا جب مشرق میں سورج بھی اگتا تھا۔جاگرتی بھی تھی اور مشرق روحانی طور پر مغرب سے زیادہ ترقی یافتہ بھی تھا لیکن اب ترقی کا تصور بالکل بدل چکا ہے۔۔اب ترقی دنیاوی مادی

اور مال کی ہے۔مشرق اس ترقی کا تصور بھی ٹھیک طور پر نہیں کر سکتا۔ایک زمانہ تھا جب مشرق نے ساری دنیا کو فلاح کی ترقی عنایت کی تھی اور واضح بات ہے کہ مذہب صبر،توکل، بھائی چارہ، محبت، اخوت جیسے اصول اپنانے پر ابھارتا ہے۔خواہشات کو دبانا، اسراف سے بچنا، مسابقت میں نہ پڑنا،فساد نہ پھیلانا، نمائش سے گریز انا کی

سرکوبی فلاح کے لیے اہم ہیں۔آج کے زمانے میں معاشی ترقی کے لیے اصول ان کے برعکس ہیں۔اسراف اس ترقی کا سنگ بنیاد ہے۔خوہشات کی کھڑکیاں ہمیشہ کھلی رہیں تو ترقی ہوتی ہے۔روپیہ گھر سے بازار تک آتا جاتا رہے مسابقت وہ تیل ہے جو ترقی کی مشینی گراریوں میں پڑتا رہے تو مشین چلتی ہے۔یہاں صب توکل نام کا دیا نہیں جاتا۔جو کچھ ہونا ہے ابھی اسی وقت اسی لمحے کی گھنٹی بجاتا ہے،اس بے کلی سے رفتار پیدا ہوتی ہے،سڑکوں پر ٹریفک جیم تیار ہوتا ہے،سیڑھیوں متروک ہوتی ہیں لفٹیں اوپر نیچے آتی ہیں گھڑی بار بار دیکھنا اور کار میں دروازے کھلنے والے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر سفر کرنے کا رواج بڑھتا ہے۔انسان بے قرار نہ ہو تو ترقی نہیں کرسکتا ۔دوسروں کو مار گرانے کا جوڈو کراٹے نہ آئے تو آگے بڑھ نہیں سکتا۔روپے سے محبت پیدا نہ ہوسکے تو ترقی کا تصور حاصل نہیں کرسکتا۔اسراف،مسابقت،خواہشات،کا پٹا تیزی سے چلے تو زمانے کی پٹڑی پر ترقی فل سپیڈ چلتی ہے۔

مشرق کی روحانی ترقی اور چیز تھی

اور مغرب کی معاشی ترقی اور علم ہے۔۔۔۔مغرب کی شاہراہ مادی دنیاوی تروی ہے اور مشرق کی پگڈنڈیاں فلاح کی جانب نکلتی ہیں۔جہاں تک میرا ہیلکونی کا علم ہے میں سمجھ پایا ہوں کہ ہماری روح جسم میں پنجرے کے طوطے کی طرح قید ہے روح مجبوراً طوعاً

وکرہاً اس پنجرے میں رہتی ہے۔طوطے کو قطعی پروا نہیں کہ پنجرے پر کیا گزرتی ہے۔یہ چاہے سونے کا ہو،اسے صرف اسی وقت آزادی میسر آسکتی ہے جب پنجرہ چھوڑ کر طوطے اپنے راستے جا نکلے۔نہ پنجرے کو اس بات کی پریشانی ہوتی ہے کہ اس کی سلاخوں کے اندر ایک سر پٹکتے تیلیوں سے ٹکرانے والی روح کون ہے،کیا ہے۔نہ

ہی روح پلٹ کر دیکھتی ہے کہ پنجرے پر کیا اور کیوں گزری۔

نئ ترقی کی تمام تر توجہ پنجرے پر ہے۔اسے طوطے کی پرواہ نہیں۔پنجرے کا ڈیزائین، رنگوروغن،اس کے اردگرد زیبائش، آسائش کا ہر ممکن فارمولا آج کی سوچ پر حاوی ہے۔۔۔انسان اپنے جسم اوراس کی ضرورتوں میں اس درجہ مگن ہوگیا ہے کہ اسے اس جسم کی کوٹھڑی میں محبوس قیدی کی پرواہ نہیں رہی۔کھانا۔پہننا،اوڑھنا،بچھونا اب Priority میں مقدم ہیں۔وہ جسم سے وابستہ ہوکر بازاروں کا رمتا جوگی بن گیا ہے۔انڈسٹری ،میڈیا،انٹرنیٹ،بانگ دہل انسان کو اس کی ضروریات کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔اب خواہشات کو دبانا،مسابقت سے پرہیز کرنا فساد سے ہاتھ اٹھانا نئ ترقی کے گناہ ہیں تمام رشتے،اقدار،رسم و رواج ،تہذیبی فارمولے،مذہبی احکامات منہ اٹھائے انسان سے علیحدہ علیحدہ گھومتے پھرتے ہیں جیسے گریب رشتہ دار گاؤں سے آکر شہری رشتہ داروں کے گھر قیام پزیر ہوں اور نہ جانتے ہوں کہ انہیں قیام جاری رکھنا ہے کہ واپس لوٹ جانا ہے۔۔۔ان کا رشتہ اصلی ہے کہ جعلی۔وہ ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں بھی کہ نہیں؟

نئ ترقی کے پاس وی بل ڈوزر ہے جو مذہبی باڑھوں کو اکھاڑتا پچھاڑتا ہموار کرتا چلا جاتا ہے۔صرف محنت کا عزم اور کام کی اخلاقیات کے رولز پکڑا کر اپنا راستہ سیدھا کرلیتا ہےاور نئ سڑکوں پر ہیومن رائٹس کی کولتار بچھا کر انسان کو جس قدر زیادہ مشینی اوروقت کا پابند بنا سکے۔بنا ڈالتا ہے۔اس بل ڈوزر تلے کیا کچھ پس جاتا ہے اس کی پرواہ نہیں۔اقدار،رسم و رواج ،مذہب کے پھول اکھاڑ کر وہ گھاں گھاں کرتا آگے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

تھرڈ ورلڈ کے لوگ عام طور پر مسلمان ممالک خصوصی طور پر اپنی نالایقی پر بہت بسیمان ہیں۔وہ ایٹم بم بنا کر بھی احساس کمتری سے چھٹکارا حاصل نہیں سکتے۔جب ترقی کا حالیہ نسخہ ان کے ہاتھوں میں آتا ہے تو احساس ضرم وے وہ سٹ پٹا کر مسجد کی

طرف بھاگتے ہیں۔ جب نئی ترقی کا جن ان کے دروازہ پر دستک دیتا ہے تو وہ اسے وارنٹ سے کم نہیں سمجھتے۔ نیوٹن کے اصول کے تحت ترقی کا عمل ردعمل میں بدلتا ہے۔ پھر اسلامی تحریکیں چلتی ہیں۔ چاند تارے والے علم لہرائے جاتے ہیں۔ جہاد کا نعرہ لگتا ہے۔ مجاہدین کو دہشت گرد کا الزام سہنا پڑتا ہے۔ روحانی ترقی کے خواہشمند بنیاد پرست کہلاتے ہیں۔ خود ان ہی کے بھائی بند جو نئی ترقی کو انسان کی بلندی کا وحد راستہ سمجھتے ہیں۔ ادابدا کر ایسے لوگوں کو جاہل، ان پڑھ، روایت پسند، لکیر کے فقیر سمجھ کر ان سے اپنی زندگی کا دھارا الگ کر لیتے ہیں۔ اغیار کی لعن طعن سے تو فلاح پسند لوگ دل برداشتہ نہیں ہوتے لیکن اپنوں کے الزان ان کے دلوں میں میخیں بن کر گڑ جاتے ہیں۔

جہاد جو نماز کی طرح بنیادی ارکان مین سے ہے اسی جہاد کے لیے وہ اپنے لیے اور غیروں کے حضور تاویلیں پیش کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور سمجھا نہیں پاتے کہ بنیادی ارکان انسان کی مرضی کے پابند نہیں۔ مشکل یہ ہے کہ انہیں بھی علم نہیں ہوتا کہ وہ پنجرے کے طوطے کو اڑنے سے پہلے آزاد نہیں کرا سکتے اور نئی ترقی کا دلدادہ سوائے پنجرے کے بیرونی ماحولیات کے اور کوئی علم نہیں رکھتا۔۔۔ اس کے لئے روزگار، جسمانی صحت، تعلیم، آزادی نسواں، پولیوشن، بنیادی ہیں۔ وہ جسمانی سہولتوں سے آگے ہر سفر کو خلائی سفر سمجھتا ہے۔

میں بیلکونی کی کرسی کھسکا کر آگے جنگلے تک لے جاتا ہوں اس طرح میری ٹھوڑی جنگلے سے چھ انچ کے فاصلے پر ہے۔ میں یونانی بڈھے کی بیلکونی سے قریباً ساٹھ فٹ دور ہوں نیچے گندی گاڑہ کھڑی ہے اور اس کے ورکر بڑی چابکدستی سے پلاسٹک کے تھیلے اٹھا اٹھا کر گند گاڑی میں ڈال رہے ہیں۔ سوچتا ہوں امریکی لوگ اپنے اپنےکام کو اتنی چستی سے کیسے کر لیتے ہیں؟ کیا سفید فارم لوگ قدرتی طور پر رزق

حلال کمانے کے شوقین ہیں؟ کیا ان کے مذہب نے انہیں سچائی سکھائی ہے؟

کیا وجہ ہے کہ پاکستان میں خصوصی طور پر اور عام طور پر سارے تھرڈ ورلڈ میں نظام نہیں چلتے؟

کیا ہمارے نظام کے اندر ہی کچھ ایسے بدیہی اور چھپے ہوئے پھندے ہیں جن میں انسان پھنس جاتا ہے؟ یا بنیادی طور پر ہماری فطرت نافرمان ہے؟

کیا رشوت، سفارش، دھاندلی کا تعلق ہماری تربیتوں کا نتیجہ ہے؟

کیا واقعی درست تربیت کے بغیر معاشرہ بنا کر ہم پراگندہ حال ہوئے۔ امریکی ترقی کی دیوی کے پرستار ہیں تو اس دیوی نے انہیں مالا مال بھی کیا ہے۔ بہت غور سے سوچنے کے بعد مجھ پر منکشف ہوا کہ امریکہ کو ڈاکوؤں نے بسایا تھا۔ ڈاکو کی کچھ بنیادی خصوصیات دلیر، بہادر اور زبردستی ہیں وہ جب کسی چیز کو ہتھیانا چاہتا ہے تو اپنے آپ کو سینہ زوری پر ابھارنا اس کے لیے مشکل نہیں ہوتا۔ امریکہ کو جب سڑکیں بنانے، جنگل کاٹنے اور اشیاء کی بھرمار کرنے کی ضرورت تھی اس نے جال ڈال کر نیگرو لوگوں کو ہتھیا کر جہازوں میں لادا اور امریکہ کی سرزمین پر سرگرداں پھینک دیا۔ جب امریکی لوگوں کو اس سرزمین پر قابض ہونے کی خواہش نے ستایا تو ریڈ انڈین کو امریکن نے چن چن کر ختم کیا۔ جب انہیں انگریزی زبان لوٹنے کی ضرورت پیش آئی تو انگریز علم یوں اپنایا کہ اس کا لب ولہجہ، حروف کے لہجے اور slang کا اضافہ کر کے ایک ایسی زبان ایجاد کی کہ انگریز بھی اس اجنبی انگریزی سے ششدر رہ گئے۔ امریکی ڈاکو اگر ترس ہو تو رابن ہڈ کہلاتا ہے۔ اگر عالم ڈاکو ہو تو اس کو تہس نہس کرنے والا دہشت گرد کہا جا سکتا ہے۔ اسے آپ جرثومہ کا کرشمہ کہیں یا پرکھوں کے رسم و رواج کی پیروی یا امریکی مزاج کی خوبی لیکن یہ بات واضح ہے کہ کسی خطہ کے بسنے والوں کی عام سائیکی ایک ہی ہوتی ہے۔ جمشید اور قیصر دونوں مسلسل گھنٹی بجا رہے ہیں۔ ان کو

خوشنودی حاصل کرنے کے لئے میں ساری سوچوں کو کرسی پر رکھ کر اندر بھاگتا ہوں۔

ارجمند ایک یہودی امریکن ڈاکٹر کی Reseptionist ہے جو بظاہر بہت لبرل آدمی ہے، لیکن صبح روانگی کے وقت ارجمند کے چہرے پر ایسا ملال ہوتا ہے جس کا کوئی نام نہیں ۔۔۔۔ جو صرف اسی وقت چہرے پر آتا ہے جن کوئی شخص آپ کو نہ سمجھے اور آپ کو کمتر جانے ۔ارجمند بروقت پہنچنا چاہتی ہے لیکن عموماً بچے اس کے ساتھ ہوتے ہیں ۔وہ گھر

سے نکلتے ہی آوازوں میں بدل جاتی ہے اور ار جمند نہیں رہتی ۔وہ یہودی امریکن ڈاکٹر کے خوف سے ناشتہ نہیں کھاتی ،ہاتھ میں سینڈوچ رکھتی ہے اور ڈرائیو کرتے ہوئے کھاتی جاتی ہے ۔راستے میں ہی بال بھی برش کرتی ہے اور کار کے آئینے میں دیکھ کر لپ سٹک لگا لیتی ہے۔

برصغیر تفرقے پر چلتا ہے ۔یہاں صدیوں سے پیشوں کے اعتبار سے ذات پات نے لوگوں کو بانٹ رکھا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد امید کی جاتی تھی کہ لوگ بھائی چارہ اپنائیں گے اور پاکستانی معاشرہ اسلام کے بنیادی اصول مساوات کا مظہر ہو سکے گا ۔لیکن بدقسمتی سے پاکستانی لوگوں کا خمیر ان لوگوں سے اٹھا ہے جو اونچ نیچ کو روا رکھتے ہیں ۔اسی لیے یہاں کئی قسم کے تفرقات نے سر اٹھایا ۔لسانی،جغرافیائی ۔نسلی، تعلیمی، خواتین کی آزادی، رسم و رواج کے تغیرات ، ذات پات کی اونچ نیچ ،مذہبی بوقلمونی،طبقاتی نزاع ان سب نے مساوات کے بنیادی اصول کو اپنا نہیں سکا اسی لیے یہاں کے معاشرے کی شناخت اختلاف ،تفرقہ اور اونچ نیچ میں منتج ہوئی اور امریکہ ڈاکو کی ذہنیت کو اپنے جرثومہ میں چھپائے پھرتا ہے ۔امریکی اب بھی ڈاکو کی

جملہ خوبیوں اور خوابیوں سے مرصع ہے۔جب چاہے دشنام دے۔جب جی آمادہ ہو خلعت بخش دے اللہ اللہ خیر صلاح۔

ارجمند جب گھر سے نکلتی ہے تو دونوں بچے ساتھ ہوتے ہیں۔آوازیں آتی ہیں۔

''قیصر get quick........I am getting late.....''

''سینڈوچ رستہ میں کھانا کم آن۔۔۔۔۔''

''جمشید یو فول۔۔۔۔۔اب کیا ہوا ہے؟۔۔۔۔۔''

''میں نے گاڑی آن کر دی ہے۔۔۔I can,t wait any more''

''اگر تم لوگ دومنٹ مین نہ آئے تو میں تمہیں چھوڑ جاؤں گی۔۔۔۔۔''

''This is hell.........''

یہ آوزیں بچوں کے لودھونے تک آتی رہتی ہیں اور ہمیشہ کے لیے ان کے اند پروگرام ہو جاتی ہیں۔۔۔ایک روز میں نے ارجمند سے ڈرتے ڈرتے کہا۔۔۔

''تم اس قدر پریشان جو ہوتی ہو تو نوکری چھوڑ دوناں۔۔۔۔۔''

''ہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔یہی نوکری تو میری اپنی ہے۔۔۔۔باقی میرے پاس اپنا کیا ہے؟''انسان کے پاس اپنا ضرور کچھ ہونا چاہیئے ،ابا چاہے ہتھوڑی کا دستہ ہی کیوں نہ ہو۔

''کتنے پیسے ملتے ہیں تمہیں؟''

''ہزار ڈالر۔۔۔۔''

''تو کیا تمہیں بلال کافی رقم نہیں دیتا۔۔۔''

''پیسے تو بہت دیتے ہیں، لیکن یہ ایک ہزار میرے پاس میرے اپنے ہیں۔میری اپنی کمائی ان دس انگلیوں کی ، مجھے ان پیسوں سے آزادی کا احساس ہوتا ہے۔انہیں

میں جہاں چاہوں خرچوں۔‘‘

’’میرے اپنے سے کیا مراد ہے؟‘‘

’’ان کا جو کچھ مرضی میں کروں۔میں ان کے لئے Accountable نہیں ہوں۔‘‘

’’ارجمند۔۔۔یہ تمہاری زندگی ہے اس کے سارے فیصلے تمہارے ہونے

چاہئیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تم جمشید اور قیصر کے لئے بھی جواب دہ ہو۔۔۔وہاں تمہاری مرضی نہیں چل سکتی۔‘‘

’’تو میں ان کی ساری ڈیوٹی دیتی ہوں ابو۔۔۔سارے کام میرے ذمہ ہیں۔بلال تو واپسی پر صرف فٹ بال کا میچ ٹیلی ویژن پر دیکھتا ہے۔۔۔کھانا کھاتا ہے اور سو جاتا ہے روٹیاں sleeping full toss....eating‘‘

’’اور ویک اینڈ پر تمہیں اور بچوں کو تفریح کے لئے شہر سے دور لے جاتا ہے۔۔۔دودھ کی بھاری بوتلیں، آٹے کی تھیلے ساری گرسریز لاتا ہے۔پھر جگہ جگہ رکھتا ہے اور اپیرن لگا کر برتن دھوتا ہے۔ملازم منڈو کی طرح اور سارے کپڑے استری کرتا ہے تمہارے اور بچوں کے ....Vacum کرتا ہے سنڈے کو۔‘‘

’’ابو ایک بات بتائیں۔۔۔‘‘

میں سر میں انگلی پھیر کر پوچھتا ہوں۔۔۔’’کیا؟ کیا بات بتاؤں۔‘‘

’’آپ میرے ابو ہیں کہ بلال کے؟۔۔۔آپ کو مجھ سے محبت ہے کہ بلال سے۔‘‘

میں اس کی بات کا جواب نہیں دے سکتا، کیونکہ مجھے بلال پر ترس آتا ہے۔ارجمند سے مجھے پیار ہے، لیکن ارجمند کے رویے میں کچھ ایسی بدلحاظی یا دیانت داری ہے کہ اگر میں بلال کی جگہ ہوتا تو شاید برداشت نہ کرسکتا۔ارجمند ہر معاملے مین

اس قدر برابری کی خواہاں ہے کہ اگر اس کا بس چلتا تو جمشید کی پیدائش کا ضامن بلال ہوتا اور قیصر کو وہ جنم دے لیتی۔ نہ وہ حیاتیاتی فرق سمجھتی ہے نہ ہی اسے مرد اور عورت کے جداگانہ رولز کی سوجھ بوجھ ہے۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے آپ سے۔ آپ کو مجھ سے محبت ہے کہ بلال سے۔''

''ابو تو میں آپ کا ہی ہوں۔ محبت بھی تم ہی سے ہے۔۔۔ لیکن میرے خیال میں بلال مظلوم ہے۔''

''ہر وہ آدمی جو Male Chauvanism میں یقین رکھتا ہے ایسے ہی سمجھتا ہے ابو کہ مرد مظلوم ہے اور عورت آپے سے باہر ہو رہی ہے۔۔۔ یہ عورت سے بے انصافی ہے۔ سراسر بے انصافی۔ عورت سو جوتیاں بھی کھا رہی ہے اور سو پیاز بھی۔''

''لیکن اپنی مرضی سے اپنی چوائس سے'' میں عرض کرتا ہوں۔

''آپ کی سوچ ٹیڑھی ہے ابو ۔۔۔ پلیز سیدھا سوچنا شروع کریں ۔۔۔ وقت بدل چکا ہے۔ اب پتھر اور دھات کا زمانہ نہیں۔''

''یقیناً یہ میڈیا، رفتار اور اشیا کا زمانہ ہے۔۔۔ لیکن اندر ایک روح جدید نہیں ہو سکا۔ بدقسمتی سے وہ گوشت پوست کا بنا ہے۔۔۔ اس کے اندر ایک روح بھی ہے جو اتنی پرانی ہے۔۔۔ اتنی پرانی ہے جتنا انسان خود۔۔۔ اس روح کے سوالات بھی پرانے ہیں اور جواب بھی وہی چلے آتے ہیں۔''

''ابو یہ بحث اب اس زمانے میں لاگو نہیں رہی ۔۔۔ خدا کے لئے اپنی سوچ بدل لیں۔ پرانی جہالت چھوڑ دیں چھوڑ دیں۔''

''اچھا ۔۔۔ یہ بتاؤ تم خوش ہو ارجمند؟'' میں نے سوال کیا۔

وہ چند لمحے چپ رہی پھر بولی ۔۔۔ ''پتہ نہیں؟''

''کیوں؟ ۔۔۔۔۔''

''ٹھیک سے جواب مجھے بھی معلوم نہیں۔''

''اچھا یوں کرو ارجمند ۔۔۔تم دونوں واپس چلو پاکستان وہاں ۔ نہ تمہاری لائف ٹف ہوگی نہ بلال کی ۔۔۔تمہارے پاس ملازموں کی پلٹن ہوگی اور تمہیں اتنا کام نہیں کرنا پڑے گا۔بیگم بن کر عیش کرنا بیگماتی نظام وہاں خوب چلتا ہے صبح بارہ بجے اٹھنا ،گیارہ بجے بازار کھل جاتے ہیں وہاں گھومنا ۔۔۔کافی پارٹیاں غیبت ،چغلی ،میٹنگ،سکینڈل ۔۔۔دھونس شور شرابا۔آرزوئیں ہی آرزوئیں۔''

"god fobid ابو۔۔۔ایسی بری بات منہ سے نہ نکالیں illiterate fools کی پلٹن رکھ کر مجھے آرام ملے گا توبہ کریں I hate servants میں نے بڑی جرائت سے کہا۔۔۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہاں تمہارا خاوند ملازم ہے۔اس سے بڑی ذہنی عیاشی اور کیا سکتی ہے کہ اپنا شوہر آداب بجالانے کے لئے موجود رہے،سارے آڈر مانے اور استعفیٰ نہ دے سکے۔۔۔''

صدیوں سے مرد نے عورت کو domestic servant کی طرح استعمال کیا ہے ابع ۔۔۔اب تھوڑا سا ہاتھ بٹا کر کیسے چیں چیں کرتا ہے اور تو اور باپ بھی اس discrimination میں شامل ہو گیا ہے ۔وہ بھی بیٹے کا ساتھ نہیں سکتا کیونکہ وہ بھی بالآخر مرد ہے''

''پیاری بیٹی ۔۔۔میری چاندی ارجمند ۔۔۔۔''

''چاپلوسی I Hate''

ارجمند کی سچائی مجھے شرمندہ کر دیتی ہے ۔۔۔۔

''ابو آپ بھول رہے ہیں ۔ہم پاکستان کے عذابوں سے نکل کر یہاں آئے ہیں ۔آپ مجھے واپس اسی گھٹے گھٹے ماحول میں گرمی اور دھول میں،احمق جاہل تنگ نظر لوگوں میں بلا رہے ہیں جن کے پاس ٹائم غیبت ،کھانا ،ہلڑ بازی اور بدتمیزی ہے۔۔۔اتنے Exposure کے بعد میں کنوئیں کا مینڈک نہیں بننا چاہتی ۔''

''اگر تم جیسے روشن دماغ یہاں بیٹھے رہے تو وہاں کیسے ترقی ہوگی ارجمند ۔۔۔۔بیک ہوم لوگ کیسے بدلیں گے؟''میں خوامخواہ کہتا ہوں''

''مجھے معاف کریں ابو ،ہم اس دنیا مین سوشل ورک کے لیے نہیں آئے ۔۔۔ایک زندگی ہے اسے ہم انجوائے کو سکتے ہیں تو کیوں نہ کریں ۔جب ہم چیزیں Afford کرسکتے ہیں کیوں نہ خریدیں ۔جب ہم بہتر معیار زندگی اپنا سکتے ہیں تو کیوں نہ اپنائیں ابو۔۔۔۔زندگی صرف ایک بار ہے۔۔۔''

''ہاں بیٹی بابر بادشاہ بھی یہی کہتا تھا کہ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔۔۔ملسمان ہوکر اسے مابعد پر یقین نہیں تھا۔۔۔۔''میں یہ بات ارجمند کو دل میں کہتا ہوں ۔باآواز بلند کچھ بھی کہنے کی جرائت نہیں کرسکتا کیونکہ ایک بار جب اولاد اپنے پاؤں پر کھڑی ہوجاتی ہے تو ماں باپ ان بیساکھیوں کا سہارا نہیں لے سکتے۔

میں خاموش ہوجاتا ہوں ۔دنیاوی ترقی کی یہ Epicurian فلاسفی مجھے آگے بولنےنہین دیتی ۔یہ انداز فکر روزازل سے چلتا چلاتا یہاں تک پہنچا ہے ۔اماں حوّا نے بھی ممنوعہ کاذائقہ چکھنے کی ترغیب دی تھی تو مقصد صرف فیصلے کی آزادی اورذاتی خوشی کا حصول تھا۔

میں ارجمند کے ساتھ بحث نہیں کرنا چاہتا۔۔۔۔وہ تیز چلتی ہے ۔اس کی بات میں قطعیت ہوتی ہے ۔وہ اس قدر خوداعتاد ہے کہ اردگرد کیا کچھ ٹوٹ جاتا ہے اس کی ارجمند کو پرواہ نہیں ۔جس طرح وہ اپنے یہودی ڈاکٹر سے ڈرتہ ہے ،ایسے ہی میں بھی اس کے اندر کی کرختگی سے خوفزدہ ہوجاتا ہے ۔۔۔۔میں موضوع بدل کر کہتا ہوں۔

''اس بار ویک اینڈ پر کیا پروگرام ہے؟''

''اس بار ہم واشنگٹن ڈی سی جائیں گے ۔وہاں ٹریڈ منسٹر نثار صاحب سے ملیں گے۔''

''نثار کون سا نثار۔۔۔۔'' میرے اندر خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔

نہ جانے یہ نام میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتا۔

چالیس سال سے یہ ٹینس پلیئر گریگوری پک جیسا حسین، بڑا اونچا بیور کریٹ میرے ساتھ ساتھ ہے۔ میں نے اسے دیکھا نہیں، لیکن میرے اندر اس کی شبیہ بنتی اور ٹوٹتی رہتی ہے۔ میں نحوست کے تعویذ کو گلے سے اتار کر پھینک نہیں سکتا۔

''نثار صاحب کی بیوی کا کیا نام ہے؟''

''اقبال نام ہے لیکن انکل کچھ اور بلاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ اقبال نام عورتوں پر سجتا نہیں۔۔۔۔۔ اقبال مردوں کا نام ہے۔''

''کیا بلاتے ہیں انکل نثار۔۔۔۔ اقبال کو؟''

'جاناں۔۔۔۔'' ارجمند ہنستی ہے

شاید وہ سمجھتی ہے میری عمر کے آدمی کو یہ لفظ استعمال کرنا تو دور سننا بھی نہیں چاہیے۔

پتہ نہیں کیوں مجھے غصہ سا آ گیا۔ بھلا ٹریڈ منسٹر نثار اقبال کو جاناں کہنے والا کون ہوتا ہے؟۔۔۔۔

بڑی پرانی یادیں تیز آندھی بن کر مجھے اڑائے پھرتی ہیں اور میری یاداشت میں گھلیے پڑنے لگتے ہیں کبھی لگتا ہے ماضی آج زندہ ہے۔ کبھی محسوس ہوتا تھا کہ کبھی کچھ تھا ہی نہیں۔ بس ایک خواہش کی خوشبو تھی جس نے ساری یادوں کو مہکا رکھا ہے۔۔۔ اتنے سارے غصے کی وجہ سے مجھے پتہ نہیں چلتا ارجمند کیا کہتی رہی اور کس وقت اٹھ کر چلی گئی۔

بوڑھے آدمی کے پاس ویسے بھی کون بیٹھنا چاہتا ہے؟ اور پھر بوڑھے آدمی کے پاس سوچوں کے علاوہ ہوتا بھی کیا ہے؟

امریکہ آنے سے پہلے مجھے اپنی یاداشت کے متعلق کچھ ایسے شبہات نہ تھے ۔آئینے میں صورت دیکھنے کے باوجود سارے بال سفید ہوجانے کے باوصف مجھے شبہ نہ تھا کہ میں بوڑھا ہوچکاہاں۔ مجھے کتابی علم تھا کہ ارجمند چالیس کی ہوچکی ہے۔اخبار میں کبھی کبھی کسی پرانے ساتھی سے چھٹم چھٹا ہوجاتا۔مسجد سے بھی ایسے ناموں کی موت کا اعلان ہوتا رہتا جن سے واقفیت تھی اور جن کی نماز جنازہ پڑھنے کے لیے مولوی صاحب بلا رہے تھے ۔چلتے چلتے لوگ بچھڑتے جارہے تھے۔اب زیادہ تر ہسپتال،عیادت اورمرگ کی رسومات میں جانے کا اتفاق ہوتا۔لیکن خود مجھے اپنے مرنے کا احساس تو درکنار بوڑھے ہونے کی بھی اطلاع نہ ہوئی۔میں ہمیشہ اندر کے موسم بہار کی رت کا اندازہ لگاتا آیا ہوں ۔۔۔اوراندکی رت نے مجھے زیادہ تر بہار کا ہی سندیسہ دیا۔

میری جیب میں امریکہ کا ٹکٹ تھا اور ہاتھوں میں وہ اخبار تھا جس میں خبر چھپی تھی کہ نثار کا انتقال ہوگیا۔ابھی اسی فیڈرل سیریٹری فنانس سے ریٹائر ہوئے دو چار مہینے ہی ہوئے تھے کہ اچانک وہ ہارٹ اٹیک سے چل بسا۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکیتا لیکن میرے دل نے یہ جاننے میں جلدی کی کہ ہونہ ہو یہ وہی نثار تھا جس سے اقبال کی شادی ہوئی ۔خبر پڑھ کر دل کو ایک گونہ اطمینان ہوا۔اقبال تو سرکاری افسر کے ساتھ گھونگھٹ نکال چلی گئی ۔میں ہال روڈ کی دوکان پر ریڈیو،ٹیپ ریکارڈ مرمت کرنے والی دوکان میں رگیدا گیا۔میری آمد نثار سے بہت زیادہ تھی،لیکن اس کا سٹیٹس مجھ سے کہیں بہتر تھا۔اب میری عمر میں سوچ کسی خاص سمت پر رک رک کر تصویر بدلتے رہنے کا عمل بوڑھے کے دماغ پروسس کو بیان کرسکتا ہے۔بوڑھا بندر کی طرح کبھی ایک شاخ پر کبھی دوری پر چھلانگ لگاتا ہے۔وہ عموماً اپنی یاداشت کے ہاتھوں گومگوں کے عالم مین رہتا ہےقوت فیصلہ کا یہ عالم رہتا ہے کہ میری طرح اسے کئی بار امریکہ کی

ٹکٹ بدلوانا پڑتی ہے۔ اس روز جب میں لاکروں کے سامنے کھڑا تھا میرا یک ہی سوچ تھی۔ انتقال کی خبر پڑھ کر میں سوچنے لگا کیا اقبال اسی خبر والے نثار یک بیوی تھی۔ وہ شخص جو ہارٹ اٹیک سے فوت ہوا جس کو میں تو اس اخبار کی سرخی کے ساتھ دفن کر چکا تھا۔ یہ نیا نثار ارجمند والا کون کون تھا؟ کیا وہ ہماری اقبال کا شوہر بھی تھا۔ ارجمند نے ٹریڈ منسٹر کا شوشہ چھوڑ کر مجھے ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر تذبذب میں ڈال دیا۔

کیا قابل کا شوہر ٹریڈ منسٹر کے روپ میں زندہ ہے؟

کیا اقبال اس نثار کی بیوی تھی جس کی تصویر اخبار میں چھپی تھی اور جس اخبار کو لے کر میں امریکہ آنے سے پہلے بنک گیا تھا اور اس کی موت پر خوش تھا۔ آج ان دونوں نثاروں نے مجھے ہلکان کر دیا۔ اس روز اخبار پڑھ کر میں مطمئن تھا کہ اقبال کا شوہر فوت ہو گیا۔ آج ارجمند نے اچانک ٹریڈ سنٹر کی Efigy پیش کر کے مجھے حیران کر دیا۔

میں نے مرحومہ اصغری کے زیورات کے ساتھ کچھ ڈالر بھی ایک منی ایکسچینجر سے لے کر چھپائے ہوئے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد نہ تھا کہ کل کتنے ڈالر لاکر میں ہیں۔ سارا زیور کتنی مالیت کا ہے......

اس بینک کے لاکر تہہ خانے میں تھے۔ تہہ خانے میں ان ڈور پلانٹر کے باوجود ٹھہری ٹھہری بوسیدہ سی ہوا تھی۔ ایک جانب پرانے ریکارڈوں کو تھیلوں بوریوں میں بند کر کے ڈھیر لگا رکھا تھا۔ لوہے کی ایک میز پر آٹو میٹک نیون کی بتی دھری تھی۔ جونہی بجلی جاتی وہ جل اٹھتی...... میں سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچا تو لاکرز اور پریٹ کرنے والی نوجوان خاتون کمپیوٹر میں مگن تھی......کمپیوٹر میرے علم کی حدود سے باہر ہے۔ یہ وہ انفر میشن اگلونے والا آلہ ہے۔ جس نے ہماری پود اور نئی صدیون کا فاصلہ پیدا کر دیا

اور اس کی انفرمیشن نے جگہ جگہ مغائرت اور غلط فہمیوں کو جنم دیا ہے۔

''سلام علیکم'' میں نے لجاجت سے کہا...... بوڑھے آدمی میں یہ احساس قابل ترس ہے کہ وہ Welcome نہیں۔ وہ نرمی' وہ اچھے آداب اور باسی مسکراہٹ کے ہتھیاروں کی مدد سے تازگی پروار کرتا ہے۔ مس سر کے اشرے سے جواب دے کر کمپیوٹر کے بٹن دباتی رہتی ہے۔

''مس مجھے اپنا لاکر اوپریٹ کرنا تھا'' میں خوشامد سے کہا

مس ہرگز مس نہ تھی۔ وہ بھرے جسم کی عورت تھی۔ جس کے کندھے' گردن اور سینہ صحت اور اعتماد کی نشان دہی کر رہے تھے۔ اس نے دراز سے ماسٹر چابیوں کا گچھا نکالا۔ رجسٹر میں تاریخ اور وقت کا خانہ پر کر کے سائن کرنے کے لیے رجسٹر میری جانب بڑھا دیا...... میں نے جلدی سے دستخط کیے۔ وہ ترنت پھرنت لکڑی کی ہیلوں والی جوتی ٹکٹکاتی لاکروں تک جا پہنچی۔

دستخط کرنے کے بعد میں نے دماغ پر زور دیا لیکن مجھے اپنے لاکر کا نمبر بھول چکا تھا' اس سے پہلے بھی بھول چوک کا تھوڑا بہت سلسلہ جاری رہا تھا۔ لیکن یوں میری خجالت کا باعث نہ ہوا تھا۔ مجھے پہلی بار خیال آیا کہ شاید میں بوڑھا ہو چکا ہوں یا ہو رہا ہوں یا ہو سکتا ہوں۔ میں شرمندہ شرمندہ اس کے پیچھے گیا۔

''سنیے مس......''

پلی پلائی عورت مس کا لفظ سن کر مسکرا کے پلٹی۔

''جی انکل......؟''

انکل کا لفظ چھوٹے بچے میرے لیے استعمال کرتے رہتے تھے۔ لیکن یہ پہلی بار تھی کہ اتنی بڑی عمر کی خاتون نے انکل کہہ کر مجھے بوڑھا ثابت کیا۔

''میں اپنے لاکر کا نمبر بھول گیا ہوں''

''اچھا تو آپ اپنی چابی تو ساتھ لائے ہیں ناں'' مس نے پوچھا......

''جی جی...... چابی تو میری کاروائی چابی کے چھلے میں ہے......'' میں نے چھلے کو جیب سے نکالتے ہوئے کہا

''آپ لاکر پہنچان تو لیں گے نان......؟'' وہ مسکرائی۔

''ہاں......شاید پہنچان لوں گا......'' مجھے یقین نہ تھا۔

اب میرے اندر ایک خاص قسم کی سٹپٹاہٹ شروع ہوگئی تھی جیسے ریس سے پہلے کھلاڑیوں کے اندر پیدا ہو جاتی ہے......سامنے لاکرز کی الماریاں بالکل چپ کھڑی میرے حافظے کے لوٹ آنے کا انتظار کر رہی تھیں۔

''کوئی بات نہیں انکل۔آپ کی اتج میں کئی لوگ لاکرز کے نمبر بھول جاتے ہیں۔میں نے دماغ پر بہت زور دے کر تین سو پچھتر نمبر کے لاکر کو ہاتھ لگایا......مس نے اپنی ماسٹر چابی گھمائی۔پھر میں نے اپنی چابی اس میں فٹ کی۔گھمایا لیکن لاکر نہ کھلا۔میرے پاؤں میں ہلکا ہلکا پسینہ آ گیا......اور یکدم چکر سا محسوس ہوا۔

''شاید 377 نمبر ہو...... مجھے یاد پڑتا ہے......''

''ضرور ضرور ٹرائی کر لیتے ہیں''

اس بار ہم دونوں کی چابیاں لگنے سے لاکر کھل گیا......

''دیکھیے انکل آپ اپنی چابی کے ساتھ اور اس لاکر پر کوئی سٹکر لگا لیں۔نشانی رہے گی۔پتہ ہے انکل یہ آپ دیکھیے ناں کتنے لوگوں نے سٹکرز لگا رکھے ہیں۔

کچھ لوگ تو وطن سے باہر ہیں۔ان کے لاکرز تو برسوں سے Operate ہی نہیں ہوئے انکل...... پتہ نہیں واپسی پر ان لاکروں کو کیسے پہچانیں گے''

مس مجھے تھوڑی سی ڈانٹ اور ہلکی سی تسلی دے کر چلی گئی......

یادداشت کی سلیٹ یوں صاف ہو جانے کا یہ پہلا دھچکا لگا۔

میں نے لاکر کھول کر اپنی جمع جتھا نکالی۔انعامی بانڈز گنے‘ قومی بچت میں لگائی

رقم کا پڑتا لگایا‘ ڈالروں والا لفافہ نکال کر ڈالر گنے ۔ کاغذات میں دفن دولت کا شمار کرنے ک بعد میری نظر پلاسٹک کے ایک لمبوترے نیلے ڈبے پر پڑی ۔اس کے ساتھ ایک چاکلیٹ کا ڈبہ بھی مومی لفافے میں لپٹا پڑا تھا ان دونوں کو میں نے کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ میں نے صرف پلاسٹک کا نیلا ڈبہ نکالا اور اپنی بہو کا زیور چاکلیٹی ڈبہ وہیں رہنے دیا۔ہم دونوں کا لاکر سانجھا تھا۔اس لیے نہیں کہ میری بہو مجھ پر اعتماد کرتی تھی‘ بلکہ اس لیے کہ اگر مجھے کوئی ہرج مرج ہو جائے تو وہ سانجھا لاکر ہونے کے باعث اس لاکر کو اوپریٹ کرسکیں۔ اپنے ارادے کو شفاف بنانے کے لیے اس نے مجھ پر اعتماد کرنے کو سستا سودا سمجھا......

میرے دل نے نیلا ڈبہ نکالتے وقت کہا......”جناب ہمایوں صاحب! اگر آپ امریکہ میں فوت ہو گئے یا واپسی پر آپ کا دماغ جیلی فش بن گیا تو اس نیلے ڈبے کا کیا بنے گا۔؟“

جیتے جی میں اصغری کا زیور کسی دینا نہیں چاہتا تھا۔ ۔کندن کے سیٹ‘ نورتنوں کے لمبے ہا‘ چوڑیاں کڑے‘ لمبے لمبے مگر......میں نے ارادہ کیا کہ یہ سب کچھ میں ارجمند کے لیے لے جاؤں گا......میں اسے ڈکلیئر کیے بغیر لیجانے کی کوشش کروں گا......اگر پکڑا گیا تو زیور بھی گیا اور نیک نامی بھی......

لیکن پھر یہ سوچ کر میں نے ارادہ پختہ کرلیا کہ یہ نیلا ڈبہ لاکر ہی میں رہ گیا تو میرے بعد کس کام آئے گا......میں اس کا کیا بنا لوں گا؟......اقبال تک تو پہنچنے سے رہا۔

ہر ملک میں اپنے ہی توہمات ہوتے ہیں اور تعلیم یافتہ ہو کر بھی سائنسی ترقی کے باوجود یہ پیچھا نہیں چھوڑتے ۔نیگرو لوگوں کا اعتقاد ہے کہ آنگن میں اگر سفید چوزا گھومتا پھرتا ہو تو بد روحیں وہاں نہیں آتیں ۔برصغیر میں کالی بلی اگر راستہ الانگ جائے تو کام

اڑچن پڑ جاتی ہے۔کوا منڈیر پر کائیں کائیں کرتے من چاہا مہمان آتا ہے۔بھونرا گھر کے اندر داخل ہوتو اچھی خبر ملتی ہے۔چلتے پھرتے میں چھپکلی چھت سے آپ کے بدن پر گر جائے تو ترقی ملتی ہے۔ایسی ہی اس روز بھونرا ارجمند کے گھر میں اڑتا پھرا تو مجھے لگا میں اقبال سے دور نہیں ہوں۔شاید میں اسے ٹریڈمنسٹر کے گھر میں مل سکوں۔

لیکن شہری زندگی بالکل مختلف ہے۔شہد کے چھتے کی طرح ہر لمحہ منظر بدلتا چلا جاتا ہے۔شہری ترقی کا ایک گن یہ بھی ہے کہ اس میں عام شہری دیرپا' بہت سوچ بچار کے بعد فیصلے نہیں کرتے۔عام طور پر امریکی لوگ ترقی کا سمبل ہیں۔'وقتی Impulse پر فیصلہ کرتے ہیں۔جذبات کے چڑھاؤ کے بعد اس کے اتار کے متعلق ان کو کوئی فکر نہیں ہوتا۔تھوڑی دیر کے لیے بہت Involve ہو سکتے ہیں۔جی چاہا چندہ دے دیا۔من میں خواہش اٹھی تو ماں سے ملنے چلے گئے۔باپ کے لیے تحفہ خرید لیا۔وہ وفا کا بیج سینے پر لگا کر ہمیشہ کا دردسر نہیں پال سکتے۔ماں باپ کی مستقل دردسر' بک بک' جھک جھک' صبح وشام کے اختلافات ان کے بس کی بات نہیں ہے۔بچے کو کئی سال کو لہے پر چڑھا کر پرورش کرنا ان کو پرملال کرتا ہے۔اپنی Impulsive نیکی کے ہاتھوں وہ بوڑھے گھر Shelters Day care Centres بنا سکتے ہیں۔ اپنے گھروں میں کسی شخص کی مستقل بک بک جھک جھک برداشت نہیں کر سکتے۔وہ جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں لیکن ہمیشہ کیلئے جذبات کے تابع نہیں رہ سکتے...... جہاں عمل تو اتر آیا یکسانیت پیدا ہوئی...... امریکی باشندہ بور ہو کر راستہ بدل جاتا ہے۔اسے یا تو بریک درکار ہوتی ہے یا علیحدگی!

دادا زمین سے وابستہ کسان تھا۔اسے دھرتی ماں سے بھی پیاری تھی۔وہ گاؤں چھوڑ کر آ تو گیا لیکن اپنی زمین کے بغیر زیادہ عرصے تک جی نہ سکا۔اندر ہی اندر اسے

گاؤں کے گھر، وٹ بنے، کنویں، شہتوت اور لوکاٹ کی جھنگی، پکی سڑک تک جانے والا کچا رستہ کھلے میدان، ہرے بھرے کھیت، گلی ڈنڈا کھیلتے بچے، یکے پر آتی جاتی سواریاں، لسی کے ڈول مکھن بھرے سلور کے کٹورے یاد آتے رہے...... دادا گلی میں چارپائی ڈال کر نہ جانے کس کس بات کو کن زاویوں سے یاد کرتا رہتا۔ اس گلی میں زیادہ تر سفید رو، کشمیری اور مغل پٹھان گھرانے آباد تھے۔ گلی میں آتے جاتے لوگ دادا کی عمر کا لحاظ تو کرتے اور سلام دعا کا سلسلہ بھی جاری رہتا...... لیکن ان کا بھی جی چاہتا کہ دادا اندر جا کر نہا لیں، خاص کر گرمیوں میں جب دادا پگڑی سے لے کر زری کی جوتی تک پسینے میں نہایا نظر آتا۔ لوگوں کی یہ خواہش شدید تر ہو جاتی۔ اس گلی کے سفید باسی دادا کے رنگ کے ساتھ سمجھوتہ نہ کر سکے۔

دادا سمجھ نہ سکتا کہ وہ ہندوؤں کو تو پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ یہ تعصّبات کی گٹھڑی کون ساتھ اٹھا کر لے آیا۔ چار ورن تو مسلمانوں میں بھی موجود تھے۔ تو پھر دھرتی کو چھوڑنے کا فائدہ کیا ہوا......؟ اپنے دل کا میل ہی نہ کٹا تو فائدہ؟

مہاراج ادھیراج شہنشاہ محمد جلال الدین اکبر نے بھی دین الٰہی بنا کر ایک کوشش کی تھی کہ تعصب چھوڑ کر دوسروں کو جینے کا برابر حق دیا جائے۔ ایسی ہی کوشش امریکہ بھی کرتا چلا جا رہا ہے۔ اقلیتیں چونکہ انکی معیشت کی ضرورت ہیں اور ان قلیتوں کے بغیر امریکہ کی خوش حالی آگے نہیں بڑھ سکتی، اس لیے وہ ہر ممکن طریق سے اکثریت کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اقلیت کو راضی رکھو۔ اس کم اجرتی محنتی طبقے کے بغیر ہم ساری دنیا پر راج نہیں کر سکتے۔ دین الٰہی کی طرح وہ ہیومن رائٹس کا چارٹر پیش کرتے ہیں لیکن امریکن اس Eyewash سے اپنے ملک کے Racists کو مطمئن نہیں کر سکے۔ وہ سمجھ نہیں پاتے کہ تعصب قلب کی بیماری ہے اور جب تک انسان خود اپنے مسلک کا شیدائی نہ ہو اور دوسروں کو بھی اپنی طرح مختلف راستے کا پکا راہرو نہ سمجھے بات نہیں بنتی، فقط لبرل ہونے سے کام نہیں بن سکتا۔ ہر لبرل آدمی پہلے

اپنا راستہ چھوڑتا ہے اور پھر کسی اور کے راستے کو درست سمجھتا ہے۔اس کے پاس نہ اپنی اقدار باقی رہتی ہیں' نہ کسی اور کی اقدار کی وہ عزت کر سکتا ہے۔ضرورت اس بات کی نہیں کہ انسان بے رنگ ہو بلکہ سمجھنا یہ پڑے گا کہ ہر رنگ کی اپنی شان ہے۔اپنا مسلک چھوڑو نہیں اور کسی کا مسلک چھیڑو نہیں' ٹھیک مقولہ ہے...... یہاں تک شاید اسی وقت پہنچا جا سکتا ہے جب لوگ آخری خطبہ سمجھ پائیں گے۔کسی کو حیلے بہانے بری نیت سے برابر نہیں کرنا...... اس کے اور اپنے باہمی فرق کے آگے صرف اس لیے سر جھکانا ہے کہ یہ نبی کا فرمان ہے۔ہماری گوری دادی نے کالے دادا کو کبھی برابر نہ سمجھا۔دادی گوری چٹی انگریزوں سی تھی۔میرا دادا کالا شاہ کالا تھا۔ جب پاکستان پہنچے تو ہماری عمریں تجزیے کی نہ تھیں۔ اہم واقعات پر ہم ہنس دیا کرتے تھے یا ان کا مذاق بنا کر ایک دوسرے کو چھیڑا کرتے تھے۔اس زمانے میں شادیاں طے کرتے وقت مردوں کی صرف کمائیاں دیکھی جاتی تھیں۔اس لیے دادا کو کسی نے جسمانی طور پر نہیں دیکھا پرکھا نہیں اور گاؤں کی سب سے خوبصورت لڑکی بیاہ دی۔نتیجے میں میرے دادا کی اواد ہوئی بر ڈھی۔ چاچا صمد گورے تھے۔میرا باپ اور دونوں پھوپھیاں سانولی مائل کالی تھیں اور ان کی شادیاں کرنے میں دادی کو کافی مشکلات پیش آئی تھیں۔لیکن یہ قیام پاکستان سے پہلے کے رگڑے جھگڑے تھے۔ہمیں تو دادا کیساتھ پاکستان میں رہنے کا تجربہ بھی کچھ خاص نہیں تھا۔ہم دادا کو دادی کی آنکھ سے دیکھتے تھے کیونکہ دادی ہماری آنکھ کا تارا تھی۔بوڑھی کبڑی' سفید بالوں والی میم سی دادی......

وہ عام طور پر دادا سے کہتی...... ''ہائے ہائے نہا لیں......''

داد محجوب سی نظروں سے دادی کو دیکھ کر جواب دیتا......'' بھلی لوک نہا کر ہی تو آ رہا ہوں......''

''منہ تو رگڑ کر دھو لیا کریں۔''

''وہ بھی رگڑا تھا۔ دانت بھی مانجھ لیے تھے''

''اچھا......'' دادی منہ پرے کر کے دادا کو نظر انداز کر دیتی۔

ہم پانچوں بہن بھائیوں میں سے شاہد بھائی اور فریدہ کا رنگ گندمی مائل سانولا تا۔ دادی گوری چٹی بہو لا کر بھی دادے کے تمام کالے جرثومے پوتے پوتیوں میں سے نکال نہ سکی تھی۔

ہم سب میں دادی کا لطیفہ زبان زد تھا۔ جب بھی موقعہ ملتا' رفعت آپا یا شاہد بھائی سے کہتی...... ''نہالینا تھا شاہد......''

''نہا کر تو آ رہا ہوں......''

''منہ تو رگڑ کر دھولیا کریں بادشاہو......''

ہم سب ہنسنے لگتے۔ ابھی ہمیں علم نہ تھا کہ دل جیسی نازک چیز کتنی معمولی باتوں سے دکھ جاتا ہے۔ ہم بہن بھائیوں کو ایک دوسرے کی محبت پر اتنا اعتماد تھا کہ ہمیں کبھی خیال ہی نہ آیا کہ شاہد بھائی واقعی سانولے ہیں۔

اقبال بھی شاہد بھائی کی طرف اسی لیے آمادہ نہ ہو سکی۔ شاید اس کا بھی جی اندر سے یہ چاہتا تھا کہ شاہد بھائی جلدی سے نہا کر آئی اور اتنے میلے میلے نہ لگیں۔

اس روز اماں مولی کے پراٹھے پکا رہی تھیں۔ ہم چاروں باورچی خانے میں نچلی تپائی کے گرد موڑھے لگائے بیٹھے ہوئے ہر پراٹھے کے پک جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ جب بھی پراٹھا توے سے اترتا ایک کہرام مچ جاتا۔ گرا پراٹھے کے ٹوٹے ٹوٹے ہو جاتے۔ اماں خوشی اور غصے کے ملے جلے جذبے کے ساتھ کہتی۔

''صبر کرو صبر کرو ہاتھ جل جائے گا...... اچھا چھری سے کاٹ کر بانٹ لو......''

لیکن نہ ہم لوگ صبر کر سکتے۔ نہ بانٹ کر اپنے حصے کا پراٹھا کھا سکتے تھے۔ غدر جاری تھا جب اقبال آ گئی۔ وہ ہمیشہ کی طرح ذو معنی مسکراہٹ کو چہرے پر سجائے ہوئے

تھی۔ گویا ہم پر ہنس رہی ہو یا شاید دل ہی دل میں گرویدگی کے ساتھ ہماری قدر شناس ہو۔ اسے دیکھتے ہی میں شاخ بریدہ درخست کی مانند ہر آرزو سے خالی ہو گیا۔ صرف وہی آئینہ دل میں منعکس رہ گئی۔

''آیئے آیئے مولیوں کے پراٹھے چل رہے ہیں دہی کے ساتھ......''

ڈگڈگی نما موڑھے سے میں اٹھ کھڑا ہوا

اقبال کی مسکراہٹ نہ پھیلی نہ سمٹی

''میں تو کھانا کھا کر آئی ہوں آپیا......جی''

''پھر کیا ہے......ادھر میرے ساتھ آ جاؤ''

وہ میری جگہ آپیا کے ساتھ بیٹھ گئی لیکن جگہ تنگ تھی۔ جب وہ میرے پاس سے گذری تو کچھ ڈگمگا سی گئی۔ میں نے اسے سہارا دے کر سنبھالا۔ یہ سہارا دینے کا عمل چند لمحوں کا تھا، لیکن ایوننگ ان پیرس میں مہکا ہوا' یہ ہوا کا بلا ساری عمر میرے ساتھ رہا۔

''نظر نہیں آتا جگہ تنگ ہے ابھی چولہے میں گرنے لگی تھی۔۔۔آپیا نے ڈانٹا

''اچھا ہوتا ناں......''

کیا اچھا ہوتا؟ چولہے میں گر کر جلا؟......''

اقبال نے میری طرف دیکھا......پھر نظریں اس پراٹھے پر جمائیں جو میں چھوڑ کر اٹھا تھا۔ اس نے آپیا کی بات کا جواب نہ دیا اور آرام سے میرے والے موڑھے پر بیٹھ گئی۔

میں نے صاف پلیٹ اسے دیتے ہوئے کہا......''یہ صاف پلیٹ لے لیجئے''

یہ بھی ٹھیک ہے''

اس نے بڑی رمز سے پراٹھا توڑا اور مزے لے لے کر بولی......''واہ جی واہ بڑا مزہ آیا......ایسے پراٹھے خانسامے تھوڑی پکا سکتے ہیں۔''

''تمہیں اچھے لگتے ہی مولی کے پراٹھے؟..............''

''کوئی خاص نہیں لیکن یہ اچھے ہیں۔'' اس نے ٹوٹے پھوٹے میں سے نوالہ توڑ کر کہا۔ میں آہستہ آہستہ ہاتھ دھوتا رہا۔ آپیا اور اقبال میری پشت پر قریباً تین فٹ کے فاصلے پر تھیں۔ ان کی کھی کھی کھا کھا والی بدتمیز ہنسی میرے اندر مالیحم کی طرح اتر رہی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں باورچی خانہ چھوڑ کر جاؤں۔ میں پھسل پا چل کر اقبال کے موڑھے سے ٹکرا کر گرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ جب دادا ابا آ گئے۔

''اوئے ہوئے ووہٹی پرونٹھوں کی خوشبو تو گلی تک جا رہی ہے واہ واہ...... واہ واہ......''

اماں نے گھی' پیڑا پڑاتا چھوڑ کر سر کی بکل درست کی......

'آئیں بسم اللہ...... پر آپ نہائے بغیر کھانا نہیں کھائیں گے''

''لے پھر میں نہا کر آیا...... اس پچھیر اپلٹن کو بھگ دینا میرے آنے تک......''

ظفر اور فریدہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کو کھانے سے فرصت نہ تھی ورنہ کوئی جملہ کس دیتے۔

اس واقعہ سے قریباً ہفتہ بھر بعد دادا ایک رات سوئے اور صبح نہ اٹھے۔ انہیں شاید کسی کی محبت پر اس قدر اعتماد ہی نہ تھا کہ وہ مرنے سے پہلے بیمار ہوتے' کسی سے سیوا خدمت کراتے' عمر بھر کے حساب چکاتے' وعدے وعید کرتے' وصیت نصیحت چلتی۔ بس گلی میں ان کی چار پائی بچھی تھی' رات کے پچھلے پہر ذرا سی خنکی ہو جاتی تھی۔ انہوں نے مرنے سے پہلے اپنا منہ سر سفید کھیس میں چھپا لیا اور خود ہی اپنا کفن اوڑھ کر سو گئے۔ شاید وہ نہانے چلے گئے تھے اور واپس آنا بھول گئے تھے۔

امریکہ میں بڑے شہروں کی زندگی شہد کے چھتے کی مانند گزرتی ہے۔ ہر وقت کی مصروفیت...... لیکن بڑے شہروں سے دور چھوٹے شہروں میں دیہاتوں میں ابھی ترقی

نے اپنے ناخن اس قدر نہیں گاڑے' وہاں محبت فرض اور شادی مقدس لفظ ہیں۔ امریکی دیہات دیکھ کر لگتا ہے کو گیا یہ سارے آدرشی لوگ ابھی اصحاب کہف کی اچھائی Addiction ہے اور یہ کسی ایسے خواب میں گھوم پھر رہے ہیں' جہاں سے ابھی ابھی حضرت عیسیٰ ہو گزرے ہیں اور خدا کی وحدانیت اور اچھائی اور نیکی کا حکم نافذ ہو چکا ہے۔

میں گزبو میں اکیلا بیٹھا سوچتا ہوں۔ پتہ نہیں ارجمند کون سے دن کون سے ویک اینڈ پر مجھے واشنگٹن لے جائے گی۔ برسوں بعد اقبال کو دیکھ کر کیسے محسوس کروں گا؟ میرے خیال می بڑھاپے میں مرد کے جسم سے نکل کر عورت اس کے دماغ میں گھس جاتی ہے۔ جوں جوں وہ بوڑھا ہوتا جاتا ہے' وہ عورت کے اس قدر قریب ہو جاتا ہے کہ خود عورت بن جاتا ہے۔ جسمانی تعلقات ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اغزل الغزلات اس کی زندگی کا بہترین مشغلہ قرار پاتا ہے۔ جمعدارنی سے جھگڑنا' ماسی' پھوپھی تائی سے مشورے کرنا' بیٹیوں کی یاد میں آنسو بہانا' قبروں پر جا کر رقیق ہو جانا' ٹیلی ویژن پر کسی خاتون کی نعت یا حمد پڑھتے دیکھ کر آبدیدہ ہونا قدم قدم پر وہ جنس لطیف کا زرخرید بنتا جاتا ہے۔ ہولے ہولے عورت اس کی سائیکی کا بڑا حصہ بن جاتی ہے۔ میں نے بھی اقبال کے بغیر ساری جوانی مزے میں گزار دی' لیکن اصغری کی وفات کے بعد یہ تعلق پھر ہرا ہو گیا اور سردیوں کا موسم گزرنے پر جس طرح جھونجھ انار کا بوٹا لہلہا اٹھتا ہے' ایسے ہی میرے تعلق کے انار میں بڑے خوبصورت شگوفے نکل آئے اور میں ان انار کی کلیوں کو کبھی سونگھتا' کبھی ان کے رنگ سے مسحور ہو جاتا۔

ارجمند دور سے رومال ہلاتی میری طرف بڑھ رہی تھی۔ میں اٹھ کر اس کی طرف چلنے لگا اور ہم دونوں سڑک کنارے جا ملے۔

''ابو جی آپ پلیز گھر آ جائیں......''

''کیوں؟؟......''

''بات یہ ہے کہ ہم دونوں تین دن کے لیے جاپان جا رہے ہیں۔ بلال کی وہاں کوئی کانفرنس ہے، مجھے بریک مل جائے گی......''

اور بچے......جمشید اور قیصر......''

''وہ آپ کے پاس ہیں۔ رات کو یا آپ ان کے کمرے میں سو جائیے گا یا وہ آپ کے کمرے میں گدے بچھالیں گے۔۔۔۔''

میں نے کبھی اپنے بچوں کی Baby sitting نہ کی تھی۔ مجھے یہ حکم نامہ کچھ عجیب سا لگا...... مجھے اصغری یاد آگئی اس نے کبھی کسی بچے کو میری گود میں نہ دیا۔

''اچھا......''

''آپ گھبرائیں ناں۔ بچے بہت Behaved ہیں۔ وہ آپ کی ساری باتیں مانیں گے۔''

ہم دونوں گھر کی طرف چلنے لگے۔ میں نے ارجمند سے پوچھنا چاہا کہ ہم تو ویک اینڈ پر واشنگٹن ڈی سی جانے والے تھے۔ وہاں ہمیں ایمبسی میں ٹریڈ منسٹر نثار سے ملنا تھا......اور اتنے برسوں بعد اتنے جگ بیت جانے کے بعد اقبال کو دیکھنا تھا لیکن......

بچے ہمارے آگے آگے ٹپوسیاں مارتے چل رہے تھے اور ہم دونوں ان سے پیچھے اپنی اپنی دنیا میں گم تھے۔ سارا علاقہ صاف شفاف' دھلا دھلایا۔ اجلا اجلا صبح کی شیر گرم دھوپ میں نگینے کی طرح چمک رہا تھا۔ مین سڑک کے پار سو پر مارکیٹ کی عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔

''ابو جی آپ کو ذرا فون کا خیال رکھنا پڑے گا۔۔۔''

''وہ تو میں عادتاً رکھ لوں گا''

''بات یہ ہے کہ میں نے آنٹی اقبال کو فون کیا تھا کہ میں جاپان جا رہی ہوں لیکن وہ گھر پہ نہیں تھیں، میں نے آنسرنگ مشین پر پیغام تو چھوڑا ہے لیکن کئی بار لوگ راتے

کو اتنے تھکے ہوتے ہیں کہ پیغام بھی نہیں سنتے ۔ انکل نثار تو Call back کے معاملے میں ذرا سست واقع ہوئے ہیں ۔لیکن آنٹی ضرور فون کریں گی ۔۔۔‘‘

ایک امید کی کرن ۔۔۔قوس قزح کا منظر وہی آواز وہی مٹھاس ۔۔۔امرت رس کانوں میں گھلے گا ۔اقبال کا فون!

’’لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ لوگ آ نہ جائیں ۔پھر آپ کو مشکل ہو گی‘‘

’’نہیں نہیں کوئی مشکل نہی ہو گی ۔۔۔۔۔میں کاف چائے بنانا جانتا ہوں‘‘

’’ٹی بیگز ختم ہو گئے ہیں ۔وہ وال مارٹ سے لانا پڑیں گے ۔۔۔‘‘ ارجمند کسی ماڈل کی طرح کمر کو لہے لچکاتی ہوئی cat walk چل رہی تھی ۔ اس کی چال دیکھ کر مجھے تھوڑی سی حیرانی ہوئی کیونکہ وطن میں تو گھیر دار شلواروں میں اس کے انداز یہ نہیں تھے ۔وہ اپنا پرس کھولے کچھ دیکھنے لگی ۔

’’میں آنٹی اقبال کی تصویر تلاش کر رہی تھی ۔۔۔۔پتہ نہیں کہاں ہے ۔۔۔۔کہاں ہے ۔۔۔۔کہاں ہے‘‘ وہ sing song آواز بدلتی چلی گئی ۔اگر وہ آ گئی تو آپ انہیں پہچان سکیں ۔’’تم فکر نہ کرو ۔۔۔میں اسے پہچان لوں گا ۔۔۔‘‘

’’بس ذرا وہ اپنے آپ کو انٹرویوں کرانے میں embarrased نہ ہوں ۔۔۔‘‘

وہ جلدی جلدی پرس کے مختلف خانے دیکھ رہی تھی ۔

’’چلیے ۔۔۔اب آپ انہیں اچھی طرح سے Receive کر لیجئے گا ۔۔۔تصویر تو ملی نہیں ۔جب مین یہاں نئی نئی آئی تھی تو آنٹی اقبال نے میرا بہت خیال رکھا تھا ۔میں لاہور کو یاد کر کے رویا کرتی تھی امی کی طرح مجھے دلاسے دیا کرتی تھیں کہ بیٹی شروع میں سب کا یہی حال ہوتا ہے ۔ہولے ہولے دل لگ جاتا ہے ۔۔۔۔‘‘

دل کا اصلی من بھاتا کھاجا وہم و گمان ہی تو ہے۔ارجمند کی بات سن کر مجھے کئی خیال آئے۔۔۔شاید اقبال کو علم ہو کہ ارجمند میری بیٹی ہے۔۔۔۔۔۔لوگ کہتے ہیں ارجمند کی شکل و صورت مجھ پر پڑی ہے۔عورتوں کو ویسے بھی رشتوں کی پہچان میں دیر نہیں لگتی، وہ کڑی ملا کر لکڑ دادے تک آسانی سے پہنچ جاتی تھیں۔ٹرین کے چند گھنٹوں کا سفر عمر بھر کے بہانے پر منتج ہو سکتا ہے۔ہسپتال میں دو ایک مرتبہ مریض کی عیادت کے بعد عورتیں سہیلیاں بن جاتی ہیں۔مرد بیچارے رشتوں کے معاملوں میں کوڑھ دماغ ہوتے ہیں کبھی کبھی ساری عمر انہیں بھانجی اور بھتیجے میں فرق نظر نہیں آتا اور وہ ان دو لفظوں میں گھپلے ڈالتے رہتے ہیں۔

''آپ کیا سوچ رہے ہیں ابو۔۔۔اگر آپ پریشان ہیں تو میں جاپان نہیں جاتی۔''

''نہیں نہیں ٹھیک ہے تم فکر نہ کرو بالکل۔۔۔۔''

''ویسے میں انہیں پھر فون کروں گی۔واپسی پر خود واشنگٹن جا کر انہیں ملیں گے آپ کو آنٹی بہت اچھی لگیں گی ابو۔۔۔آپ کے زمانے کی ہیں ناں۔۔۔۔سارے دن Values پر بولتی رہتی ہیں How Cute انکل نثار البتہ بہت Sherwed ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ ہر عہد اپنی Value فکس کرتا ہے۔آنٹی کا منہ لال شقندر ہو جاتا ہے۔وہ ہر بار Temperloose کر کے کہتی ہیں۔۔۔۔نہیں نثار جو اقدار نبی بتا گئے وہ کبھی بدلتیں۔۔۔۔۔وہ for all times ہوتی ہیں۔۔۔۔''

''ہاں بیٹا۔۔۔۔۔کچھ ایسے ہی ہے۔۔۔۔۔'' ہماری جنریشن گھوڑی سی ہٹ دھرم کچھ کچھ پاگل ہے۔

''لیکن اگر انسان ایسی جکڑ بند Value سسٹم میں بندھ جائے تو پھر ترقی کیسے

کر سکتا ہے ابو۔۔۔کچھ رسم و رواج کچھ اقدار ضروری ہر عہد میں بدلتیں ہیں۔۔۔ہیں ناں؟"

"رسم رواج تک تو ٹھیک ہے ارجمند۔۔۔لیکن اصل Values۔۔۔کبھی نہیں بدلتیں۔۔۔مین اخلاق اقدار کی بات نہیں کر رہا۔میں ان بنیادی حقائق کا ذکر کر رہا ہوں جو تمام مذاہب میں ایک سی ہیں اور نبی ان کی شہادت دیتے ہیں"

"مثلاً۔۔۔"

"مثلاً جھوٹ۔۔۔ماں باپ کی عزت۔۔مثلاً سارے معاملات میں کھرا پن۔۔"

اس نے کچھ ایسے سر ہلایا جیسے مین کوئی فرسودہ بات کر رہا ہوں۔میری بات اتنی پٹی ہوئی کلیشے زدہ تھی کہ اس نے مجھ سے آگے چلنا شروع کر دیا اور گفتگو منقطع کر دی۔

میں نے دل میں سوچا کہ واقعی اگر انسان اقدار سے نتھے ہو جائے تو ترقی کا بت گھر سے باہت پھینکنا پڑتا ہے۔

میں نے ارجمند کو بتانا چاہا۔۔۔بہر کچھ اپنے متعلق۔۔۔اقبال کے بارے میں اس مبہم تعلق کی باتیں جس کا کوئی ثبوت نہ تھا۔۔۔پھر سوچا کہ فقیر لوگ کہا کرتے ہیں جس درجے کی توفیق نہ ہو اس کا اعلان نہیں کرنا چاہیئے۔۔۔میں کسی قسم کی محبت کا اعلان کیونکر کر سکتا تھا۔۔۔اسیا دھیڑ بن میں گھر پہنچا اور سوچتا چلا گیا کہ اقبال سے میرا کیا سمبندھ۔۔۔؟ بھلا اس تعلق کو انسان کس نام سے پکار سکتا ہے۔۔۔۔؟

ارجمند اور بلال کے جاپان رخصت ہو جانے کے بعد میں بچوں کے کمرت میں شفٹ ہو گیا۔فرمانبردار بچے سارا دن کی بھاگ دوڑ سے تھکے ہوئے تھے،تھک کر جلد سو گئے۔میں نے نین کو بلانے کے بڑے جتن کئے۔آئیس کریم کھائی۔دودھ پیا۔۔کئی قسم کے لیمن ڈراپ چوسے۔اونگھ آجاتی تھی لیکن نین کوسوں دور تھی

۔بوڑھے لوگ عام طور پر آدھی رات کو جاگ جایا کرتے ہیں۔پھر ان کی موتیا سے بند ہوتے تو رنیا کو تو کچھ واضح نظر نہیں آتا لیکن اندکی آنکھ کھلی رہتی ہے۔۔۔۔

تعلق کیا چیز ہے؟

یہ بھی حسیات سے تعلق رکھنے ولی غیر مرئی خوبیوں میں سے ایک کیفیت ہے جسے محسوس تو کیا ج سکتا ہے۔لیکن سمجھانے پر آئیں تو سمجھا نہیں سکتے۔ماں کی محبت یا تعلق کو مامتا کہہ کر واضح نہیں کر سکتے ۔ڈکشنری میں یا لٹریچر سے اس کی وضاحتیں ملتی ہیں، مامتا نہیں ملتی ۔جہاد پر جان سے گزر جانے والے بہادر کا حصہ نہ بن جائیں ۔تعلق زندگی سے نبرد آزما ہونے کے لیے صبر کی مانند ایک ڈھال ہے۔جب کبھی جہاں بھی کسی سچا تعلق پیدا ہو جاتا ہے،وہاں قناعط ،راحت اور وسعت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔آپ کو اندیہی اندر یہ یقین محکم رہتا ہے کہ آپ کی آگ میں سلگنے والی کوئی دوسرا ابھی موجود ہے۔۔۔دوہرا وزن آدھارہ جاتا ہے۔

تب میں اتنا سوچنے والا نہ تھا۔ہال روڈ کی چھوٹی سی دوکان پر شاہد بھائی کے ساتھ کام کرنا پرائیویٹ بی اے کی تیاری میں مصروف رہنا اور اپیا کی عمر میں چھوٹی سہیلی اقبال کا بل وجہ انتظار کرتے چلے جانا میر مشاغل تھے۔اقبال کی سوچ ہمیشہ میرے ساتھ تارچ کی روشنی بجھ جاتی لیکن اندھی یاد کی بیٹری بھی ساتھ رہتی اس کی دید ہی سے میرے بیٹری چارج ہو جاتی تھی ۔میں خود اس تعلق کو کبھی سمجھ نہ پاتا ۔ایک روز میں آپیا کے کمرے میں گیا تو سامنے پلنگ پر اقبال بیٹھی کوٹکس لگا رہی تھی ۔تب ماڈرن لڑکی ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ وہ چوری چھپے کے بجائے اعلانیہ کیوٹکس لگانے لگی تھی۔

''آپیا کہاں ہیں؟۔۔۔۔''

''امی جی نے بلایا ہے کچن میں''

میں پلنگ کے کنارے وسوسوں کا شکار کسی نوبیاہتا کی طرح کبا سا ہو کر بیٹھ گیا۔

''کبھی آپ نے ایسا تعلق محسوس کیا ہے کہ۔۔۔کسی شخص کی غیر موجودگی میں زندگی خالی خولی ماچس کی ڈبیا بن جائے۔۔۔'' میں نے پوری توجہ کے ساتھ ٹھاہ کے انداز میں سوال کیا۔

اس کشمیرن نے نظریں اٹھائے بغیر جواب دیا۔''کیا آپ ایسے تعلق سے آگاہ ہیں؟''

میں حیران رہ گیا۔ایف اے کی طالب سے ایسا سوال حیران کن تھا؟۔

شاید اس نے اپنی سائیکلو جی کی کتاب سے کچھ اس نوعیت کا پڑھا ہوا۔میں تو خیر شاعری کرنے کے باوجود تعلق کی بولی کم کم سمجھتا تھا اور شاعری میری سوچ کا کچھ نہ بگاڑ سکی تھی۔بس بے وزن حادثاتی شعروں سے کاپیاں بھری رہی تھیں۔

''میں آپ کو ایک واقعہ سناؤں۔۔۔۔اگر آپ کے پاس وقت ہو تو۔۔۔۔''

میرے لیے یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔نوبیل پرائز سے بھی بڑا۔۔۔

''میں تب گیارہ برس کی تھی۔۔۔ہم اپنی خالہ کے پاس پہاڑوں پر گئے ہوئے تھے۔گرمیوں کا موسم تھا۔آپ کو معلوم ہے ناں کہ پہاڑوں پر گرمی میں جب پتھر تپ جاتے ہیں تو عجیب قسم کی گرمی لگتی ہے۔چبھنے والی سوئیاں جیسی۔آنکھیں چلچلاتی دوھپ میں چندھیانے لگتی ہیں۔میں اپنی کزن واجدہ کے ساتھ گھومنے پھرنے جاتی تو تیز دھوپ میں میری آنکھیں بند ہو جاتیں۔آپ سن رہے ہیں ناں''

''جی۔۔۔۔غور سے۔۔۔اقبال'' میں اپنے آپ کو بادلوں میں محسوس کر رہا تھا۔

''آپ کو شاید یاد ہو کہ۔۔۔اس زمانے میں جاپان سے ایسے کلینڈر آیا کرتے تھے۔۔۔جن پر گوری چٹی نازک سی جاپانی لڑکیاں نازک نازک نقش و نگار کی چھتریاں اٹھائے دکھائی جاتی تھیں۔۔۔۔۔''

''میرے پاس ابھی تک ایک ایسا ہی کلینڈر ہے۔۔۔۔شاید وہ لڑکی چینی ہے شاید جاپانی ہو۔۔۔کیلنڈر والی لڑکی'' میں نے ہنکارا ابھرا۔

''میرے پلنگ کے پاس والی دیوار پر ایک ایسا ہی کیلنڈر تھا جس میں چیری کے شگوفوں میں ایک جاپانی لڑکی چھتری لگائے مسکرا رہی تھی۔۔۔مجھے ایسی چھتری کی تلاش لگ گئی۔بڑی بے قراری کے ساتھ میں نے امی سے چھتری کی فرمائش کی تو وہ مجھے بازار لے گئیں۔لیکن بارش سے بچنے والی کالی چھتری تو ملیں۔'' بانس کی کھپچوں والا چھاتا نہ ملا۔۔وہ نظریں جھکا کر بولتی چلی گئی۔میں حیران اقبال کا چہرہ دیکھ رہا تھا اور وہ پوری توجہ کے ساتھ کیونکس لگاتی واقعہ میں گم بولے جا رہی تھی۔ابھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی فرینک نس بھی عام نہ ہوئی تھی۔

''آپ کو تو پتہ ھی ھو گا۔پہاڑوں پر ان دنوں ایسے چائنا مین آیا کرتے تھے جن کے پاس چینی دستکاری کا بکاؤ مال ہوتا تھا۔ایک روز ہم گھر پہنچے تو خالہ اور امی کے سامنے ایک چائنا مین جیسے جادو کی صندوقچی کھولے بیٹھا تھا۔اس کے پاس نازک کڑھائی کے بیڈ کور Dollies Duchess Set' گدیاں' رومال' سکارف نہ جانے کیا کچھ تھا۔ Pastel Shades میں کڑھائی کا کام پوری جادوگری تھا۔ شیڈو ورک' Lazy Daisy ٹانکے میں نازک نازک پھول شاخیں پتیاں۔۔۔خالہ اور امی تو دیکھنے دکھانے میں مصروف تھیں لیکن میری نظر اس چھتری پر جمی رہ رہ گئی جسے کھولنے پر بانس کے پتوں اور شاخوں کا ایک جال سا سارے چھاتے پر پھیل جاتا۔''

''تو۔۔۔آپ کو اپنی پسند کی چھتری مل گئی بالا آخر۔۔۔''میں نے اپنی پسند پر زور دیا۔

''جی بالکل بالکل۔۔۔اب اس دن کے بعد میں جہاں بھی جاتی 'یہ چھتری میرے ساتھ ہوتی۔ اس نے مجھے واجدہ سے 'واجدہ کی سہلیوں سے منفرد کر دیا تھا۔۔ایک روز پتہ ہے کیا ہوا۔۔۔''

''ہاں تو کیا ہوا۔۔۔؟''میرا تجسس بڑھا۔

''ہم دونوں یعنی میں اور واجدہ ترائی کی طرف جا رہی تھیں۔ ہمارے ساتھ اور بہت سی لڑکیاں تھیں'خالہ تھیں۔ہم سب پکنک منانے جا رہے تھے۔ہوا میں چیڑ کے درختوں کی خوشبو تھی۔پھر اوپر پہاڑ کی جانب سے ایک چائنا مین تیزی سے اترا اور سب کو چھوڑ کر میرے پاس آ گیا''

''آپ کے پاس۔۔۔وہ کیوں''میں کچھ مضطرب ہو گیا۔۔۔نہ جانے تعلق کی یہ کونسی گنجل تھی۔

میں نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں پوچھا۔ہاں Johny تمہیں کیا چاہیے۔۔''

وہ مسکرایا اور بولا۔۔۔''مجھے کچھ نہیں چاہیے۔۔۔میرا سارا سامان بک گیا ہے اور میں کل شنگھائی واپس جا رہا ہوں۔۔۔آپ کی والدہ کیسی ہیں؟''

اس چائنا مین نے انگریزی میں سوال کیا۔یکدم مجھے خیال آیا کہ وہ تو وہی چینی تھا جس نے امی کو بہت سی چیزیں بیچی تھیں۔میرے لئے چھاتا بھی لیا تھا۔

''لیکن آپ نے مجھے کیسے پہچانا۔۔۔۔''

''اس چھتری سے۔۔۔اور کیسے؟۔۔۔''

''اچھا اچھا۔لو مجھے خیال ہی نہ آیا'' حالانکہ مجھے بہت پہلے اس بات کا خیال آ چکا تھا کہ یقیناً اس جونی نے چھتری ہی کی وجہ سے اقبال کو پہچانا ہو گا۔

''پتہ ہے پھر کیا ہوا؟''

''جی بتائیے؟۔۔۔۔۔''

اس چائنامین نے جیب سے رومال نکالا۔ ہلکے بادامی رنگ کا نازک سا رومال۔ اس پر Draw String کی کشیدہ کاری تھی۔ پھر دعا مانگنے کے انداز میں ہاتھ اٹھائے اور بولا۔۔۔ یہ میں آپ کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ یہ اعتراف ہے کہ آپ نے جس طرح میری ماں کی بنائی ہوئی چھتری کو پسند کیا۔اس کے لئے میں بھی ہمیشہ شکر گزار ہوں۔ یہ تعریف ہمیشہ میرے ساتھ رہے۔۔۔آپ جانتے ہیں۔ وہ رومال ابھی بھی میرے پاس ہے۔۔۔ میں جانتی ہوں بے نام تعلق کیا ہوتا ہے۔۔۔''

میں سمجھا نہیں اقبال۔۔۔''

''تعلق چھتری ہوتی ہے۔۔۔ زندگی کی کڑی''

بانس کے دھوپ میں اس کے پیچھے جائیے۔اداسی ہو تو اسے کھول کر سجا لیجئیے۔ ہر طرف بانس کے درختوں کا احساس ہوگا۔ پہاڑوں کے کمرے میں ڈرانے والا بندر آجائے تو اس چھتری سے بھگا دیجیے کبھی آپ نے غیر ضروری بندر کو کمرے سے بھگایا ہے۔۔۔ پہاڑوں پر تو ہم عام طور پر اسی چھتری سے بندروں کو بھگایا کرتے تھے۔۔۔ کسی ایک سے تعلق پیدا ہو جائے تو وافر شرارتی بندروں کو بھگانا بھی تو پڑتا ہے ناں۔۔۔'' یہ بات بھی مجھ کو دن شاعر کے لیے نئی تھی۔

اقبال بڑی شاعرانہ سی گفتگو کر رہی تھی اور میری جانب ہولے ہولے بڑھتی آرہی تھی لیکن اس وقت آپا آگئیں۔۔۔۔۔''لو بھئی تمہارے لیے ومنٹو بھیجی ہے اماں نے۔۔۔ میں کچھ میں گئی تو کہنے لگیں ذرا یہ شامی کباب تو بنا دو میں تھک گئی ہوں۔۔۔ سارے میں پھیلی ایوننگ ان پیرس کی خوشبو ماند پڑ گئی اور ومٹو کی مہک سے کمرہ بھر گیا۔

چائنامین کی مہربانی سے ہم دونوں تعلق کے امداد میں تو داخل ہو گئے تھے لیکن اس

کے مرکز تک پہنچ نہ پائے۔اقبال اور آپیا عورتوں کا خاص صفحہ بن گئیں اور میں وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

وزیرو بلب کی روشنی میں جمشید اور قیصر کو نیند کی آغوش میں بے سدھ سوتا چھوڑ کر میں تعلق کے سفید گھوڑے کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگا۔خیال کے Lasso سے تعلق کا براق پکڑنا مشکل تھا لیکن میں پھر بھی بھاگتا چلا گیا۔

جس طرح اللہ کی بنیادی ننانوے صفات کو جان کر بھی اللہ کا ادراک ناممکن ہے کلی طور پر اس ذات باری تعالٰی کی ہمیں سمجھ آجائے یہ خیال خام ہے۔ایسے ہی اقبال سے تعلق کو میں سمجھ نہ پایا تھا۔وہاں سب کچھ تھا اور کچھ بھی Tangible نہ تھا

اقبال مکمل طور پر میری جنت بھی نہیں تھی۔یہاں بھی میرا تعلق ادھورا تھا۔اس نے میرے ساتھ کچھ share نہیں کیا۔میری کسی مصیبت مین وہ میرے ساتھ نہ تھی ۔خیال کی حد تک کبھی کبھی میں اس کے اردگرد کہانیاں بن لیتا ۔۔۔۔لیکن اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا ۔۔۔اور پھر بھی ۔۔۔۔اور اسی طرح ۔۔۔۔اور کیا کہیں کی حالت میں وہ میرے ساتھ رہی ۔محبت شفقت ہمدردی، عشق تر وتازہ ہوں تو غم نہیں رہتا۔لیکن کبھی کبھی اگر سارے رشتے ٹوٹ بھی جائیں ار آئینہ دل میں کوئی شبیہ باقی نہ رہے تو بھی ایسا اوقات غم کا پہاڑ اسی تعلق کے بل ڈوزرے سے ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ایسی کیفیت کو انسان نے آزادی کا نام دے رکھا ہے اور اس لیے کئی بار محبت کے بجائے آزادی کے پنکھ لگا کر اڑنے لگتا ہے۔لیکن بندے کی دوئی کو کیا کیجیے اس کی خوبی ہی اس کی خرابی اور اس کی خرابی ہی اس کی خوبی ہے۔اس کے قلب میں سدا بہار حق و باطل کی جنگ جاری رہتی ہے۔وہ من وتو کے جھگڑوں سے نکل نہیں سکتا۔بتوں کو توڑتا توڑتا نڈھال ہو جاتا ہے لیکن بتوں کی Logistics ختم نہیں ہوتی ۔۔۔اسیسے ہی آزادی اور محبت کے درمیان پنڈولم کی طرح پھرنا بھی اس کی

اپنی دوئی کا ہی فریب ہے۔۔۔۔۔

میں کبھی آزادی کی خود فریبی اور محبت کی پائیداری کا مزہ تو نہ چکھا تھا۔ مجھے یہ دونوں تلواریں ہی نہ ملی تھیں جن سے میں زندگی سے معرکہ آرا ہوتا۔۔۔۔ لیکن میں تعلق کی چھتری کو شاید کچھ کچھ جانتا تھا۔ کبھی میں اس پر بنے ہوئے بیل بوٹوں میں کھو جاتا اور کبھی اس کو تان کر مینہ کنی سے بچنے کی کوشش کرتا۔ تعلق کی عملی شکل اصغری تھی

تعلق کا عملی پہلو ذمہ داری ہے۔ جہاں بھی کوئی رشتہ ناطہ ہو وہاں ذمہ داری کا احساس از خود پیدا ہونے لگتا ہے۔ سالوں پر محیط رابطے عام خیر سگالی اور دکھ سکھ میں شریک ہونے کے عملی ثبوت ہوتے ہیں دامے درمے سخنے مشکل کی گھڑی میں کام آنے کی روایت تعلق کا عملی پہلو بن کر۔۔۔ اصغری میرے ساتھ رہی۔۔۔ ہم دونوں اصلی معنوں میں شریک حیات رہے۔ شادی بیاہ کی رسومات جم مرن کے حادثات ،گھریلو واقعات میں ہماری سانجھ رہی۔۔۔۔ ورق ورق ہم دونوں نے ایک دوسرے کو ذمے داری کی عینک سے پڑھا۔

لیکن میں اصغری کو اقبال والا صفحہ کبھی نہ دکھا سکا۔ اس کورے کاغذ پر کوئی تحریر نہ تھی ۔ نہ سنانے کو کچھ تھا نہ کسی قسم کے سوگ میں اصغری کو ڈبونے کی ضرورت تھی۔

اصغری اور اقبال کے تعلق کی دوئی کے متعلق سوچتا، محبت اور آزادی کے تضاد کو شتارتا ہوا ترقی اور فلاح کی دوئی میں ڈوب گیا۔ مجھے یہ دونوں بھی زوج صورت نظر آئے میں نے جانا کہ ترقی کرنے والوں کے لیے دوسروں سے تعلق اتنا ضروری نہیں ہوتا جس قدر Self Love اہم ہے۔ جب تک ترقی کا آرزومند اپنی ذات کو اپنی خواہش کو Priority نہ دے وہ آگے بڑھ نہیں سکتا۔۔۔۔ وہ کیسا لگتا ہے، کیا کھاتا ہے، کہاں رہتا ہے، اس کی ذات کی پرستش میں پورے کے پورے مارکیٹ سروس پر

لگے ہیں ۔بیوٹی پارلرورزشوں کے ٹھکانے ،جوگنگ ،پلاسٹک سرجری کی ہلاشیری پر مامور ہیں کپڑوں کی ساری نیشنل اور ملٹی نیشنل انڈسٹری ،جوتوں کا کاروبار ،بازار در بازاراس کی ذات کو چمکانے پر آمادہ رہتے ہیں ۔جب ذات مور پنکھ لگا کر نکلتی ہے تو معیار زندگی اونچا کرنے کا بھوت بھی Self Love پر سوار ہو جاتا ہے ،بہتر گھر ،بڑی کار گھر میں سجا فرنیچر ذات کی جیب میں استکبار کا گولڈن کارڈ ایسی گفتگو جو اپنی کوشش ،محنت اور دولت کو کامیابی کے بینک بیلنس کے طور پیش کرے ۔ایسے وقت میں جب ترقی کا بھوت نہ جینے دے نہ مرنے دے ۔ترقی اور فلاح میں جنگ بن کر دو تلواریں آپس میں ٹکراتی ہیں ،انسان ایک بار پنڈولم کی صورت کبھی ادھر کبھی اُدھر بھٹکنے لگتا ہے ۔

فلاح میں انسان تعلق تلاش کرتا ہے ۔

ترقی میں ذات پر بھروسہ کی ضرورت ہوتی ہے ۔تعلق راستے کا روڑہ بن سکتا ہے ۔

فلاح میں انا راستے کا بند پھاٹک ہے ۔

ترقی مین انا کی پھن اٹھائے بغیر کسی کوڈ سا نہیں جا سکتا ۔

فلاح مین اشیا کی تلاش تعلق کی موت ہے ۔

ترقی میں اشیا لاؤلشکر کی طرح کوئی دائیں سے حملہ آور ہوتی ہے کوئی بائیں سے اشیا کو میسرا اور میمنا کی طرح سجا کر انسان ترقی کے کارزار میں محفوظ محسوس کرتا ہے ۔

فلاح خواہش کی پنیری کو مجاہدے ،ریاضت صبر سے نکالتی ہے اور تعلق درخت کو تن آور کرتی ہے ۔

ترقی خواہشات کے بغیر ایک قدم نہیں چلتی ۔ان ہی خواہشوں کے پٹرول سے ترقی کی گاڑی چلتی ہے ۔۔۔۔

جمشید اور قیصر بے سدھ ایک دوسرے میں جکڑے سو رہے تھے اور مجھ پر سوچوں نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔

میں نے سوچا ڈراصل آج کا عہد نہ سپیس ایج ہے نہ میڈیا Oriented ہے۔۔۔۔یہ وہ عہد ہے جب آزادی اور تعلق کے درمیان فاصلے بڑھ رہے ہیں فلاح کا عہد رخصت ہو رہا ہے ترقی کا دور آگے بڑھ رہا ہے۔ترقی جس کا علم آزادی ہے اور فلاح جو تعلق کا پھریرا لے کر چلتی ہے۔میں اس ترقی کے جھنڈے کو غور سے دیکھتا ہوں۔اس پر صرف ایک تیر بنا ہو جو آگے جاتا ہے۔چیرتا چلا جاتا ہے اور پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا۔

امریکہ نے اور ان کے دیکھا دیکھی تمام ترقی پذیر ممالک نے آزادی کے حق میں ووٹ دے دیا ہے۔۔۔۔کرنے مرنے کی آزادی۔۔۔۔۔ہر قسم کے تعلق سے نکل جانے کا عہد اپنی ذات کو سربلند ثابت کرنے کا عزم۔

امریکہ چونکہ ذات پر انحصار اور اس سے پیدا کردہ ترقی کا داعی ہے۔اس لیے وہاں آزادی اولین peiority ہے۔آزادی کے کیک پر تعلق کی آئیسنگ بھی لگی ہو تو بہت خوب ورنہ پلین کیک ہی چلے گا۔عام طور پر آزادی کی قینچی سے تعلق کی وہ تمام رسیاں کٹ جاتی ہیں جن سے

انسان بندھا ہوتا ہے تعلق چلتے ہیں، لیکن تا دیر ان کو نبھانا اور کسی پر تکیہ کر کے زندگی بسر کرنا ناممکن نہیں۔جب اقتصادی ،جذباتی ،نفسیاتی، Dependency ختم ہو جاتی ہے تو تنہائی کا چیتا گھر کی کھڑکیوں سے جھانکنے لگتا ہے، تعلق وقتہ ہو کر تضیع اوقات میں بدل جاتے ہیں اور مصرف انسان کو اندر کی زندگی سیراب کرنے کے لیے نت نئے چشمے نکالنے پڑتے ہیں۔پھر امرد پرستی کا جنون چلتا ہے۔ہم جنسوں کی شادیاں بھی قانونی ٹھہرتی ہیں

لوگ Punk بنتے ہیں۔گروہی ناچ گانا ،انفرمیشن ٹیلی ویژن ،انٹرنیٹ دوسرے ممالک کے سفرمختلف ریاستوں میں مختلف قسم کی روزگار کی تلاش ،اضطرب در اضطرب کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں اور گہرے تعلق کا نعم البدل تلاش کرنے مین وقت بھٹکتا رہتا ہے۔ایسے میں فلاح کی دیوی تعلق کا سفید جھنڈا لپیٹ کر رخصت ہو جاتی ہے۔

جمہوریت پسند امریکی ،اینٹی کرائسٹ اور اینٹی محبت کا داعی اپنی مکمل آزادی کا خواہاں ماں باپ کو اولڈ ہومز کی نذر کرتا ہے کیونکہ بوڑھے ترقی کے راستے کی روکاوٹ ہیں۔بچوں کو ڈے کیئر سنٹر کے حوالے کر دیا جاتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی روحیں نہ وقت کی اہمیت جانتی ہیں اور نہ آزادی کے مفہوم سمجھتی ہیں۔عمر بھر کا ساتھی جس سے بیماری ،تنگ دستی ،موت اور زندگی کے سفر میں ساتھ نبھانے کا عہد کیا تھا۔اس جیون ساتھی کو طلاق کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔تا کہ ترقی کے راستے میں تعلق کے روڑے نہ اٹکیں۔تعلق کی سب توقعات سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔؛

امریکی شہری اپنی توقع کے ہار کو جلد گلے سے اتار پھینکتا ہے۔بچہ جلدی سمجھ جاتا ہے کہ ماں ایثار و قربانی دے کر اپنی شخصی آزادی تج کر اس کی پرورش نہیں کر سکتی ،وہ رونا شھوڑ کر ماں سے توقعات کو بھی بھولتا چلا جاتا ہے۔بوڑھے ماں باپ بھی توقع نہیں رکھتے کہ اولاد اپنی اندگیاں بگاڑ کر بوڑھے والدین کو راجہ پورن بھگت کی طرح بہنگی میں اٹھائے پھرئیں گے۔آزدی کے تصور سے ہمکنار ہو کر سفید فام لوگ سب سے پہلے توقعات کی سیڑھی پر اترنا چڑھنا بند کرتا ہیں ،جب تعلق کا گرم کنبل جسم سے اترتا ہے تو ٹھٹرتے آدمی کو خود ہی جوگرز پہن کر جوگنگ کر کے اپنے وجود کی حرارت کو برقرار رکھنے کا فن آجاتا ہے۔پھر آزاد بندہ خود ہی ناظر اور خود ہی منظر بن جاتا ہے۔غم بھی اس کی خود ساختہ قرنطیق سے نکلتے ہیں اور آنسو بھی اسے پنے ہی گیلے

رومال میں جذب کرنا ہوتے ہیں۔بالآخروہ اپنے وجود میں اس قدر تنہاوہ جاتا ہے کہ
اس کے ہر عمل کی ذمہ داری اس کے
اپنے کندھوں پر آپڑتی ہے وہ نہ کسی کو الزام دے سکتا ہے نہ کسی سے کسی قسم کی توقع
رکھ سکتا ہے۔اپنی تقدیر کا خالق اور اپنی Free Will کا آلہءکار عام طور پر ترقی کی
سنہری پوسٹیں حاصل کرنے میں عمر بتا دیتا ہے اور ایسے Absurd حالات میں جہاں
مسائل لانجیل ہوں ایسے اچانک فیصلہ کرتا ہے جس کا جواز بھی وہ خود اور زندگی کی
انہونی کے ساتھ واحد رابطہ بھی اسی کی اپنی ذات ہوتی ہے۔آزادی کے رسیا زندگی کے
چوراہے پر اپنی Free Will کے ہاتھوں Reflex Action کا شکار ہو جاتے
ہیں۔سزا و جزا کی ذمہ داری قبول کر لینے کے بعد آزادی منش کو آنسو پی جانے کے
علاوہ غم سے نپٹنے کا اور کوئی طریقہ بھی سوجھ نہیں سکتا۔تعلق کی بیساکھی پھینک دینے کے
بعد مجبوری پھر بھی رہتی ہے،لیکن کسی کا ہاتھ پکڑنے بجائے self کی لاٹھی کے
سہارے چلنا پڑتا ہے۔مشرق میں بھی کبھی مکمل آزادی کا راستہ چننے والے مل
جاتے ہیں،لیکن وہ ترقی کی خاطر ذات کی لاٹھی نہیں چنتے۔بلکہ مکمل آزدی حاصل کر
کے فلاح کے راستے پر نکل جاتے ہیں۔یہ ایک اور طرفہ تماشا ہے۔مشرق میں جب
کوئی صوفی،جوگی تعلقات کی دھجیاں جوڑ کر رلی بناتا ہے تو اس گدی پر بٹھانے کے
لیے اسے آواز دیتا ہے جو نظر نہیں آتا۔مکمل فراق کی زنجیر سے بندھ کر ہر تعلق ہر توقع
توڑ کت جوگی کی آزادی پابجولاں ہو جاتی ہے۔یہاں ایک اوت تضاد کا بکھیرا اٹھ
کھڑا ہوتا ہے۔اس میں اتنی قوت پیدا ہو جاتی ہے کہ لوگ جوق در جوق اس سے تعلق
پیدا کرنے کے لیے حاضری دیتے رہتے ہیں لیکن وہ تعلق کے پھندے میں بھی پھنستے
نہیں اور اپنی Free Will صرف اللہ کے امر کے سامنے بھینٹ شرھا دیتے ہیں
۔صوفی ہر لمحہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ وہ تعلق کے سمدر میں اپنی کشتی چھوڑ دے لیکن
قطرہ بھر بھی کشتی کے اندنہ آنے پائے۔اپنے غموں سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار

رہتا ہے۔اب اسے غم بھی قید نہیں کرسکتا۔وہ تعلق اور توقع سے فارغ ہو کر ایسی آزادی سے آشنا ہوتا ہے جو مکمل طور پر اپنی ذات کو راپن کرنے کا فن ہے، نہ آزادی کا شوق باقی رہتا ہے نہ تعلق کا۔

مہاتما بدھ مغربی آزادی اور مشرقی فلاح کی ایک بڑی مثال ہے۔جب یشو دھرا اور بچے کو چھوڑ کر سدھارا تو اس نے وہ تمام غم راجہ شدو دھن کے محل میں ہی چھوڑ دیئے۔جن سے عام آدمی رنج کی بھٹی میں سلگتا ہے۔یہاں سے مہاتما بدھ نے اپنے غموں کو خود ایجاد کیا۔ان غموں کو نروان کے راستے ختم کرنے کا ارادہ بھی اس کا اپنا تھا۔اس نے اپنی آزادی کو اس حد تک قبول رلیا تھا کہ اس نے نہ کسی انسان کو پکارا نہ کسی خدا کو۔وہ پہلا وجودی تھا۔اپنی Free Will پر وہ اس حد تک قابض ہو چکا تھا کہ اس نے تربیت کو بھی تعلیم میں ڈوب جانے کے بجائے تنہائی کا سبق دیا۔سدھارتھ کا فیصلہ تھا کہ اگر آپ مکمل طور پر آزاد ہیں تو پھر اپنے نروان کے لیے کوشش بھی نہ کیجیے۔دنیاوی ترقی مکمل فلاح کو ختم کر دے گی۔آزادی حاصل کرنے کے بعد اگر آپ خواہشات کے غلام دھر لیے گئے اور دائرے کا سفر شروع ہو گیا تو یہ تعلق خواہشات بھی سب سے بڑی غلامی ہو گی۔۔۔۔غلامی چاہے ترقی کی ہو یا فلاح کی غلام ہی رکھتی ہے۔مہاتما بدھ کا خیال تھا جب تک انسان ان دونوں سے آزاد نہیں ہوتا ،نرواں ممکن نہیں۔دونوں صورتوں میں دینی یا دنیاوی خواہش کا پٹہ اتارنا پڑے گا۔

آزاد ہونے کے باوجود خواہشات آپ کو بازار مصر میں گھسیٹتی پھریں گی۔۔۔۔اور بہت جلد آپ کو علم ہو جائے گا کہ ترقی کی بانسری کے پیچھے بھاگتے بھاگتے آپ کسی تپتے صحرا میں پہنچ گئے ہیں۔عین مین ایسے ہی تعلق کی اصل بھی کبھی پورے طور پر سمجھ نہیں آسکتی۔دنیا بھر کا ادب اس گنجھل کو مکمل طور پر سیدھی لکیر میں تبدیل نہیں کر پایا۔لگتا ہے تعلق ہے۔پر نہیں ہوتا۔ہوتا ہے تو وقتی معجزہ۔۔۔۔وارد ہوا

اور پھر غائب ۔سیماب پا،سراب صفت،پارے کی طرح اس کے ان گنت رنگ ہیں ۔خوبیاں اور خرابیاں ہر رابطے،رشتے تعلق میں یوں گھدھی ہوئی ہیں کہ ان کا چھان پھٹک کرنا مشکل ہے۔گہرے تعلق جیسے لیلیٰ مجنون،شیریں فرہاد،سسی پنوں ،مرزا صاحباں سوہنی ماہیوال صرف اس تعلق کی کہانیاں ہیں ،جوان عاشقوں کے مابین پیدا ہوا۔۔۔وہ تعلق جوان افراد کے گھر والوں ،دوستوں،شوہر بیوی کے درمیان تھا۔اس کا ذکر نہیں ملتا۔ہم ان کے تعلق کو بھی وقتی شدت کے اعتبار سے آنکتے ہیں ۔وقت کے لمبے دورانے پر اسے پھیلا کر دیکھنے سے قاصر ہیں اس لئے تعلق کی داستان بھی ادھوری ہے۔

ایک بات جوان عاشق زادوں کی مجھے سمجھ آئی کہ ان میں ایک دوسرے پر جذباتی Dependency کا یہ عالم تھا کہ محبوب کے بغیر زندگی صرف چھلکا تھی ۔خالی کھوکھا ،بلکہ بن آکسیجن کے مستعار سانس ۔صحرا میں تلاش ہو یا تنہا نہر کھودنے کی صعوبت ،کچے گھڑے کا سفر ہو یا اپنے ہی جس کے کباب بنا کر کھلانے کا عمل ۔یہ سارے تعلق اپنی جان سے گذر جانے والے تھے۔۔۔ایسے تعلق سے غالباً فلاح کی دیوی بھی خائف رہتی ہے۔

میں نے کبھی اقبال کے لیے اتنا بڑا جزبہ نہیں پالا۔۔۔۔یہ تو چولہے کی بجھی آگ کی طرح ۔۔۔ایسی ہوا کی منتظر رہتی جو راکھ اڑائے اور اندر کے دہکتے انگارے پھر سلگ اٹھیں۔

اقبال ٹھیک کہتی ہے تعلق تع چھتری ہے۔ہر جسمانی،ذہنی،جذباتی غم کے آگے شیشہ بن کر ڈھال کا کام دیتی ہے۔۔۔بے روزگاری،بیماری،غریبی تنہائی سارے غموں پر تعلق کا ہی پھاہا رکھا جاتا ہے۔۔۔دوستی رشتہ داری،بہن بھائی نانا دادا ۔۔۔۔غرضیکہ ہر دکھ کی گھڑی میں کندھے پر رکھا ہوا ہمدرد ہاتھ،آنکھ میں جھلملاتی

شفقت، ایک میٹھا بول، مسکراتا چہرہ بلڈٹرانسفیوشن، اسپر کی گولی بن سکتے ہیں۔اسی لیے محبت اندوہ ربا کہلاتی ہے۔۔۔۔انسان اسی لیے کبھی خدانہیں بن سکتا۔کہ اس کی ضرورت دوئی ہے حتیٰ کہ اگر اسے دورا نہ ملے تو وہ خدا کو اپنی دوئی کا حصہ بنالیتا ہے۔۔۔انسان کی تنہائی قیامت خیز ہے۔۔۔جونہی اس خلاء کو بھرنے والا کوئی آجاتا ہے انسان اپنی جنت میں پہنچ جاتا ہے اور اپنے آپ کو مکمل سمجھنے لگتا ہے۔ساتھ نہ ہو تو زندگی آزاد دوزخ ہے۔

میں آزادی اور تعلق کے درمیان ترقی اور فلاح کے مابین رسہ کشی میں مصروف اونگھ سا گیا۔پھر کسی نے ہلکے سے میری گال کو تھپتھپایا۔

''نانا۔۔۔۔مجھے شوشو آیا ہے۔۔۔۔''

میں گڑبڑا کر اٹھا۔

''ہاں ہاں تو کرلو۔۔۔۔''

''میں نے سوتے وقت دانت بھی برش نہیں کئے تھے۔''

''ہاں تو کرلو شاباش۔۔۔۔''

''آپ مجھے پیسٹ لگا دیں گے پلیز۔ماما ہمیں خود پیسٹ لگا کر دیتی ہیں۔۔۔۔۔''

میں جمشید کے ساتھ غسل خانے میں چلا گیا۔اس کا چہرہ مجھے رویا رویا سا لگتا تھا۔یہ ماما لوگ بھی کیا چیز ہوتی ہیں؟۔ان کے بغیر بابا لوگ کا جی کیوں نہیں لگتا۔۔۔۔یہ کیسا تعلق ہے؟ گھاس کی طرح عام۔۔۔۔اور ماونٹ ایورسٹ کی طرح اونچا۔۔۔۔اسے ماں کی طرف سے ممتا کا نام دیا جاسکتا ہے لیکن بچے کی جانب سے اسے کس نام سے پکاریں گے؟ اس مکمل انحصار کو کس نام سے پکاریں۔

غالباً فلاح کی دیوی نے کسی کو آج تک اس تعلق کا نام ایجاد نہیں کرنے دیا۔۔۔۔کیونکہ اسے خود ایسے ہی تعلق کی تلاش رہتی ہے۔جب وہ خدا کی بندے

سے محبت سے غافل اور خود اپنی ضرورت کے تحت بچے کی مانند خدا سے بندھی رہتی ہے۔فلاح کے اس تعلق کا ٹیکنیکل نام کیا ہے؟

ارجمند اور بلال کو جاپان گئے پورا ویک اینڈ گذر گیا، غالباً اقبال نے آنسر نگ مشین نہیں سنی تھی۔اس طرف سے نہ کوئی آیا نہ ہی کسی نے فون کیا۔پھر بھی میر کان فون کی گھنٹی پر لگے تھے۔رات کو جمشید اور قیصر دونوں میرے کمرے میں گدے لگا کر پڑے رہتے وہ ماں باپ کے بغیر بہت آزاد محسوس کر رہے تھے۔انہوں نے اپنی اپنی مرضی سے کئی بار آئیس کریم کھائی۔ڈنر کھانے کی بجائے فروٹ اور سیریل پر اکتفا کیا اور دبا کر جوس پیا۔میں انہیں دوپہر کے وقت مارکیٹ لے گیا جہاں انہوں نے ہر بار مرضی کے برگر اور چپس کھائے۔کھلونوں کی دوکان سے چھوٹے چھوٹے Batman سوپر مین قسم کے کھلونے خریدے۔قیصر چھوٹا تھا۔ابھی اسے کھلونوں میں تمیز کرنا نہیں آئی تھی۔اس نے ایک بار باربی ڈول خرید لی اسے علم نہ تھا کہ لڑکے گذیوں سے نہیں کھیلتے۔جمشید نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا قیصر یہ لڑکیوں کا کھلونا ہے یہ تو گڑیا ہے'You Stupid' روہانسا سا منہ بنا کر قیصر بولا۔۔۔''تو مجھے اچھی لگتی ہے نا۔۔۔کیوں نانا میں یہ Barbie لے سکتا ہوں۔۔۔اس کے لمبے بال مجھے بہت پیارے لگتے ہیں۔نرم نرم Shining۔''

''ضرور لے لو۔۔۔۔بڑوں کو بھی باربی اچھی لگتی ہے لیکن وہ منہ سے کہتے نہیں۔''

''تو کیا کرو گے اسے لے کر۔۔۔۔یہ پستول لے لو نانا اس میں پانی بھر کر شوٹ کرو تو پچکاری پڑتی ہے دوسرے کے منہ پر۔۔۔۔''

''نانا اس کے بال کتنے ملائم ہیں Just touch it میں اس کالے

Bear کے ساتھ سونا نہیں چہتا۔ میں اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا سو جاؤں گا۔۔۔"

جمشید ہنسنے لگا۔۔۔"ہاؤ فنی!۔۔۔۔"

"..........It not funny"

"............Its funny shit"

قیصر نے ایک مکا جمشید کو مارا جس کے نتیجے میں شاید لڑائی بڑھ جاتی اور میں اسے کنٹرول نہ کرسکتا لیکن اس وقت ایک پندہ سولہ برس کی تین سو ساٹھ پونڈ کے قریب وزن والی امریکن لڑکی ان دونوں کے درمیان سے گزری اور مسکرا کر قیصر کی گال تھپکی دی۔ اس موٹی باربی ڈول نے قیصر کا فتنہ سرد کردیا۔

رات کو قیصر اپنی باربی ڈول اور جمشید اپنی واٹر گن کو اپنے ساتھ تکیوں پر دھرے کہنیوں کے بل لیٹے تھے۔

"نانا لاہور کیسا ہے۔۔۔"

"لاہور؟"

"ہاں نانا لاہور۔۔۔آپ کا لاہور۔۔۔کیا ہے؟"

"تم لاہور آکر دیکھو تو پتہ چلے ناں۔۔۔لاہور کے تین حصے ہیں۔ ایک شہر نیا ہے جو نہر کے بائیں طرف آباد ہے گلبرگ، ڈیفنس، ماڈل ٹاؤن۔ یہاں پر امیر لوگوں کی بستیاں ہیں۔ پھر دائیں طرف وہ شہر آباد ہیں جہاں سکول کالج بازار اور سرکاری افسروں کی وزیروں کی اور متوسط لوگوں کی ملی جلی آبادیاں ہیں۔ مال روڈ ہے باغ جناح ہے اور پھر کچہری اور گورنمنٹ کالج سے آگے پرانا شہر ہے۔۔۔مغلیہ دور کی نشانیاں سکھوں کے عہد کی داستانیں یہاں ملتی ہیں تیسرے لاہور میں۔"

وہ دونوں حیران میری صورت دیکھنے لگے۔

"نانا ہم بالکل نہیں سمجھے۔۔۔"قیصر باربی کے سلکی پلاٹنم بالوں پر انگلیاں پھیر

رہا تھا۔

''اچھا میں تمہاری ماما سے کہوں گا اس بار بریک لے کر تمہیں پاکستان دکھا لائے۔میں تمہیں جہانگیر کا مقبرہ، شالامار باغ، بادشاہی مسجد دکھاؤں''

''ماما تو کہتی ہیں وہاں بہت گرمی پڑتی ہے۔۔۔۔''

''پڑتی ہے جیسی Texas میں Arkansas مین پڑتی ہے۔۔۔۔۔''

''اور مٹی بھی بہت ہوتی ہے۔ڈسٹ ہوا میں اڑتی رہتی ہے ہر وقت You cant breathe''

جمشید نے چھت کی طرف پانی کی پچکاری چلا کر کہا ''شٹ اپ''

''ہاں مٹی بھی ہوتی ہے۔۔۔۔کوڑا کرکٹ بھی ہوتا ہے جگہ جگہ مکھیاں بھی بھنبھناتی ہیں۔۔۔۔لیکن وہاں ایک اور چیز بھی ہوتی ہے بچوں۔۔۔۔بالکل نیچرل Organic''

''وہ کیا نانا Tell us۔۔۔۔۔۔''

''وہاں بھی اب وہ چیز کم ہوتی جا رہی ہے۔۔۔وہاں بھی لوگوں کے لیے کسی کو وقت دینا مشکل ہے۔۔۔۔وہاں بھی۔۔۔۔۔لیکن وہاں ابھی ایک دوسرے کے لیے وقت ہوتا ہے۔وقت جو سب سے بڑی Gift ہے۔''

میں چپ ہو گیا۔بھلا ان کو ایسی باتوں کی کیا سمجھ تھی۔انہیں تعلق کی کیسے سمجھ آ سکتی تھی۔انہیں میں کیسے بتا سکتا تھا کہ سانده سے ٹمپل روڈ۔۔۔اور ٹمپل روڈ سے ڈیفنس کی رومن Pillars والی کوٹھی تک میں کتنا کچھ گنوا دیا۔میں بھی ان کو اپنے پانچوں بہن بھائیوں کی صرف پرانی کہانیاں ہی سنا سکتا تھا آنول تو کبھی کی کٹ چکی تھی کتنے رشتے وقت نہ ملنے کے باعث فل سٹاپ میں بدل گئے۔اماں ابا تو خیر قبروں میں جا سوئے۔ہم پانچوں بھی اپنی اپنی راہوں پر اپنے اپنے بچوں میں گم اپنے اپنے ساتھی کی انگلی

پکڑے زندگی کی بڑی بھیڑ مین گم ہو گئے تھے ۔زندگی میں دولت کمانے اور صرف
کرنے کے ءعلاوہ ہمارا کوئی مصرف نہ رہا تھا۔پہلے اس کے لیے تگ و دو کرنا اس کو
خرچ کرنے یا جوڑے جانے میں مگن رہنا۔ہاں ایک عہد سے تعلق باقی تھا۔پھورا
جیسا کی طرح تعاقب کرنے والا لیکن اس اقبال جرم کا مین ساری عمر کوئی نام نہ رکھ
سکا۔جسے بچے ماں سے محبت کو کسی کاص نام سے نہیں پکارتے ۔مین نے کارڈلس فون
پاس رکھ لیا‘‘ بھئی سو جاؤ ماما نے کہا تھا۔دیر تک نہیں جاگنا۔

اقبال کے فون کا انتظار رہا۔لیکن مجھے انتظار کے سوائے کچھ نہ ملا۔بچے دیر بعد سو
گئے ان کے پاس اپنا اپنا سہارا ٹیڈی بیئر اور باربی ڈول کی صورت میں موجود تھا۔میں
فقط ایسے چونگے کے سہارے سونے کی کوشش کر رہا تھا جس سے سوکھے نلکے کی سائیں
سائیں کے علاوہ کوئی آواز نہ آتی تھی۔

اصغری کے مرنے کے بعد میرا گھر اسی ٹیلی فون کی طرح بھائیں بھائیں سائیں
سائیں کیا کرتا میرے دونوں بچے امریکہ جا چکے تھے۔وہ سمجھتے تھے کہ انسان اس دنیا
میں صرف دولت کمانے کے لیے آیا ہے،امریکہ کی بھیڑ میں گم ہوتے انہیں دیر نہ لگی
کیونکہ وہ فلاح کے گاہک نہ تھے دولت کے بغیر زندہ رہنے کو ننگ زندگی سمجھتے تھے
۔انہوں نے ترقی کی دیوی کے آگے سر جھکا دیا تھا۔

اب مجھے یاد پڑتا ہے کہ ارجمند اور جہانگیر جب امریکہ سدھارے تو اصغری ذہنی
طور پر غائب حاضر ہلول اور خوفزدہ رہنے لگی تھی ۔میں اس کے لیے ناکافی تھا۔پہلے
مجھے اپنی کم مائیگی کا کچھ ایسا گہرا احساس نہیں تھا لیکن ارجمند اور جہانگیر کے بردگھر
بالکل سونا ہو گیا اور میں کافی نہ رہا۔۔جب تک جہانگیر امریکہ نہ گیا ہم دونون اسے
ملنے جاتے رہے ۔شادی کے بعد جہانگیر کے ساتھ احتیاط کا رشتہ تھا۔چھلک جانے کا

ٹوٹ جانے کا رشتہ تھا۔شاہدہ کے والدین نمائشی زیبائشی آرائشی قسم کے امیر لوگ تھے
میں بھی سانندہ کلاں سے کھسکتا کھسکتا ڈیفنس تک آ پہنچا تھا لیکن مجھ میں ابھی کو خوبو کے
اعتبار سے گفتگو کے لحاظ سے معیار زندگی کے حساب سے اصغری کی وجہ سے ایک آنچ
کی کس رہ گئی تھی۔میری سوچ غریبانہ انداز زیست فقیرانہ اور جملہ حالات عاجزانہ
تھے۔اصغری چونکہ میری دادی کی پسند تھی۔اس لیے وہ بھی فقط رنگ و روغن تک ہی
پرکھ پائی۔رنگ محل کی خوبصورت اصغری میں بیگماتی انداز کی کمی تھی اس کے ساتھ رہنا
آسان لیکن محفل میں اسے پیش کرنا مشکل تھا۔جہانگیر اور شاہدہ کچھ دیر ہمارے ساتھ
رہے لیکن پہلے بچے کی پیدائش کے کچھ عرصے بعد شاہدہ اپنے باپ کے گھر شفٹ ہوگئی
۔کچھ عرصہ تو جہانگیر رویت نبھاتا رہا کبھی دن کبھی رات ہم بڈھوں کے ساتھ گذارنے
کے لیے آجاتا لیکن اس غیر حاضری کے لئے اسے شاہدہ کے حضور کئی بہانے بنانے
پڑتے۔پھر وہ بھی ڈوری سمانے بچے اور شاہدہ کی پتنگ سے بندھا ہم سے رخصت
ہوگیا۔۔۔۔

جہانگیر کو جلد ہی اس کے سسر نے اپنی فیکٹری میں فٹ کرلیا اور اس طرح امریکہ
آنے سے بہت پہلے وہ ہمارے گھریلو سسٹم کا حصہ نہ رہا۔شاہدہ کو امریکہ جانے کی کوئی
ضرورت نہ تھی اسے ہر قسم کی آسائش میس تھی لیکن ارجمند اور بلال جب رخصت
ہوئے تھے۔شاہدہ نے امریکہ کو اپنے لیے چیلنج بنالیا ارجمند اور بلال کے لیے امریکہ
ایک مجبوری تھی۔وہ پاکستان میں اپنے لیے ناکافی دولت اور عزت کما کر عاجز آگئے
تھے۔جہانگیر کے لیے ایسا کوئی مسئلہ نہ تھا وہ اپنے سسر کی ایک بہت بڑی ٹیکسٹائل مل کا
جنرل منیجر تھا۔پھر بھی وہ لاہور چھوڑ کرنئی دنیا چمک دمک دیکھنے کے لیے رخصت ہوگیا۔
ارجمند اور بلال کو ہجرم کیے ابھی زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا جبکہ جہانگیر اور شاہدہ بھی
پردیسی ہوئے۔۔۔۔اصغری نے بیٹی کی جدائی تو سہہ لی لیکن بیٹے کے جانے کے

بعد وہ بالکل بیکار ہوگئی۔

عورت بڑھاپے میں اگر پرورش کے چکر مین نہ پڑے تو بیماری کے چکر میں پڑجاتی ہے اس کے اردگرد بچے پوتے پوتیان نواسے نواسیاں ہر عمر اور طبقے کے رشتہ دار گھرا ڈالے رکھیں تو وہ خوش رہتی ہے۔ ہر قسم کا صدری نسخہ، ٹونا ٹوٹکا۔ کھانے پکانے کی ترکیبیں، رنگائی دھلائی کی باریکیاں، رشتوں کی چھان پھٹک اسے نوجوان عورتوں میں ممتاز کردیتی ہیں بڑھاپا عورت کا سنہری دور ہوتا ہے بڈھا اس سے خوفزدہ اور نوجوان اس کے دبدبے سے خائف ہوتے ہیں اس میں سرداری تھانیداری اور رجی داری کے وصف پیدا ہوجاتے ہین، لیکن اب زمانہ بدل گیا تھا۔ بہوئیں پوت لے کر چمپت ہوجاتیں۔ رشتہ دار امیر ہونے بعد مشورے مانگنے میں اپنی تک محسوس کرتے کھانے پکانے کی جو ترکیبیں درکار تھیں ان کا نام بھی بڑھیاں نہ سنا تھا۔ نہاری ،سموسے، پلاؤ، شامی کباب اور ایسے ہی گھریلو پکوان آوٹ ہو چکے تھے ڈائیٹنگ کرنے والی لڑکیاں اب مغربہ کھانوں پر سوچ آن کر چکی تھیں۔

چینی کھانا ان تھا۔ کپڑوں کے لیے ماڈلز اور بوتیکوں کی طرف رجوع تھا۔ ڈایزائنز کپڑوں کی تلاش جاری رہتی تھی۔ اس لیے بڑی عورتیں گھٹنوں کے درد زیابطیس اور بلڈ پریشر کے چکروں میں کھوگئی تھیں اب موئے ڈاکٹر ہی ان کی باتیں سنتے اور ان کو مشورے دیتے۔ باقی جاندان دوست بچے ترقی کی ہوا اڑا لے گئی تھی

اصغری ساری عمر ماں رہی۔

وہ نہ صرف اپنے بچوں کی ماں تھی بلکہ مجھے بھی اس نے اپنی مامتا کی چادر میں لپیٹ لیا تھا۔ اسی مامتا کی وجہ سے اس کے ساتھ رہنا آسان تھا۔ اس میں کسی قسم کا چیلنج ،مقابلہ بدتمیزی، گستاخی نہ تھی جب ارجمند اور جہانگیر اپنے اپنے دائروں مین گومتے امریکہ بدر ہوگئے تو ماں کا جینا دوبھر ہوگیا۔ پہلے اس نے ملازموں کو بچے بنایا۔ پھر ایک

جنگلی بلی کو سدھا سدھا کر اپنے پوؤں میں لوٹنا سیکھا دیا۔ ان سے بھی دل نہ بھرا تو سارے گھر میں ان ڈور پودے لگا کر اس نے اماں حوا کا باغ بنا دیا رہی سہی کسر اصغری مجھ پر نکالتی رہی۔ وہ میری آیا، نرس، سیکریٹری، پڑوسن دوست ماں سب کچھ تھی ان سارے آرام دہ رشتوں میں کوئی کانٹا، چبھن سوزش نہ تھی وہ کسی میں بے کلی کو جنم دینے یا ابھارنے کے قابل نہ تھی۔

اصغری صرف ماں تھی۔۔۔۔ ماں اردگرد پرورش کا بکھڑا نہ ہو تو وہ بن پانی کے جھاڑ کی طرح پہلے کلملاتی ہے پھر زرد ہو کر جان چھوڑ دیتی ہے۔۔۔۔ جہسنگیر امریکہ سدھارا۔ پہلے تو وہ اس کا انتظار کرتی رہی۔ گرین کارڈ بن جانے کے باوجود جب وہ ماں سے ملنے نہ آیا یا نہ آسکا تو وہ حیران رہ گئی۔ پھر سال دو سال وہ جہانگیر کے پاس جانے کا ارادہ کرتی رہی۔۔۔ آخر میں اس نے زندگی کے دم دلاسہ کا جواء گلے سے اتارا اور چپ چاپ رخصت ہوگئی۔

اسے شاید معلوم نہیں تھا کہ میں اس کا اسہ طرح عادی تھا جیسے گود کا بچہ چوسنی کا ریسا ہوتا ہے، بڑی دیر میں، خالی کمروں میں اصغری کو تلاش کرت رہا۔ پھر مین نے ایک دن گلاس سے دودھ پینا شروع کر دیا۔۔۔۔ یہ گلاس میر ملازم غلام نبی تھا

ہاں تو میں آپ سے اصغری کی بات کر رہا تھا۔ ہر عورت میں ماں اور طوائف کا امتزاج ہوتا ہے۔۔۔۔ جب عورت خدمت گزار ایثار پسند تخلیق کار وجدان کی خوبیاں سے متصف ہوتی ہے اس وقت اس میں ماں پن واضح ہو جاتا ہے جو نہ اس میں طوائف پن ابھرتا ہے وہ ذات کے حوالے سے خود غرض سوچ میں رنگی جاتی ہے اب اس عورت پن یا Self ابھرتا ہے۔ وہ اپنے وجود کی نمائش کے لیے کوشاں ہو جاتی ہے۔ وہ کیا پہنتی کیسا کھاتی اور کسمعیار زندگی مین دن بسر کرتی ہے اس کے لیے یہ چیزیں اہم ہو جاتی ہیں اس کا ہر سوال اس کی اپنی ذات سے نکلتا ہے اور کا جواب اس کی اپنی ذات کو درکار ہوتا ہے۔

جس طرح عورت ماں اور طوائف کا ملغوبہ ہے۔ ہر مرد میں بھی ایک کارندہ کفالت کرنے والا اور ایک زناکار موجود ہوتا ہے۔ کفیل زندگی کو دماغ کے بائیں حصے سے پرکھنے کا عادی ہوتا ہے وہ عقلی روشنی میں استخراجی احتیاطی خارجی عملی اور تجویزی زندگی بسر کرتا ہے لیکن مرد Rapist ایک اور نہج کا آدمی ہوتا اور کہلاتا ہے، جونہی ماں اور کفیل سنجوگ مین بندھ جاتے ہیں کامیاب شادی شدہ زندگی جنم لیتی ہے۔ طوائف اور انا کار مل بیٹھیں تو ہی ہی ہا ہا موج میلا ٹھٹھا مذاق جنم لیتا ہے مشکل یہ ہے کہ کوئی عورت یا کوئی مرد سو فیصد اپنا ایک روپ قائم نہیں رکھ سکتا۔ کسی عورت میں سیر بھر عورت اور پاؤ بھر ماں ہوتی ہے کوئی پچاس پچاس فی صد دونوں رنگ رکھتی ہے مرد مین بھی دونوں روپ ملے جلے ہوتے ہیں خود نہ مرد کو علم ہوتا ہے نہ عورت کو کہ اس کے اصلی روپ پر کس وقت دوسرا ہمزاد شب وخون مارے گا اور حاوی ہو جائے گا۔ عمر موسم میل جول غریبی امیری اتنے فیکٹرز اس پر اثر انداز ہوتے ہیں کہ بالآخر کہنا پڑتا ہے کہ جب تک انسان زندہ ہے خطرہ موجود ہے اور وہ کسی وقت بھی روپ بدل سکتا ہے۔

لیکن مین آپ کو اصغری کے متعلق وثوق سے بتا سکتا ہوں کہ وہ پوری پوری ماں تھی اگر اس میں کہیں عورت پن موجود تھا تو اس روپ کو اس نے اپنے خیالوں سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دی۔۔۔۔ اپنے خیالوں میں نہ جانے اس نے کیسی پینگیں چڑھائیں کیسی کیسی عیاشی کی۔ خیال کی مئے گلرنگ سے مین نے اس کا چہرہ بھی کبھی تمتمایا ہوا نہ دیکا۔ میرا خیال ہے اصغری کے جینز ترقی کرنا نہیں جانتے تھے۔ وہ پچتوں کی تربیت کا نچوڑ تھی۔ وہ جھگڑے اور فساد سے نا آشنا اس دارالمحن میں آئی اور کسی قسم کی ترغیب دلائے بغیر کسی سیب کے درخت کو چھیڑے بنا ہی رخصت ہوگئی اس کے بعد میری زندگی خالی کوکا کولا کی بوتل تھی۔

اصغری کی اصل کو مین پہنچان نہ سکا اور اقبال کے متعلق میرا علم اتنا ناقص اور

معلومات اس قدر کم تھیں کہ میں فقط اپنے جذبے کی روشنی میں اس کی دھندلی یادوں کو سمجھنے کی کوشش میں مبتلا رہا۔ لیٹے لیٹے مجھے ایک کہانی یاد آ گئی جو کچھ یوں تھی

یمن کے بادشاہ نے اپنے وزیر باتدبیر کو اپنی خوابگاہ میں طلب کیا اور گریا ہوا۔۔۔۔۔ ''اے زیرِ مر درات بھر میں بے خواب رہا مجھے اصل اور نقل میں پہچان نہیں۔ میں ادل بدل کو سمجھتا نہیں۔ انسان میں تبدیلی کو جانتا نہیں پھر مجھ پر یہ تاج شاہی کیوں؟''

وزیر اعلیٰ تدبر کورنش بجا لایا اور اختصار سے بولا۔۔۔ ''ظل الہٰ! کچھ اپنی پریشانی کی وضاحت فرمائیں تو ناچیز کچھ عرض کرے۔''

بادشاہ نا مطمئن لہجے میں گویا ہوا ''میں آج تک کسی انسان کو سمجھ نہیں پایا۔ جب کسی کو باوفا سمجھ بیٹھتا ہوں تو وہ بے وفا ہو کر دشمن سے جا ملتا ہے جب کسی پر احسان کی گٹھڑی لا دتا ہوں تو وہ احسان فراموش نکلتا ہے۔۔۔''

''اس لیے آقا کہ انسان آگ اور پانی سے بنا ہے اور نغا دے تصف ہے۔ وہ جب بھی ایک اصلیت کو زیر دام لائے گا۔ کچھ مدت بعد اس کی دوئی دوسرا رنگ بر آمد کر دے گی۔۔۔۔''

دیر تک بادشاہ خشمگیں نگاہوں سے وزیر حاضر دماغ کو دیکھتا رہا وہ پہلے سے بھی زیادہ الجھتا جا رہا تھا آخر کار بول۔۔۔۔۔۔ اس میں تجھ سے انسان کی دوئی کا چرچا نہیں کرتا۔۔۔۔ یہ تو روز ازل کا جھگڑا ہے مجھے تو امور سلطنت کی ایک گھتی سلجھا کر دے۔۔۔''

وزیر نا تواں نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور جھک گیا ''بسر و چشم آقا''

بادشاہ نے اپنے سفید ابرو اٹھا کر استفادہ کیا۔۔۔ ''دیکھ مرد صد صفات میں پریشان ہوں۔ کیا میں اپنی رعایا کے علم میں اضافہ کروں یا صرف ان کی ضروریات کا

خیال رکھوں ا رصرف ۔۔۔ان کو نان نفقہ پہنچا کر سبکدوش ہو جاؤں ۔۔۔۔۔۔''

کچھ دیر وزیر خاموش رہا پھر روز افشاں کرنے کے انداز میں بولا '' دیکھ شاہ والا تبار! ان لوگوں کو علم عطا کرنا جس سے یہ مستفید نہ ہو سکیں ۔بے معنی ہے ایسے لوگوں کو روٹی عطا کرنا جو آپ کی نیت سے نا آشنا ہیں مہمل عمل ہے ۔دونوں حالتوں میں رعایا کے نفع کی توقع رکھنا بیکار ہے گدھے پر علم کا وزن ڈالنا اور جو کھانا کھا کر بدگمانی کا شکار ہو یہ بھی عمل رائیگاں ہے''

''میں تیرا مطلب سمجھا نہیں ۔۔۔۔۔''

'' رعایا میں ملے جلے لوگ ہوتے ہیں شاہ جم جاہ ۔۔۔۔کچھ سمجھتے ہیں کہ بادشاہ نے جو خزانے کے منہ کھول رکھے ہیں تو دراصل یہ رشوت کی ایک قسم ہے آگے چل کر بادشاہ ہن سے ضرور کچھ ایسے بھیانک کام کروائے گا جو ہماری مرضی کے خلاف ہوں گے ۔اس لیے بدگمان کھائے جاتا ہے لیکن احسان مند نہیں ہوتا ۔''

بادشاہ مضطرب ہو کر بولا ۔۔۔''تو بول پھر میں اپنی رعایا کے لیے کیا کروں ؟'' کچھ دیر بعد وزیر خاموش رہا پھر رسان سے گویا ہوا ۔۔'' ایک بات دھیان میں جمی رہے تو صاحب اقتدار صحیح راہ پر چل سکتا ہے ۔بسا اوقات جسے آپ ناکارہ سمجھ کر برطرف کیے رکھتے ہیں وہی کام آمد و قیمتی ثابت ہوتا ہے ۔۔۔۔۔''

''میں تیری بات سمجھا نہیں ۔۔۔۔''

وزیر نے آنکھیں گھما کر کہا ۔۔۔'' افغانستان سے ایک صوفی درویش حال ہی میں شہر میں وارد ہوا ہے ۔۔۔صاحب حال ہے ۔اجازت ہو تو اس گتھی کو اس کے سپرد کیا جائے ؟''

بادشاہ نے اجازت مرحمت فرمائی ۔

افغانستان کا درویش حاضر ہوا ۔۔۔سر سے پاؤں تک برف کا گالا حسن و خوبی

کی زندی مثال مسکراتا تو روشنی میں اضافہ ہو جاتا سوچتا تو ماحول تفکر میں ڈوب جاتا سیانے وزیر نے دست بستہ عرض کی۔۔۔ ''سرکارؐ اگر اپنے افغانستان میں آپ صاحب اقتدار ہوتے تو وہاں رعایا کا حق کیسے ادا کرتے۔ان کا کارساز کیوں کر بن کر دکھاتے؟''

افغانی درویش نے کہا۔۔۔۔ ''اے عالی مرتب وزیر۔۔۔ایک تجربہ کرنے کی ضرورت ہوگی۔۔۔اگر کوئی شخص کسی ضرورت مند کو آدھ سیر خوبانی نہایت عمدہ عنایت کر دے اور دینے والے کو بتائے کہ اس عمل سے اسے زمانے بھر کی دولت نصیب ہوگی اور عنایت کرنے والا مان جائے تو یقین رکھ، اس بادشاہ کی سلطنت میں لہر بہر ہوگی اور فلاح کا راستہ بھی کھل جائے گا۔''

چندے توقف کے بعد بادشاہ نے کہا۔۔۔۔ ''یہ کیوں کر ممکن ہے کہ آدھ سیر خوبانی ایک سلطنت کا پانسہ پلٹ دے۔'' بادشاہ کا تذبذب دیکھ کر فقیر بولا ۔۔۔۔۔۔ ''چل پھر میرے ساتھ چل۔۔۔تجربہ شرط ہے۔میں تجھے بازار کابل کی سیر کرواؤں۔۔۔''

بادشاہ اور وزیر نے عام لوگوں کا بھیس زیب تن کیا اور افغانی درویش کے ہمراہ سدھارے۔لمبی مسافتیں طے کر کے کابل کے بازار میں پہنچے۔ایک امیر کبیر پھل فروش سے سامنا ہوا۔درویش نے دست سوال پھیلایا اور ملتجی ہوا۔۔۔ ''اے پھل فروش! ایک بہت ہی غریب آدمی لذیذ خوبانی کی آرزو رکھتا ہے۔تو مجھے آدھ کلو خوبانی بطور خیرات عطا کر کہ میں اس کی دیرینہ خواہش پوری کروں۔۔۔''

پھل فروش نے قہقہہ بلند کیا۔۔۔۔ ''واہ میں نے ان گنت فقیر دیکھے لیکن آج تک خیرات میں خوبانیاں مانگتے کسی کو نہ پایا۔تم جیسے ٹھگوں کو میں خوب پہچانتا ہوں رستہ ناپو۔''

تینوں کچھ فاصلے پر جا رکے تو درویش بولا۔۔۔۔ ''اے بادشاہ یہ شخص سارے

بازار میں اپنی دولت کے باعث عزت وتوقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، لیکن میرے نزدیک ناکارہ۔ اس کی جانب مت دیکھ کہ یہ اپنے لیے جنت کا سودا بھی نہ کر سکا۔ ملک کی خوشحالی کا باعث کیوں کر ہو جاتا؟''

گھومتے پھرتے، ٹہلتے وہ دریائے کابل کے پل پر پہنچے۔ یہاں وزیر باتدبیر اور درویش نے مل کر بادشاہ سلامت کو دریا میں دھکا دے دیا۔ حسن اتفاق ملاحظہ ہو بادشاہ پیراکی کے فن سے ناآشنا تھا۔ غوطے کھانے لگا۔ جان بلب ہوا۔ پل کے کنارے کا کا دیوانہ کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ جونہی بادشاہ کو ڈوبتے پایا قہقہے لگاتا روانہ ہو گیا۔۔۔ دریں اثنا بہت سے لوگوں نے بادشاہ باوقار کو ڈوبتے دیکھا اس کا واویلا سنا لیکن سب نظر بچا کر اپنی اپنی راہ چل دیئے۔

جب ظل الٰہی کے حواس درست ہوئے تو اس نے اس حرکت کی وجہ دریافت کی۔ درویش نے کہا۔۔۔ ''دیکھ بادشاہ! جب ہم پل پر پہنچے تو میں نے کا کا دیوانہ دیکھا۔ اس جیسا ناکارہ شخص سارے کابل میں نہیں۔ فاتر العقل ہے۔ نہ اپنے بھلے کی سوچ سکتا ہے نہ کسی کی فلاح کا باعث بن سکتا ہے، لیکن لمحۂ فکر یہ تو یہ ہے کہ بحران کے وقت یہی دیوانہ کارآمد کام آیا۔''

اب جن ضلیل القدر بادشاہ یمن لوٹا تو اس کھوج میں رہنے لگا کہ علم کے طالب کی ضرورت علم کے توسط سے پوری کرے اور فاقوں سے بیزار لوگوں تک ان کا مطلوب پہنچے۔ اس تگ و دو میں بادشاہ راب کو بھیس بدل کر نکلتا اور انسان کی اصلی طلب کی کھوج لگاتا۔ برسوں بھیس بدل کر نکلتے رہنے سے اس کی بصیرت میں اضافہ ہوا۔۔۔ لیکن ایک بات سمجھنا اس کے لیے پھر بھی محال رہا کہ ناکارہ کو کیسے کارآمد سمجھے حتیٰ کہ غنیم نے اس پر چڑھائی کی اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔۔۔ ایک دیوانہ وزیر باتدبیر کے پاس حاضر ہوا۔ کہنے لگا۔۔۔ ''دیکھ راتوں رات ساری فوج کو قریبی دریا میں چھپا دے۔ جب دشمن کو یقین ہو جائے کہ خطرہ نہیں فوج دریا سے نکل کر قلعے پر حملہ کر

دے دشمن کو شکست دے"۔۔۔۔۔وزیر نے ایسا ہی کیا اور دشمن کو قرار وقعی سزا دی ۔سنا ہے اسی دن کے بعد سے بادشاہ نے کسی بھی انسان کو حقیر سمجھنا اپنی شان کے خلاف سمجھا اور درجہ بدرجہ لوگوں کی فلاح میں مشغول رہا۔اس کی مملکت میں ضرورت مند علم والے اور ناکارہ سبھی نے فلاح پائی۔

فون کی گھنٹی بجی۔۔۔۔بھاگ کر قیصر نے فون اٹھایا۔

"نانا۔۔۔۔یہ فون آپ کے لیے ہے"اس نے مجھے امریکن لہجے میں پکارا۔میں نے چونکا قیصر سے پکڑا۔چھوٹا سا فرشتہ مسکرایا اور بولا۔۔۔۔"جہانگیر ماموں فون پر ہیں"

"کیا حال ہے جہانگیر۔۔۔"میں نے سوال کیا۔

"آپ نے ارجمند کے پاس ہی رہنا ہے۔میرے پاس نہیں آنا۔۔۔۔"

میں نے احساس جرم تلے کھانس کر کہا۔۔۔۔۔"ابھی تو ارجمند جاپان گئی ہے واپسی پر کچھ پتہ چلے گا"

دوسری جانب جہانگیر کی آواز پر امید تھی۔وہ خوشخبری کی آواز میں بولا ابو ہم آجاتے ہیں آپ کے پاس۔۔۔آپ ٹریول نہ کریں۔۔۔آپ کے لیے مشکل ہوگا"

"ہاں وہ بھی ہوسکتا ہے بلکہ تم ہی آجاؤ۔۔۔"

مشکل یہ ہے ابو جی کہ۔۔۔میں نے ابھی جو جاب لی ہے اس کا پروبیشن پیریڈ ہے۔میں ابھی چھٹی نہیں لے سکتا۔۔۔۔۔یہ شاہدہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہے ابو"اس نے فون شاہدہ کو پکڑا دیا۔

"ضرور ضرور۔۔۔"

"اسلام وعلیکم ابو جی۔۔۔۔"

"وعلیکم السلام"

"کیا حال ہے ابو جی۔۔۔"

''بالکل ٹھیک ہے۔۔۔۔''

''کچھ دیر کے لیے یہاں ہمارے پاس آجائیں ابو۔۔۔۔۔۔میں ٹکٹ بھجوا دوں؟''

''نہیں نہیں ہرگز نہیں۔۔۔۔میں خود ہارون کو دیکھنا چاہتا تھا۔۔۔کتنا بڑا ہو گیا ہے وہ۔''

''اب تو وہ سکول جانے لگا ہے ابو۔۔۔۔پوری پوری باتیں کرتا ہے''

''ہاں۔۔۔۔'' دل میں ہلکی سی ٹیس اٹھی۔۔۔۔انسان کتنا مجبور ہے!

میں اپنے پوتے کی باتوں سے بھی آشنا ہوں......؟ میں اپنی اصغری کے سائے سے بھی محروم ہوں اور اب اقبال کی ہلکی پھوار بھی مجھ پر نہیں پڑتی۔

''پھر آ جائیں ناں پوتے کو دیکھنے......''

''ابھی تو بچے اکیلے ہیں۔ بلالا اور ارجمند جاپان گئے ہوئے ہیں''

پتہ نہیں کیا بات تھی۔ میں جہانگیر کے گھر جانا نہیں چاہتا تھا......وہاں بھی خالی دن اور خالی راتوں کا ہی سامنا تھا۔

ارجمن کو جاپان سے لوٹے دس بیس دن گزر گئے تھے۔ واپسی پر اس نے مجھ سے سرسری طور پر اقبال اور اس کے میاں نثار کے متعلق پوچھا اور تت کر کے چپ ہو گئی۔ میں کارڈلیس لے کر بیلکونی میں بیٹھا تھا۔ جہانگیر کا فون پھر آ گیا۔ شاید وہ کسی قسم کے احساس جرم میں مبتلا تھا۔

''ابھی پھر کیا پروگرام ہے آپ کا......''

''یار میں کچھ سفر سے گھبراتا ہوں......''

''میں کار میں آپ کو لینے آ جاتا لیکن نہیں ملی ابو......''

''نہیں نہیں......تم کہاں مجھے مل واکی سے لینے آیو گے۔''

''یہاں فاصلے بے معنی ہیں ابو...... امریکن ہوائی جہاز کے مقابلے میں کار کو پسنر کرتا ہے آزاد جو ہوا......''

پتہ نہیں شاہدہ نے اس سے فون لے لیا یا نہیں پھر جہانگیر نے اسے چونگا پکڑا دیا......

''ابو السلام علیکم......'' بھو جی بولیں۔

''وعلیکم السلام و علیکم''

فون پر مجھے شاہدہ کی آواز دوستانہ لگی

''آ جائیں ناں ابو...... جہانگیر کبھی کبھی بہت اداس ہو جاتے ہیں۔ لاہور نہیں بھولتا نہیں۔ کار کا سفر لمبا ہے۔ ٹکٹ بھجوا دوں......''

''کیسے بھولے بیٹا......لہور لہور ہے'' میں خوش دلی سے اضافہ کرتا ہوں۔

''واپس لوٹنے سے ایک بار پہلے تو ہمارے پاس آ جائیں......''

میں پچھلی ساری سرد مہریاں بھلا کر جواب دیتا ہوں ''یار میں سفر سے بہت گھبراتا ہوں۔ اتنے لمبے لمبے تو ایئر پورٹ بنا رکھے ہیں تمہارے امریکنوں نے...... چل چل کر آدمی ہف جاتا ہے......''

''نہیں ابو ضرور آئیں...... ہمارے گھر سے کوئی تین منٹ کے فاصلے پر ایک مسز نثار رہتی ہیں۔ ابو......وہ آپ کی بہت باتیں کرتی ہیں۔ میری بڑی نند جمیلہ کی سہیلی ہیں۔ کل بتا رہی تھیں کہ آپ بڑے اچھے شاعر ہیں کہ سیدھی سیدھی پڑھتے تھے......'' میری شاعری کو جاننے والی اس کے علاوہ اور کون تھی؟

یکدم میرا پروگرام بن گیا۔

میں اپنے پوتے کو دیکھنے جا رہا تھا۔

''اچھا یہ بتاؤ ایئر پورٹ گھر سے کتنی دور ہے''

''دس منٹ لگتے ہیں کل''

''بس اس ویک اینڈ پر تمہارے پاس ہوں گا......''

میں اسے یہ نہ بتا سکا کہ وہ اقبال کو بھی اطلاع کر دے اور ہارون کو بھی۔شام سے پہلے میری جیب میں مل واکی کا ٹکٹ تھا۔

بلال نے اپنا بریف کیس گاڑی میں رکھا اور مجھے دیکھ کر کہا...... ''ابو جی اس ویک اینڈ پر ہم سب پاکستان ایمبیسی جا رہے ہیں۔انکل نثار آپ سے ملنے کے آرزومن ہیں۔''

مجھے اب واشنگٹن جانے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

''اوہ......میں تو اس ہفتے مل واکی جا رہا ہوں بیٹے ہارون کو دیکھنے...... ارجمند میرا ٹکٹ بھی لے آئی ہے......''

''اوہ...... آ کو میں ان کے گھر بھی لے جاتا......''

میرے لیئے ٹریڈ منسٹر انکل نثار اب کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔مجھے یقین ہو گیا تھا کہ مل واکی میں اصلی اقبال موجود ہے۔

اس کے جانے کے بعد میں نے دو مرتبہ جہانگیر کے گھر فون کیا لیکن گھر پر کوئی موجد نہ تھا۔پھر رات گئے شاہدہ کا فون آ گیا۔

''ابو جی سلام......''

''وعلیکم......''

''ابو جی آپ کا پیام ملا تھا answering مشین پر، افسوس ہم لوگ گھر نہیں تھے''

میں نے خوش دلی سے پوچھا''تو جیں کہاں گئی ہوئی تھیں؟''

''وہ آنٹی اقبال تھیں ناں مسز مشار...... وہ Long Island چلے گئے ہیں، ساتھ ساتھ ہم ان کا سامان پیک کر رہے تھے، ساتھ ساتھ باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ رفعت آپا سے بہت چھوٹی تھیں تو دوستی کیسے ہو گئی ابو......''

''بس کبھی کبھی ایسے بھی ہو جاتا ہے......'' بھلا اب میں اس چھلاوے کو اور کہاں تلاش کروں؟

''تم نے انہیں بتانا تھا کہ میں شاید آؤں......''

''یہاں تبدیلی Rule of the Game سے کوئی امریکن ایک ہی جگہ جم کر نہیں بیٹھ رہتا۔ جہانگیر بھی اوہائی یو جانا چاہتے ہیں، بس آنٹی نے ارادہ کیا اور چل دیں۔''

''جی ابو کیوں فون کیا تھا آپ نے......''

''بس تمہیں یہ بتانا تھا شاہدہ کہ میں آ نہیں سکتا میری طبیعت ٹھیک نہیں......''

مجھے یوں لگا جیسے شاہدہ دوسری جانب رو پڑی ''آپ ہارون سے ملنے بھی نہیں آ سکتے ابو؟''

پردیس میں یوں بھی ہوتا ہے...... سسر بھی اچھا لگنے لگتا ہے...... بہو...... سسر کا بھی انتظار کر سکتی ہے۔

اصغری کی گمشدگی سے جو خلا پیدا ہوا، اس سے گھبرا کر میں باہر کی طرف دوڑتا...... ہم دونوں ایک عرصہ تک ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہوئے بھی الگ الگ رہے تھے لیکن اصغری کے بعد اب گھر کی سے مجھے فاصلے کی رفاقت کی کوئی شعاع نہیں ملتی تھی۔ ایک دن مجھے پنواڑی کی دکان پر عارفین مل گیا۔

ہم دونوں سکول میں اکھٹے رہے تھے۔ نہ ہم پہلے کبھی دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے، نہ ہی ہمارے درمیان کوئی خاص رابطہ بن سکا لیکن اصغری کے بعد ماضی سے

رابطہ جڑ گیا اور چونکہ میں مستقبل میں سوائے موت کے اور کسی چیز کو حتمی طور پر بلا نہ سکتا تھا، اس لیئے میں نے عارفین کے روپ میں ماضی کو اپنا لیا۔ بد قسمتی سے اسی مجبوری کی وجہ سے میں عارفین سے مکمل طور پر مات بھی کھا گیا۔

یہ بات نہیں کہ وہ مجھ سے طاقتور تھا یا مالی طور پر وہ مجھ سے بہتر تھا۔ شکل وصورت بھی اس کی واجبی سی تھی۔ وہ ٹو ون مقابلے میں وہ مجھ سے کمتر تھا...... وجہ صرف اتنی تھی کہ مجھے اس کی ضرورت تھی اور ضرورت ہمیشہ مجبوری کو جنم دیا کرتی ہے۔ میں اپنے خالی دنوں کو کسی کے نام معنوی کرنا چاہتا تھا۔ عارفین نے مجھے اس لیئے قبول کیا کہ اسے کسی میڈل کی اشد حاجت تھی۔ اس نے مجھے شکست دے کر یہ میڈل اپنے سینے پر سجا لیا۔ اس اضافی تمغے نے اس میں عجیب قسم کی خوش اعتمادی پیدا کر دی جو شاید اس میں اس سے پہلے نہ تھی۔

کبھی ہم دونوں تاش کھیلتے، کبھی شطرنج کی بازی لگ جاتی۔ کبھی ہم سیر کو نکل جاتے، سارے راستے وہ اپنی بیوی کے رویے کی شکائتیں کرتا رہتا کہ کیسے وہ ساری کی ساری اپنے بچوں میں صرف ہو چکی ہے اور بڑھیا کو علم ہی نہیں کہ عارفین بڈھے کے دن رات، ماہ مہینے، سال بہ سال کن حالوں میں گزر رہے ہیں۔ بڈھا صبح کی بیڈ ٹی سے لے کر رات کو فریج ٹٹولتے رہنے تک خود کفالت کے مختلف مرحلوں سے گزرتا تھا۔ اصغری کی طرح بڑھیا نے ایک مدت سے اپنا بیڈ روم علیحدہ کر لیا تھا اور اپنی خوابگاہ میں وہ اپنے پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں، بہو بیٹیوں کے درمیان مجسٹریٹ، نرس، دایا، آیا، کی حیثیت میں پر بہار زندگی گزارتی تھی۔ اس اہمیت میں گم ہو کر اسے بھول گیا تھا کہ عارفین لمبے وقفوں کے لئے اکیلا ہی وقت کے خلاف ڈنڈ بیٹھکیں نکال رہا تھا۔

میں عارفین کو اپنے متعلق کچھ بتانے کی کوشش کرتا۔ ارجمند اور جہانگیر کی کج ادائی، بے وفائی، کم التفاتی کا ذکر چھیڑتا تو وہ سنی ان سنی کر دیتا...... اسے میری

مشکلات کا کوئی اندازہ نہ تھا...... نہ ہی وہ میرے حالات معلوم کرنے میں دلچسپی رکھتا تھا۔

''چھوڑو یار چھوڑو...... بچوں سے آس لگانا چھوڑ دو۔تم اپنی توقعات سے ان کی راہیں کھوٹی کر دو گے...... پہلی بیوی کی طرح رقابت کو زندگی نہ بناؤ...... بڑھاپے کو صرف بڑھیا بھر سکتی ہے۔پہلی مرگئی مرنے دو...... منا جان نہ سہی چنا جان سہی۔کسی طاقتن بڑھیا کا سراغ نکالو اور گھر ڈال لو...... جب تم دوائیاں پینے لگو تو گلاس پانی کا لے کر حاضر ہو جائے۔درد ستائے تو گرم پانی کی بوتل بنالائے...... فجر کا الارم بجتا چلا جائے تو الارم بند کر دے۔جھینگروں کی آواز ستائے تو پچکاری پھک ''چھق کر دے کیڑے مار دوائی ڈال دے۔گھنٹی سن لے۔فون کا جواب دے ڈالے...... چھتری پکڑائے...... بھائی شادی کرلو کسی بیوہ سے لیکن اس کے بچے نہ ہوں۔تمہاری تنہائی کا اور کوئی علاج نہیں......''میری نظروں میں کہیں اقبال آ کر ٹک جاتی اور ہماری سیر اور لمبی ہو جاتی۔مستقبل کو سجانے کے لئے یہی ایک خواب رہ گیا تھا،لیکن مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اقبال کہاں ہے؟اور کن حالوں میں جی رہی ہے؟

''تم کو یہ سارے انعامات جو ابھی تم نے گنوائے ہیں،مل رہے ہیں بھابھی زینب سے''

''بتاتا ہوں ناں تمہیں۔زینب تو اب اپنی مجسٹریٹی میں مشغول ہوگئی ہے۔وہ اپنا اقتدار اہمیت چھوڑ کر نہیں آسکتی...... اپنے بیڈروم سے...... وہ عارفین سے آزاد ہو چکی ہے''

''تو پھر تم دوسری شادی کرلو...... بلکہ بہتر یہی ہے کہ ہم دونوں دو بہنوں سے شادی کرلیں......''میں مشورہ دیتا۔

''میرے گھر والے مجھے گھر سے نکال دیں گے یار جی...... وہ سارے کے سارے زینب بڑھیا کے ہاتھ پر بیعت ہیں''وہ سر ہلا چلا جاتا۔

''تم میری طرف شفٹ کر جاتا...... ڈیفنس کی یہ کوٹھی دو گھرانوں کے لئے بہت بڑی ہے......تم اوپر رہنا میں نیچے......''

میرے تخیل کو پر لگ جاتے۔ میں سوچتا شاید اب تک تو اقبال بیوہ ہو چکی ہو گی...... کوئی اس کی کزن وغیرہ بھی آخری عمر کا سہارا چاہتی ہو گی...... ہم بڈھوں سے شادی کرنے پر وہ دونوں رضامند ہو جائیں گی اور جیتے جی باب جنت کھل جائے گا...... نوکروں کے آگے خوشامدی لہجے اختیار کرنے کا موسم، ان کے انتظار کی صعوبت اور نوکروں کو مسلسل بخشیش دیتے رہنے کی مصیبت ختم ہو جائے گی۔ پھر خیال آتا اگر اقبال کے بچے ہوئے اور انہوں نے اڑچن ڈالی تو؟...... میں عارفین سے کبھی اندر کی بات نہ کر سکا۔

ہمیں دونوں بڑھاپے میں دوسری شادی پر دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ کئی اسکیمیں بنتیں، فیصلے ہوتے لیکن آخر میں عارفین کہتا...... ''چھوڑ یار...... اس عمر میں کیا جھک ماریں...... ساری عمر بھورا بھورا کر کے عزت جمع کی ہے، ایک ہی ہلے میں سب بہہ جائے گی۔ لوگوں کو کیا معلوم بڈھوں کو بھی مرنے سے پہلے تھوڑی سی ہمدردی، آرام، سہولت درکار ہے؟ ہمیں تو محلے والے، گھر کے لوگ سارے کبھی کامیانی صاحب چھوڑ آئے ہیں۔ اب کیڑے جانیں اور ہم...... منکر نکیر سمجھیں اور ہم سمجھائیں...... چھوڑو یار...... تھوڑا وقت رہ گیا ہے...... اوکھے سوکھے کاٹ لو......''

عارفین کے ساتھ بھی میرا رشتہ عجیب سا تھا۔ مجھے اس کا ہر وقت انتظار کرنا پڑتا۔ کبھی کبھی تو راہ دیکھنے کا وقفہ اتنا لمبا ہو جاتا کہ مجھے لگتا زندگی کا وقت تھوڑا نہیں بلکہ بہت زیادہ لمبا ہو گیا ہے۔ وہ وعدے کے مطابق کبھی نہ آتا، کبھی میں گیٹ پر کھڑا بار بار گھڑی دیکھتے ہوئے اس کا انتظار کرتا۔ پہلے میرے انتظار میں تلملاہٹ ہوتی، پھر یہ طیش کی شکل اختیار کر لیتا۔ میں سوچتا اس سے تو بہتر تھا کہ میں اپنے بہن بھائیوں سے رشتہ جوڑ لوں...... وہ لوگ سٹیٹس میں مجھ سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ مجھے اب ان کی

کربل کربل باتوں سے گھن آتی تھی۔ پھر مجھے یہ خدشہ ستاتا کہ وہ لوگ میرے پیسے اور سٹیٹس سے تو رشتہ جوڑلیں گے، لیکن مجھے شاید تروتازہ نہ کر پائیں۔ دائم المریض شاہد بھائی ابا اماں کے بعد ٹمپل روڈ والے گھر پر ہی رہ گئے تھے۔ ابھی تک ہال روڈ کی چھوٹی سی دوکان کے مالک تھے، لیکن ان کا طرز زندگی ایسا تھا جس میں دیمک جیسی چھوٹی بڑی مصیبتیں جنم لیتی رہتی تھیں۔ بچوں کی تعلیم کے مسئلے، گھر والی کے خرچے کے مسائل، یوٹیلیٹی بلز کی ادائیگی کا رنڈی رونا...... وہ گھر اس قدر معاشی بدحالی کا شکار تھا کہ مجھے وہاں جا کر احساس جرم ہونے لگتا۔ شاہد بھائی یا تو دمے کے اٹیک میں داخل ہوتے یا داخل ہونے والے ہوتے۔ ان کا سانس اکھڑا دیکھ کر مناسب بات بھی نہ ہو سکتی۔ ویسے بھی طبقاتی اونچ نیچ گفتگو میں رکاوٹیں پیدا کر دیتی ہے۔ جب کبھی میں وہاں جاتا، جیب بھاری کر لیتا...... واپسی پر مجھے لگتا جیسے ٹمپل روڈ میں مجھے آنسوؤں بھرے دہشت گردوں نے لوٹ لیا......

رفعت آپا کراچی رہتی تھی۔ کبھی کبھی عید پر ملاقات ہو جاتی تو مجھے اس کے بچوں کے نام بھی ٹھیک سے نہ آتے...... فریدہ اور ظفر دونوں جرمنی میں تھے...... ان تارکین وطن کی اصل کہانی سے کوئی واقف نہ تھا۔ شاہد کی بیوی ان کی باتیں کیا کرتی تھی، لیکن میں نے کبھی ان دونوں کا سراغ لگانے کی کوشش نہ کی...... ابا، اماں نے گھر سے رخصت ہوتے ہی ہم سب کو آزاد کر دیا تھا۔ میں ایک کمفرٹیبل زندگی کو مسائل کے حوالے نہ کرنا چاہتا تھا۔ مجھے اطلاع اور انتظار دونوں سے خوف آیا تھا۔ پھر بھی میں صبح و شام اچھے دنوں کا انتظار ہی کئے جاتا۔ گویا یہی زندگی کا اصل مفہوم ہو۔

عجیب سی بات ہے لیکن عارفین مجھے انتظار کروائے بغیر کبھی نہ آیا۔ کچھ دیر غصے کی حالت میں ٹہلنے کے بعد میں مکمل طور پر اضمحلال اور شکست میں بدل جاتا۔ خود ترسی کا شکار، اپنی حالت زار پر دل شکستہ اس کے آنے تک میں مکمل طور پر پسپا ہو جاتا۔

وہ گاڑی سے اترتے ہی بڑے زور و شور سے آئی ایم سوری آئی ایم ویری سوری کے

نعرے لگاتا۔ اس کی کھلی کھلی مسکراہٹ، صاف اجلے کپڑے، شوشائین والے بوٹ دیکھ کر میری تھکاوٹ کم ہونے لگتی اور میں آئی ایم سوری پر اکتفا کر کے اس کے ساتھ ساتھ اندر کی طرف چل پڑتا۔

عارفین نے ہمیشہ وعدے توڑے۔ اس کے نزدیک ہر نیا وعدہ پچھلے وعدے کی توسیع تھا۔ اول تو وہ پیسے لے کر کبھی واپس نہ کرتا اور اگر کبھی اس نے رقم واپس بھی کی تو قسطوں میں...... گویا رہٹی چلا دی۔ ہمیشہ پوری رقم لیتا اور کبھی سالم ادا نہ کرتا۔ میرے ہر پروگرام میں مجھ سے پہلے شریک ہوتا، لیکن جونہی سیر و تفریح کا کوئی پروگرام وہ اپنی فیملی یا کسی دوست کے ساتھ علیحدہ طے کرتا فوراً میرا پتہ کاٹ کر ان کے ساتھ شامل ہو جاتا۔ مجھے ان تفریحات کی تفاصیل ہمیشہ بعد میں البم کی تصویروں کی طرح الٹ پلٹ کر دکھایا کرتا۔ اس کا خاندان، دوست، شکار، اخبار بینی، کتب بینی کے مشاغل میں میرا کوئی گزر نہ تھا......

میں ڈیفنس کی چار کنال کوٹھی میں صرف عارفین کے انتظار کی رسی سے بندھا کتا تھا۔ میں نے نہ تو بھاگ جانے کی سوچی، نہ عارفین کو چھوڑ دینے کا خیال ہی کبھی مجھے آیا۔

میں نے اس کے سامنے ہمیشہ ہار مانی......

وہ طاقتور فاتح سکندر تھا۔ بگ باس، سر جی! فیصلے صادر کرنے پر قادر۔ اس نے اپنے کسی رویے سے اپنے عمل کی Explanation کبھی نہ دی۔ میں اگر کسی معاملے میں ذرا سا بھی قصوروار ٹھہرتا تو ادنیٰ چپڑاسی، کلرک، خانساماں کی طرح جواز پیش کرنے لگتا۔ غلط ہو کر بھی اس کی گفتگو الزامی ہوتی۔ درست ہوتے ہوئے بھی میری باتوں پر اس کا غصہ جائز لگتا۔ وہ بھڑکتا...... ''تم جیسے کلرکوں کو جھڑکیاں ہی کھانا پڑتی ہیں اور شوکاز نوٹس بھی کبھی کبھی ہاتھ میں آ جاتا ہے...... تمہاری پرسنیلٹی اتنی دولت کے باوجود دبو ہے۔ یہ سارا تمہاری پینڈو بیک گراؤنڈ کی وجہ سے ہے''۔

''آئی ایم سوری یار''میں کہے جاتا۔

لیکن بگ باس کبھی میری ''سوری'' کو قبول نہ کرتا اور جھڑکتا چلا جاتا۔

کوٹھی بہت بڑی تھی۔میرا رول اس کوٹھی میں رکھوالے کا تھا...... بھونکتے رہنا، چوکیداری کرنا، رانگ نمبر کے فون سننا، دروازے کنڈیاں بند کرنا کھولنا، ارجمند اور جہانگیر کے فون کے انتظار میں رہنا...... دھوبی، دودھ والے، اخبار کے ہاکر سے دوستی کرنا، کوٹھی سے نکل کر گیٹ پر کھڑے ہوکر آتے جاتے لوگوں کو سلام کرنا، غریبوں کو خیرات دینا، کوے چیلوں کو صدقے کا گوشت پھینکنا، لان میں مالی کو شرمندہ کرنے کے لئے جڑی بوٹی نکالنا...... میں نیاپنے لئے کچھ چھوٹی چھوٹی اذیتیں ایجاد کر لی تھیں، کیونکہ ان اذیتوں کے علاوہ میرا کوئی مصرف نہ تھا...... باقی بچے ہوئے وقت کو میں نے عارفین کے انتظار اور اقبال کی یاد کے حوالے کر دیا تھا۔پھر اچانک ایک واقعہ ہوگیا۔

اس دن عارفین بڑے سادہ سے شلوار قمیض میں آیا، اس کی نمک مرچ داڑھی بھی بڑھی ہوئی تھی اور یوں لگتا تھا گویا وہ رویا سا ہے۔میں عارفین کا انتظار بھی نہیں کر رہا تھا کہ وہ اچانک وارد ہوگیا...... یہ بھی عجیب بات ہوئی۔

ہم دونوں آگے پیچھے اندر کی طرف چل دیئے۔

''سیر کو چلیں، موسم اچھا ہے......''

''نہیں یار یہیں......ٹھیک ہے''۔

ہم دونوں شطرنج والی میز کے گرد بیٹھ گئے۔ میں نے میز کے ساتھ لگی ہوئی گھنٹی بجائی...... مودب، چالاک غلام نبی آ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس شام وہ اس معمولی سروس کے بدلے مجھ سے ادھار مانگے گا یا چھٹی۔

''کافی لائے کریم کے ساتھ''

''ناں ناں جی نہیں چاہتا......''

''ناں......''

''چلو چائے لاؤ''

غلام نبی برخاست ہو گیا......

ہم نے شطرنج پر مہرے جمائے۔ دو چالیں چلنے کے بعد عارفین نے کہا...... ''بش یار جی نہیں کرتا......''

''تاش نکالو......''

''ناں یار...... دو آدمیوں میں...... فلاش کھیل کر مزہ نہیں آتا......''

''تو پھر تیسرے آدمی کی تو چوائس ہی میرے پاس نہیں ہے''

عارفین دونوں گھٹنے کھول کر ان پر ہاتھ جمائے بیٹھا تھا۔ پھر کہیں سے مغرب کی اذان سنائی دی۔ وہ سیدھا غسل خانے میں چلا گیا، میں نے باورچی خانے کا رخ کیا اور اس کی پسند کی کافی بنا کر لوٹا تو وہ سر پر رومال باندھے ایک کونے میں سامنے کشن رکھ کر نماز پڑھنے میں مشغول تھا۔ چند لمحے میں نے اس کی کمر کو گھورا تو مجھے یوں لگا جیسے وہ رو رہا ہو۔ جب تک وہ مغرب کی نماز پڑھ کر اٹھا، کریم ملی کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ وہ سر سے رومال اتارتا ہوا کچھ اکتایا سا آ کر صوفے میں دھنس گیا۔

''بھائی صاحب تم نے تو کافی برف کر دی۔ مجھے بتا دیتے میں کافی نہ بناتا''

''ٹھیک ہے...... چلے گی'' اس نے پیالی اٹھالی۔

یہ میرے لئے عجیب سی بات تھی، کیونکہ عارفین کھانے پینے کے معاملے میں بہت نازک مزاج تھا۔ گرم چائے، ابلتی کافی ...... درست نمک مرچ، اچھی بھنائی والا گوشت، خستہ چیزیں، لذیز کھانا بر وقت حاضر نہ ہوتا تو وہ چڑ چڑا سا ہو جاتا۔ اچانک کھاتے کھاتے وہ کہتا۔ ''یار! اس غلام نبی کو نکال دو۔ یہ ہلدی کچی رکھتا ہے۔'' میرے لئے یہ علم بالکل نیا تھا کہ ہلدی بھی کچی رہ سکتی ہے، اسے بکرے کے تمام اعضاء کا ایسے علم تھا جیسے میڈیکل کے طالب علم کو گرے کی کتاب سے علم الابدان حاصل ہوا کرتا

ہے۔وہ بتایا کرتا کہ پٹھ کا گوشت کس سبزی میں پڑے گا، گردن کا شوربہ اور دستی کا حلیم کیسے تیار ہوتا ہے۔ران کے روسٹ کی ترکیب کس نائی نے اسے سکھائی تھی؟ پسندے کٹوانے سے پہلے کیا احتیاطی تدابیر قصائی کو بتانا ضروری ہیں؟ چانپ کو کیسا مسالہ لگایا جائے؟...... اسے شاہی باورچی ہونا چاہئے تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ یہ سارا علم کتابی تھا۔ چسکے کی حد تک وہ یہ ساری انفرمیشن دے سکتا تھا ورنہ نہ تو اس نے کبھی باورچی خانے کی شکل دیکھی تھی، نہ کبھی کسی نے اسے باورچی خانے میں گھسنے دیا تھا۔وہاں پر بڑھیا زینب کا ٹکٹ سکہ چلتا تھا۔

ٹھنڈی کافی کے گھونٹ وہ لمبے لمبے وقفوں کے بعد پی رہا تھا۔

''یار ابھی مائیکرو اون میں گرم کرلاتا ہوں......''

''بس ٹھیک ہے......''

کافی کے بعد وہ کچھ دیر خالی الذہن ہونق سا بیٹھا رہا۔

''یار چلو سیر کے لئے چلیں۔واپسی پر آئس کریم کھائیں گے......''

اس کے چہرے پر ایسی ناگواری آئی جیسے میں نے کوئی گالی دے دی ہو۔

''نہیں......''

''کیا بات ہے......؟''

''بس موڈ نہیں ہے......''

''یہ کیا بے ہودہ ٹرکار ہے۔اٹھو چلیں......''

وہ غصے سے اٹھا اور باہر چلا گیا۔چند لمحے بعد اس کی کار سٹارٹ ہوگئی۔پتہ نہیں کیوں میں نے بھی باہر جانے کی زحمت نہ کی۔میں اس کے کافی لاڈ سہہ چکا تھا اور اندر ہی اندر میں نے بھی کچھ شکایتیں پال رکھی تھی۔

چند دن اپنے اپنے انتر بھاؤ میں گزر گئے۔پھر ایک رات گئے اس کا فون آ گیا۔

''وہ میں کل آؤں گا......تم سے کچھ بات کرنا ہے''

''کب آؤ گے......''میں نے رسان سے پوچھا

''مغرب کے بعد......''

وقت بتانے کا یہ طریقہ مجھے اس کے منہ سے عجیب لگا۔پھر بھی میں ہمیشہ کی طرح انتظار کی چرخی سے بندھ گیا۔وہ مغرب کی اذان سے ٹھیک آدھ گھنٹہ بعد حاضر ہو گیا۔ اس نئے قانونیے کا چہرہ آج پہلے سے بھی زیادہ مدقوق نظر آ رہا تھا۔ دبلا پتلا، سنیک سلائی عارفین مجھے اصلی عمر سے زیادہ لگا،اس کے ہونٹ دونوں جانب لٹک رہے تھے ......آنکھیں نم تھیں۔ماتھے کی لکیریں بہت نمایاں نظر آ رہی تھیں اور پہلے بار مجھے لگا کہ کسی چونکیل جانور کی طرح اس کے کان کلوں سے باہر نکل آئے تھے۔

میں نے عارفین کا ہاتھ پکڑ لیا۔اس کا ہاتھ برف کی طرح ٹھنڈا اور تر بتر تھا، یہ پسینہ نہیں تھا۔موت سے پہلے کی ٹھنڈی تریلی تھی۔ہم دونوں جب اندر پہنچے تو میں نے محسوس کیا کہ اس کا ہاتھ کچھ کانپ بھی رہا تھا۔

''بیٹھو کیا ہوا؟......''

عارفین کے ہونٹ کپکپانے لگے۔

''کچھ نہیں۔تاش نکالو''

میں نے اس سمپورن اداسی سے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا اور تاش پھینٹنے لگا۔اس کی نگاہیں تاش کے پتوں پر نہیں تھیں۔وہ کھڑکی سے باہر لان میں کچھ دیکھ رہا تھا۔

''چال چلو......''

اس نے اپنا پتہ چھانٹ کر پھینک دیا اور ڈھیری میں سے نیا پتہ نکالا۔دو تین ہاتھ میں ہی اس کی رمی بن گئی اور اس نے شو کرا دیا،لیکن اس جیت نے اسے رتی بھر خوشی نہ دی،اس کا چہرہ کسی پرہیز گار بوڑھی عورت کی طرح جھریوں بھرا تھا۔وہ بے یار و مددگار انداز میں بدلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ہم نے دو چار بازیاں کھیلیں اور ہر بار وہی جیتا۔اگر وہ پہلے والا عارفین ہوتا تو کسی پاکھنڈی کی طرح ،کبھی اچھلتا،کبھی تالیاں بجاتا،کبھی مجھے

چھپیاں دیتا لیکن اب وہ خیانت کرنے والے بدنیتی کی طرح مجھ سے آنکھیں چرا رہا تھا۔

میں نے تاش جمع کر کے ایک طرف رکھ دی اور معذرت سے بولا......

''عارفین میں تمہارا پگڑی بدل دوست نہ سہی، لیکن میں تمہارا خیر خواہ ضرور ہوں۔ مجھے بتاؤ ہوا کیا ہے''۔

''تم کچھ نہیں کر سکتے۔ بتانے کا فائدہ؟......''

''چلو......اور کچھ نہ کر سکا تمہارے دل کا بوجھ تو ہلکا ہو جائے گا''

''یہ ایسا کلیش ہے جس کا کوئی علاج نہیں......''

''چلو تم بیان تو کرو...... بھائی''

آنکھیں موند کر اس نے سر کرسی سے ٹکا لیا......'' ہر عہد کی اپنی آزمائشیں اپنے دکھ ......بچپن میں کھیلنے کو نہ ملے تو دکھ...... جوانی میں محبوبہ کا روگ لگا رہے ہو گھڑی......پھر شادی رچا لے بڑی امید کے ساتھ اور بیوی گھاس نہ ڈالے۔ گرہت کی کڑکی میں مرا ہوا چوہا بن کر گزارے ساری ادھیڑ عمر، لیکن یہ دکھ کچھ بھی نہیں۔ بڑھاپے کا دکھ تو ایسے ہے میاں، گویا بیلنے میں سارا وجود آ گیا ہے''۔

میں چپ رہا۔ میرا خیال تھا ہنکارا بھرنے سے وہ چپ ہو جائے گا۔

''اولاد اور مال کی آزمائش تو سب سے بڑا دکھ نکلا۔ گھوڑا گھڑ دوڑ کی ہرٹی ٹاپ سکتا ہے، لیکن اولاد کی آزمائش کو نہیں ٹاس سکتا...... ہمایوں''۔

اس کے بعد اس نے مجھے آہستہ آہستہ اپنے بیٹے خلیل کے متعلق بتانا شروع کیا۔ وہ اسلام آباد میں فیڈرل حکومت کا بہت ہی سینئر افسر تھا اور اس پر لاکھوں کے غبن کا کیس تھا۔ اس وقت اسے Suspend کر کے انکوائری چل رہی تھی اور ابلتے دودھ کے جھاگ کی مانند اس کی چھوٹی بڑی برائیاں بڑھ چڑھ کر اخباروں میں چھپ رہی تھیں۔ پتہ چلا کہ وہ ہاؤس ارسٹ میں تھا۔ اس کا پاسپورٹ ضبط ہوئے کافی عرصہ ہو گیا تھا۔

عارفین کی باتوں سے احساس ہوا کہ خلیل خاں نے جو فاختائیں اڑائی تھیں، اسے مہنگی پڑیں۔ اب نوکری بھی جاتی نظر آتی تھی۔ اوپر سے جس عزت کو حاصل کرنے کے لئے اتنے داؤ پیچ کھیلے تھے، وہ خاک میں مل گئی۔ عارفین تو اس قدر خوفزدہ نظر آتا تھا کہ اسے دیکھ کر لگا کہ خلیل خاں کو اگر جیل ہوگئی یا مقدمہ چلا...... یا جائیداد ضبط ہوئی تو وہ خبر سنتے ہی عارفین فوت ہو جائے گا۔

''کہتا ہوں...... جب جب اسلام آباد گیا سمجھایا اپنی بہو صوبیا کو کہ اتنے ٹھاٹھ ٹھیک نہیں۔ اکیسویں گریڈ کے افسر کی اتنی تنخواہ نہیں ہوتی کہ وہ دو کاریں، چار ملازم اتنی سوشل لائف رکھے...... یہ جاگیرداروں کارخانے والوں کے چونچلے ہیں تو پتہ ہے صوبیا کیا کہتی تھی۔ ابا جی! آپ فکر نہ کریں۔ ہم افورڈ کر سکتے ہیں۔ پھر جس سرکل میں ہم Move کرتے ہیں، ان کا یہی معیار زندگی ہے۔ اب ہم اردو میڈیم سکول میں تو بچے نہیں بھیج سکتے ناں...... آپ کو پتہ ہے تنخواہ میں سے تو صرف بچوں کی فیس جاتی ہے یوٹیلیٹی بلز بھی پورے نہیں ہو پاتے''۔

''تم فکر نہ کرو...... اللہ مالک ہے۔ وہ کوئی صورت نکالے گا...... دیکھتے جانا کوئی نہ کوئی ہادی ہاتھ پکڑے گا'' عارفین کو میں اعتقاد کے بغیر تسلی دیتا۔

''ہاں جی...... وہی آخری سہارا ہے...... میں تو کسی منسٹر وغیرہ کو بھی نہیں جانتا اللہ سن لے تو عزت رہ سکتی ہے ورنہ......'' نمود کا ڈرایا عارفین نڈھال ہو کر جواب دیتا۔

یہاں سے بڈھا اور بھگوان کی کتھا شروع ہوتی ہے...... ساری عمر جس عارفین نے مسجد کا رخ صرف عیدین پر کیا تھا، اب ساری نمازیں مسجد میں پڑھنے لگا۔ عارفین کی کچھ ایسی کایا کلپ ہوئی کہ دنیاوی دارو نہ ملا تو ہر فقیر کے پیچھے بھاگنا، ہر شاہ صاحب سے تعویذ لکھانا، درگاہوں پر حاضری دینا، مسجد میں چٹائیاں بچھانا، نمازیوں کی جوتیاں قطار میں رکھنا، درگاہوں پر جھاڑو پھیرنا، داتا دربار میں دیگیں نذر کرنا...... وظیفے پڑھنا، محفل میں بیٹھ کر تسبیح پھراتے رہنا اس کا وطیرہ ٹھہرا۔ عارفین کی زندگی کا نقشہ

بدل گیا......اولاد کی آزمائش نے گویا اس بنڈیلے کو بکری بنا دیا۔اس بنی آدم کے لئے اولاد کی آزمائش، مال کی آزمائش میں بدلی۔جگہ جگہ عارفین کو شنوائی کے لئے رشوت سفارش کے لئے بھاری رقموں کی ضرورت پڑی۔اولاد اور مال کی آزمائش میں پھنس کر بیچارہ قرے کا بھکایا اور رجوگی کا پھٹکارا آخری عمر میں ایسی دلدل میں پھنس گیا کہ ساری تاش، شطرنج دھری کی دھری رہ گئی اور عارفین نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔

کچھ دیر کے بعد میں صرف عارفین کو تلاش کرتا رہا۔پہلے پتہ چلا اسلام آباد میں ہے......پھر کسی نے بتایا ہے تو اسلام آباد میں ہی، لیکن بری امام کے پتھروں میں بھٹکتا پھرتا ہے......نہ کسی سے بات کرتا ہے، نہ کسی کو پہچانتا ہے۔حلئے سے بھی پہچانا نہیں جاتا!

نیگرو لوگ گایا کرتے ہیں

سوچتا ہوں میرا بھائی گیا کہاں

سوچتا ہوں میرا بھائی گیا کہاں

جنگلوں میں کھو گیا شاید

آئے گا اب کہاں؟

جانے کہاں وہ لیٹے گا

جانے کہاں بکھروں گا میں

مالک کسی اداس جگہ میں

زمین پر ڈھیری کی صورت

گر کر اسے پاؤں گا

کیا پہچانوں گا اسے

میرا بھائی گیا کہاں

میں لکڑی کی کٹیا جسے امریکن گزے بو کہتے ہیں، میں بیٹھا نیچے ترائی کے جنگل کی طرف دیکھ رہا تھا۔اس جنگل کا سبزہ بہت خوش رنگ ہے۔درختوں کے تنے سیاہ اور

شاخیں تازہ سیبوں کے رنگ جیسی ان پر موٹی موٹی گلہریاں بڑی آزادی سے چڑھتی اترتی نظر آتیں، کبھی کبھی کوئی پرندہ اچانک درخت سے نکلتا اور بلندیوں کی طرف اڑان بھرتا۔

ہر طرف شانتی تھی، چونکہ اس دیس میں بلاوجہ ہارن بجانا گالی دینے کے مترادف ہے۔ اس لئے گاڑیوں کے چلنے کی آواز تو آئی، لیکن بریکیں لگنے یا ہارن بجنے کا شور زیادہ نہیں تھا۔ پھر ایک پاکستانی عورت نہ جانے کس بلا کج یا سپر مارکیٹ کی جانب سے چلتی ہوئی اچانک وارد ہوگئی۔ مجھے اس کے ورود کا علم نہ ہوا......ٹوٹی بیساکھی پر سہارا پا کر وہ بولی۔

''میں یہاں بیٹھ جاؤں چاچا جی......''

مجھے چاچا جی القاب سن کر ذرا سی ناگواری محسوس ہوئی، کیونکہ وہ عورت پچاس سے کم نہ تھی، پھر یہ سوچ کر ارجمند اور بلال کی ٹھوڑیاں بھی دوہری ہو کر ڈھلکنے لگی ہیں، میں چپ ہو گیا۔

یہ سرکاری گزے بو ہے۔ آپ شوق سے جہاں چاہے بیٹھیں......بیٹی۔''

اس نے اپنی خریداری کے چند لفافے بنچ پر رکھ دیئے اور آہستہ سے بولی......''میں بہت دور سے آپ کو دیکھ کر آئی ہوں...... یہاں تو اتنی تنہائی ہے کہ کوئی مشورہ دینے والا بھی نہیں''۔

''آپ خود بہت سمجھدار ہیں۔ آپ کو مشورے کی کیا ضرورت ہے......اور پھر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ انسان مشورہ لے تو لیتا ہے، اس پر عمل نہیں کر پاتا۔ یہ انسانی مجبوری ہے۔ وہ اپنے سے زیادہ کسی کو عقلمند نہیں سمجھتا''

''نہیں چاچا جی......میری آرزو ہے کہ کوئی مجھے گائیڈ کرے۔ میں بڑی مشکل میں ہوں......''

میں یکدم اپنے آپ کو اہم سمجھنے لگا......

''ہاں ہاں فرمائیے فرمائیے۔ اگر میں کوئی چارہ جوئی کر سکا تو مجھے خوشی ہو گی''۔

وہ بھی بشاش سی نظر آنے لگی۔ گویا میں اس کی اصلی مدد کرنے والا تھا۔

''بات یہ ہے چاچا جی ......'' پھر وہ رکی، گروسریز کے ایک لمبے لفافے میں سے جس می Cereals کے ڈبے تھے، اس نے بازو گھسا کر ایک چوکولیٹ نکالا۔

''آپ کو Hazel Nuts پسند ہیں۔ یہ چوکولیٹ پیکن اور ہیزل نٹز سے بنا ہے''۔

منہ کے ذائقے کو بھڑکانے کے لئے انسان گندم کے دانے سے چل کر کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔

''شکریہ......'' میں نے چوکولیٹ کا برانڈ پڑھا۔ اسے ناک سے لگا کر سونگھا اور شکریہ کہہ کر ریپر کھولنے لگا۔

''یو آر ویلکم ......چاچا جی بات یہ ہے کہ میرے دو بیٹے ہیں اور وہ دونوں امریکہ میں ہیں۔ بڑا اسکندر تو یہاں ایک معمولی سے سٹور میں کام کرتا ہے اور چھوٹا اختر پڑھ رہا ہے انجینئر سکول میں......''

امریکہ میں کالج کی تعلیم کو عموماً سکو جانا کہتے ہیں۔

''بڑی خوشی کی بات ہے......''

''بظاہر تو خوشی کی بات ہے ہی چاچا جی......لیکن میرے لئے بہت مشکل کا سامنا ہے''۔

اس کی باتوں سے زیادہ چوکولیٹ مزے دار تھی۔

''میرے میاں ان کے یہاں پر رضامند نہ تھے۔ ہم لوگ پیچھے سے بڑے سوکھے ہیں چاچا جی، دو پلازہ تو گلبرگ میں ہیں۔ اندرون شہر بھی پراپرٹی ہے۔ شیخ جی کہتے تھے کہ تم کو باہر جا کر کیا ملے گا۔ دھکے محنت مزدوری، بھانڈے کپڑے دھونا، آرام سے رہو...... جیسے سارے خاندان کے لوگ رہتے ہیں۔ پھر ان لوگوں کے دوست یہاں آ گئے......سکندر کو تو ڈھنگ کا کام بھی نہیں ملا، لیکن وہ واپس نہیں جاتا۔ اس کا ابھی

تک گرین کارڈ نہیں بن سکا اور وہ کبھی ایک وکیل پکڑتا ہے کبھی دوسرا۔ آج کل وہ ایک پیپر میرج کے چکر میں ہے۔"

"خود ہی تھک جائے گا اس مشقت سے تو لوٹ جائے گا وطن......"

"وہ بھی یہی کہتا ہے لیکن شیخ صاحب کی جھوک مجھ سے سنبھالی نہیں جاتی۔ وہ مجھے بدو بدی بھیج دیتے ہیں یہاں بیٹوں کو منانے...... جب میں اکیلی واپس جاتی ہوں تو گھر میں چومکھی لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔ وہ سارا الزام ہی مجھ پر دھرتے ہیں"۔

میں نے سقراط کے سے لہجے میں کہا...... "تم ایسے کرو عزیزہ۔"

"آپ کو میرا نام کیسے پتہ چلا......" وہ کھل اٹھی

"بس ایسی باتوں کا علم ہو جاتا ہے" ڈبہ پیر کے سے لہجے میں جواب دیتے ہوئے میں نے کہا...... "تم عزیزہ ایسے کرو...... اپنے شیخ صاحب سے کہو جا کر خود بچوں کو راہ پر لائیں"۔

"آئے تھے چار سال پہلے۔ ہم دونوں آئے تھے۔ پہلے منتیں سماجتیں کیں۔ پھر دھمکیاں دیں...... آخر میں عاق کرنے کا فیصلہ بھی سنایا، لیکن الو کے پٹھے مانے نہیں۔ شیخ صاحب تو بھوں بھڑک واپس چلے گئے دس دن کے بعد ہی...... میں مہینہ بھر ٹھہر کے لوٹی تب سے آج تک وہ اٹھتے بیٹھتے طعنے مہینے دیتے ہی رہتے ہیں...... ان کا خیال ہے کہ دونوں جو بھٹکے ہیں تو یہ میری کارگزاری ہے۔ بتائیں میں کیا کروں؟ بڑا تو پھر بھی لیگل امی گرنٹ ہے۔ چھوٹے کے پاس تو گرین کارڈ بھی نہیں۔ ایک حلال گوشت کی دوکان پر کام کرتا ہے اور آدھی اجرت لیتا ہے، لیکن واپس نہیں چلتا۔ کیا کروں چاچا جی۔"

میرے دل میں آئی کہ کہہ دوں، کرنا کیا ہے بی بی عزیزہ، صبر کرو شکر کرو...... اولاد کی آزمائش سہو اس عمر کے یہی میوے ہیں لیکن اس کا چہرہ دیکھ کر ہمت نہ پڑی اور میں چپ رہا۔

”وہاں لاہور میں رہتی ہوں تو ان دونوں کی یاد دل میں ٹسکتی رہتی ہے۔ یہاں آؤں تو شیخ جی کا خوف جینے نہیں دیتا...... “ شیخ جی واپسی پر کہتے ہیں، اگر بچوں نے تمہیں چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا ہے تو تم بھی انہیں چھوڑ دو...... وہ چاہتے ہیں کہ ہمیں ان کے سہارے جیوں، صرف ان کا سوچوں اور وہی میری ساری دنیا ہوں...... ان کی ڈیمانڈ بھی ٹھیک ہے۔ وہ بھی درست کہتے ہیں۔ لیکن میں بیٹوں کا تعلق کیسے توڑوں چاچا جی...... ان دونوں کو دل سے کیسے نکالوں...... کوئی ترکیب بتائیں چاچا جی......

مشورہ دینے والے کے لئے سب سے بڑا مرحلہ یہی ہوتا ہے، جب وہ جواب نہیں جانتا۔

”دراصل عزیزہ تمہارا کوئی قصور نہیں ...... یہ تعلق چیز ہی ایسی ہے۔ انسان کو بھگل کر دیتا ہے...... صوفیا تو کہتے ہیں کہ رستے کا سب سے بڑا حجاب ہی تعلق ہے۔ نہ تعلق سے دل خالی ہوتا ہے، نہ اصلی قرار دل میں آتا ہے۔ معمولی سے مہمان کے لئے کمرہ خالی کرنا پڑتا ہے۔ پھر اوپر والے کے لئے تو چھوٹا سا بت بھی اندر رہ جائے تو اس کی سواری نہیں اترتی......“

وہ کچھ نہ سمجھی

”چلو نہ جائیں پاکستان...... ان کی مرضی...... ان کو آزادی من مرضی کی عادت پڑ گئی ہے۔ یہ کہاں چلتے ہیں میرے ساتھ...... نہ سہی...... چلیں اللہ کرے میں ہی ان کے پیچھے نہ کلپتی پھروں ...... بتائیں چاچا جی...... تعلق کو توڑنے کا کوئی نسخہ جلدی بتائیں ورنہ میں تو نہ یہاں خوش نہ لہور میں۔“

اب عزیزہ کے آنسو جھرنے کی طرح بہنے لگے۔ میں نے اسے بتانا چاہا کہ ہم جیسے گوشت پوست کے بنے معمولی لوگوں کے تعلق ٹوٹا نہیں کرتے۔ کوئی ساتھ رہے یا خواب بن کر خیالوں میں بس جائے...... تعلق جان لیوا ہوتا ہے...... میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ وہ تو پھر ماں ہے اور بیٹوں کو گنوائے بیٹھی ہے۔ میں نے تو ایسے ہی ایک

بدلی بھرا اقبال پر نگاہیں جما کر عمر گزار دی...... جبکہ یہاں وہاں کبھی بھی کچھ نہ تھا۔

جمشید اور قیصر دور سے بھاگتے ہوئے میری جانب آئے۔

''نانا۔نانا...... ہم واشنگٹن ڈی سی جا رہے ہیں۔جلدی آجاؤ چاچا نثار، ہمارا انتظار کر رہے ہیں......''

''حوصلہ کرو عزیزہ ہمت پکڑو...... سوائے دعا کے میں تمہیں اور کوئی نسخہ نہیں دے سکتا۔اس عمر میں اولاد اور مال کی آزمائش آیا ہی کرتی ہے......اور جن مسائل کا حل نہ ہو،سوائے دعا کے اور کیا تجویز کروں ان کے لئے......''

''نانا......نانا......بابا...... نے کار آن کر دی ہے......''

دور سے قیصر چلایا۔

''وہ سب کو ڈانٹ رہے ہیں۔جلدی کریں......''

ہم واشنگٹن ڈی سی کی طرف جا رہے تھے۔راستے میں یو ایس راوٹ آیا، کئی ایگزٹ آئے، میجر آئے، کئی جگہ ہم نے Hov کا راستہ اختیار کیا...... باہر نظریں دوڑاتا میں سوچ رہا تھا کہ امریکہ کو یورپ والوں نے طعنے دیئے تھے کہ امریکی بھی کوئی لوگ ہیں۔جن کا نہ کوئی کلچر، نہ کوئی زبان، نہ ان کی ہسٹری، نہ ان کے آثار قدیمہ۔اس خودروگھاس جیسی جنگلی تہذیب کے مالکوں نے ثقافتی برتری والوں کا تکبر ریزہ ریزہ کر دیا۔پتہ نہیں کیا بات ہے۔جب ہم کسی میں کیڑے نکالنے کے مسلسل عمل میں ہوتے ہیں تو کہیں ہوا میں سے ان کیڑوں کا پولن ہماری اپنی ذات پر بھی جھڑنے لگتا ہے۔آج امریکہ کی جدیدیت ہی سارے پرانے کلچروں کو کھا گئی۔امریکہ کی ہسٹری ان کی سڑکیں اور بازار ہیں۔ان کی امریکن زبان ساری زبانوں کو اکھاڑے میں پچھاڑ چکی ہے۔حتیٰ کہ جو انگریزی انگریزوں کی دستار تھی، وہ بھی اسے اتار کر امریکنوں کے قدموں میں رکھ چکے ہیں۔

آسمان پر ایک چھوٹی سی اقبال مند بدلی ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔یہ بدلی

کبھی اقبال کا دوپٹہ بن جاتی، کبھی اس کے سینڈلوں کا روپ دھار لیتی...... میں سوچتا چلا جاتا ہوں۔ یہ کیسا تعلق ہے جو بلاوجہ بے نام ایک خلش کی طرح میرے ساتھ چلتا ہی چلا آیا...... اس تعلق نے میری روزمرہ کی زندگی میں کوئی کھنڈت نہ ڈالی۔ میرے گرہست آشرم کو برباد نہ کیا اور پھر بھی...... کار سے نظر آنے والے منظر کی طرح یہ ساتھ ہی رہا۔

میں نے ہال روڈ کی دوکان سے ڈیفنس کی کوٹھی تک دنیاوی زندگی کے لئے جدوجہد میں وقت گزارا اور کبھی پٹ سیاپا نہیں ڈالا پھر بھی......

نہ میرا کوئی رازداں تھا، نہ ہی کسی کو علم ہوسکا۔

اور پھر بھی......

یہ کیسا تعلق تھا اصغری؟ تم تو صرف ممتا کو سمجھ سکی ہو۔ میں تو اس تعلق کا کوئی نام بھی نہیں رکھ سکتا جو میں اقبال کے لئے محسوس کرتا رہا۔

کار تیز تھی۔

خیالات تیز تر...... میں بھی بچوں کی طرح مناظر دیکھنے سے قاصر تھا۔ میں ٹریڈ منسٹر سے ملنے ایمبسی نہیں جانا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میرے من کا موتی لانگ آئی لینڈ چلا گیا ہے۔ اگر میں جہانگیر کیگھر جا کر تصدیق کر سکتا تو بات پایہ ثبوت کو پہنچ سکتی تھی۔ لیکن میں نیتو بیٹھے بٹھائے ہیجانی من موجی فیصلہ کرلیا تھا۔ میں نے تو شاہدہ کو بھی ایک بار پھر اپنے سے دور کرلیا تھا۔ ہارون کو بھی دیکھنے میں نہ جا سکا، کیونکہ وہاں کی اقبال لانگ آئی لینڈ چلی گئی تھی۔

بلال اور ارجمند چھوٹی چھوٹی بات پر لمبی لمبی بحث کر رہے تھے۔ بچوں نے ٹیلی ویژن لگا رکھا تھا اور مناظر قدرت دیکھنے کے بجائے وہ میڈیا سے وابستہ تھے...... یکدم میں بھی ایک الٹے ٹریک پر چلنے لگا۔

کیا یہ ممکن ہے کہ لانگ آئی لینڈ جانے والی وہ اقبال نہ ہو جو آپا کی دوست

تھی؟...... بڑھاپے میں امید چھوٹی چھوٹے اشاروں سے شگوفوں میں بندھ جاتی ہے اور اس سے بھی کمتر واقعات سے ٹوٹ جاتی ہے۔ اب میرے خیال نے ایک نیا جال بننا شروع کر دیا۔ ٹریڈ منسٹر نثار کی بیوی ہی اصلی اور روڈھی ہیر ہے...... یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میں اسے ملنے جا رہا تھا۔ شاید ٹریڈ منسٹر کی بیوی ہی اصلی اقبال نکلے۔

یقیناً یقیناً یقیناً یہی اقبال اصلی ہے۔

کیا اقبال موٹی ہو چکی ہوگی......؟

کیا اس کا چہرہ جھریوں زدہ ہوگا......؟

کیا اقبال نے بال ڈائی کر لئے ہوں گے......؟ سنہری براؤن ہو سکتا ہے اس کے سامنے والے دانت ٹوٹ چکے ہوں......

یہ بھی عین ممکن ہے کہ اس کے بارے دانت نقلی ہوں......

میں نے اس وقت سکھ کا سانس لیا جب ٹریڈ منسٹر کی بیوی اقبال ہی نے دروازہ کھولا......

یہ وہ اقبال نہ تھی، جسے میں جانتا تھا۔

خوشبو میں بسی ایک بوڑھی عورت رنگ کے سیلاب میں ملبوس تھی۔ اس کے سارے تار و پود ڈھیلے اور بناوٹی تھے...... اتنے ڈھیر سارے قیمتی Props کے باوجود وہ قابل ذکر نہ تھی۔ آنٹی اقبال ہمارے لئے چائے لینے چلی گئی۔

ارجمند کو انفارمیشن دینے کا بہت شوق ہے۔ اس کی آرزو ہوتی ہے کہ وہ اخبار کی طرح ہمیشہ تازہ خبر دے، چونکا ڈالے، ہر دوائی کا علم رکھتی ہو، وہ پہننے اوڑھنے میں اتھارٹی مانی جائے۔ ارجمند نے انفرمیشن کیشوق میں امریکی زندگی کے متعلق اتنی ان گنت باتیں جمع کر رکھی ہیں کہ کبھی کبھی شبہ ہوتا ہے کہ اس کی سات پشتیں اسی سرزمین میں رہتی رہی ہیں۔ وہ نثار کا انٹرویو پیش کرتی ہے۔

"انکل تو بڑی ٹھیک ٹھاک پرسنیلٹی ہے۔ بڑی عالی شان باتیں کرتے ہیں، لیکن

وائف میں وہ سپارک نہیں''۔ کمرہ خالی پا کر ارجمند بولی۔

''کیوں''۔

''یوں لگتا ہے آنٹی اقبال سے ان کی شادی زبردستی ہوئی ہے۔ دونوں بیزار سے بیٹھے ہوتے ہیں جیسے اپنے ماضی میں کوئی معنی تلاش کر رہے ہوں......''

میں حیران ہو کر ارجمند کی شکل تکتا ہوں۔

انکل نثار؟ آنٹی اقبال۔

''تمہارے انکل نثار خوبصورت ہیں؟''

''جی ابو بہت ..... چھ فٹ ایک انچ قد ہے..... سنا ہے جوانی میں ٹینس کھیلا کرتے تھے......''

میں ذہن میں نثار کی شناخت پریڈ کرنے لگتا ہوں۔ بڑے چھوٹے سپارک سے خیال کی گاڑی سٹارٹ ہو جاتی ہے۔ دراز قد، خوبصورت، ٹینس کا کھلاڑی..... ٹریڈ منسٹر لیکن اب مجھے ٹریڈ منسٹر سے خوف نہیں آتا...... نہ اس کی ٹینس سے نہ اس کے حسن سے......

''بچے کتنے ہیں انکل نثار کے؟......''

ارجمند مسکراتی ہے...... ''پتہ نہیں دو بیٹے ہیں کہ ایک بیٹا ہے۔ بات یہ ہے ابو! یہ امریکی معاشرہ جھوٹ کا عادی نہیں...... جب ہم لوگ پہلے پہل یہاں آیا کرتے تھے تو ہم جس سے ملتے، اس کے بال بچے کا حال ضرور پوچھتے۔ پیچھے سے ہمیں عادت پڑی ہوئی تھی۔ جس سے ملنا بچوں کی بات ضرور کرنا، حالانکہ ہم تو بچوں کے نام تک نہ جانتے تھے، لیکن یہاں آ کر عادت بدل گئی۔ امریکہ میں ہم پرسنل باتیں نہیں کرتے۔ اقبال کو دیکھ لینے کے بعد مجھے ٹریڈ منسٹر کو دیکھنے کی خواہش نہ رہی...... اس کے بچے کتنے تھے، اس کی مجھے رتی بھر پروا نہ تھی۔ یہ میرے والی اقبال نہ تھی۔

واپسی پر کار میں بیٹھا سوچتا جاتا ہوں۔ معاشرتی زندگی میں امریکی تبدیلی کا

خواہاں رہتا ہے۔ یہاں کے لوگ دب دبا کے پانچ دن کام کرتے ہیں، لیکن ویک اینڈ پر ضرور بریک لیتے ہیں۔ چھٹی لینا اور چھٹی منانا ان کا بنیادی حق ہی نہیں، ضرورت بھی ہے۔ وہ ایک ریاست سے دوسری ریاست میں خوشی خوشی جاتے ہیں، نوکریاں تبدیل کرتے ہیں، حتیٰ کہ ساتھی کو تبدیل کرنا بھی ان کے نزدیک کوئی جان لیوا حادثہ نہیں۔

دراصل تبدیلی فطرت ہی کا قانون ہے...... انسان ہمیشہ بچہ نہیں رہتا۔ تبدیلی اسے نوبالغ سے بالغ اور جوانی سے بڑھاپے میں منتقل کر دیتی ہے۔ ایک مدت حالات کی تبدیلی، پیدا نہ ہو تو انسان کی نہ صرف طبیعت پتھریلی ہو جاتی ہے، بلکہ بسا اوقات اس کی خوبیاں بدل کر خرابیوں میں بدلنے لگتی ہیں۔ مدتی غریبی اور غیرت کے ہاتھوں پسنے والے نادار طبیعتاً کنجوس ہو جاتے ہیں۔ اگر ان کے حالات خوشگوار بھی ہو جائیں تو ان کا بٹوہ نہیں کھلتا۔ وہ دوسروں کو ہنستا کھیلتا دیکھ کر چڑتے رہتے ہیں اور ان کے نزدیک صاف ستھری خواہشیں بھی قابل احترام نہیں رہتی۔ اپنی خواہشات پر صبر کا ڈھکنا تا دیر بند رکھنے سے وہ اپنے نفس پر ظلم کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ لوگ جنہوں نے مدتوں سخت حالات کا مقابلہ کیا، وہ شقی القلب بھی ہو جاتے ہیں۔ انہیں نہ اپنے پر ترس آتا ہے، نہ دوسروں کے آنسو گرتا دیکھ کر انکے دل پگھلتے ہیں۔ اگر ڈاکٹروں ہی کی مانند یہ دوسروں کے دکھ درد میں شریک بھی رہیں تو بھی انکے دل پسیجتے نہیں اور ان میں رقت پیدا نہیں ہوتی۔ اس طرح قوت برداشت اور صبر کی سل سینے پر رکھنے والے رحم دلی جیسی نعمت سے خالی ہو جاتے ہیں اور ان کی قوت برداشت کی خوبی خرابی میں بدل جاتی ہے۔ یہی زندگی کا سب سے بڑا اچنبھا ہے کہ کیسے نیکی بدی میں اور بدی نیکی میں بدلتی رہتی ہے۔ کیسے انسان کی خوبی ہی اس کی خرابی بن جاتی ہے اور اس کی خرابی ہی میں خوبی کی گنجائش رہتی ہے۔

جو عورت اپنی مجبوری یا کسی مرد کی مجبوری کی وجہ سے استحصال کا مرکز بنتی ہے۔ اگر

بار بار وہ مرد کی شہوت کا شکار ہوتی رہے اور مدتوں استحصال کا نشانہ بنی رہے تو اس کی نسائیت کی نرمی، حیا، پاک بازی جیسی خوبیاں ہولے ہولے اسے ظلم کی طرف مائل کرنے لگتی ہیں اور وہ پتھر دل بن کر مرد کا استحصال کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ مدتوں طوائف بنے رہنے سے مظلوم سے ظالم بننے کا عمل پیش آتا ہے اور وہ تمام نرم دل کیفیتیں جن سے عورت کے دل میں چراغاں رہتا ہے، اندھیرا بن کر ڈسنے لگتا ہے۔

امریکہ نے اعتدال پر آنے کے لئے تبدیلی کا نسخہ تجویز کر رکھا ہے۔ وہ "Move On" کی پالیسی پر عمل کرتے ہیں۔ سفر کو وسیلہ ظفر جان کر دور دراز ملکموں میں رمتے جوگی بن جاتے ہیں ...... امریکن طرز کہن سے چڑتا ہے، آئین نو کو خوش آمدید کہتا ہے۔ اسی تبدیلی کے ہاتھوں اپنی خوبی کو خرابی میں بدل جانے سے بچاتا ہے۔ وہ وفا کو بہ شرط استواری استعمال نہیں کرتا، بلمکہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ بے وفائی سے زندگی میں تازگی رہے۔ درست علاج ہو یا نہ ہو، درد کم سے کم رہے۔ وہ ماں کا دن مناتا ہے ...... باپ کا ڈے مناتا ہے۔ بوڑھے لوگوں کا سال Celebrate کرتا ہے...... لیکن انہیں اپنے پر سوار نہیں کرتا۔

امریکہ میں تبدیلی بھی ترقی کا ہی ایک راستہ ہے...... تبدیلی بہتر سے بہتر کی تلاش میں تو مدد دیتی ہے، لیکن شاید فلاح اس راستے پر نہیں ملتی۔ تبدیلی اس بات کی متقضی ہے کہ انسان میں خواہش پیدا ہو ...... خواہش کبھی مرنے نہ پائے۔ خواہشات کو ابھارنے کے لئے بازاروں یک جنگل میں۔ ابلاغ ہے۔ ذرائع آمد و رفت کا لمبا چوڑا سلسلہ ہے۔ امریکی کبھی خواہش سے خالی ہونا نہیں چاہتا...... بدلتی خواہش اسے ترقی کے زینوں پر اوپر چڑھنے میں مدد دیتی ہے۔

لیکن کیا کسی کے دکھ سکھ میں شریک ہوئے بغیر کوئی اصلی تبدیلی آسکتی ہے؟ کیا مسلک، مذہب، خیال، تحریک صرف علم کے سہارے ممکن ہے؟ کیا نبی کے بغیر، اس کی شفقت کی روشنی نہ ہوتے ہوئے صرف کتاب سے مذہب کی تبدیلی ممکن ہے؟ کیا

استاد، گرو، مرشد کے بغیر انسان علم کو عمل میں ڈھالنے کی تبدیلی لا سکتا ہے......؟ ترقی اور فلاح میں تبدیلی بھی مختلف ہے۔ فلاح کے راستے پر اپنی خواہش بدلنا نہیں پڑتی، بلکہ اسے ایک ہی سمت میں رکھنا پڑتا ہے۔ اس بظاہر جامد خواہش کے باوجود فلاح پانے والا تبدیلی سے آشنا رہتا ہے، لیکن بقدر ضرورت۔ ہر وقت کی اکھاڑ پچھاڑ اس کا پیچھا نہیں کرتی۔

واشنگٹن میں جو کچھ گزری، اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ واشنگٹن سے واپسی پر میں ایک بار پھر سوالوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ بیلکونی میں بیٹھ کر میں سڑکوں پر نگاہ دوڑاتا پھر تقابلی سوچ کے حوالے ہو گیا۔ یہ سلسلہ تکلیف دہ بھی تھا اور وقت بھی اس کے سہارے آرام سے گزر جاتا تھا۔

مشرق میں ابھی تبدیلی سے اتنی محبت پیدا نہیں ہوئی۔ تبدیلی ہمیں خوفزدہ کرتی ہے ...... ہم صابرین اور شاکرین میں سے ہونا چاہتے ہیں۔ ہم مابعد اور آخرت میں اپنا حصہ لینا چاہتے ہیں۔ یہی وہ بنیادی فرق ہے جس کے باعث پھر کہنا پڑتا ہے کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب اور یہ دونوں کبھی مل نہیں سکتے۔

امریکن خواہش کو تازہ دم کرتے ہیں۔ تبدیلی سے اپنے آپ کو انگیخت کرتے ہیں۔ خرابی اور خوبی کو ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ یہ تبدیلی انہیں مسابقت کی طرف کھینچتی ہے۔ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں مبتلا رہتے ہیں۔

مشرق کو جاہل کہہ لیجئے۔ کم علم، ناعاقبت اندیش سمجھ لیجئے ...... دلدل میں دھنسا ہوا مشرقی انسان مکمل طور پر روایت کو نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ اپنی لوک ریت، رسم و رواج سے محبت کرتا ہے...... شاید وہ دکھ سہتا سہتا اپنی خرابیوں میں راسخ بھی ہو جاتا ہے، لیکن فلاح کی منزل دھندلاتی نہیں۔ سائنس سے دور، ہر لحظہ کی تبدیلی سے ناآشنا، اس کے صبح و شام ایک سے گزرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ مذہب سے وابستہ رہ کر صبر کی ڈھال آگے رکھ کر چلتا رہتا ہے۔ عام انسان کو مذہب کی اصلیت سے چاہے آگاہی ہو، نہ ہو

وہ قبر پرستی، تعویز گنڈے، پیر حضوری میں دن گزارتے ہوئے ہولے ہولے غلاظت کے ڈھیروں میں گزرتے ہوئے مست اور مجذوب کے مرحلوں سے واقف، جسم پر رنگ برنگ منکوں کی مالائیں سجائے فقیر کو سامنے پا کر مشرقی انسان کو اپنی تمام تر بدنصیبی کے باوجود یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ دنیا دارالمحن ہے۔ یہاں انسان کا امتحان مقصود ہے اور اصلی حیات مابعد سے شروع ہوتی ہے۔ کوئی تبدیلی سفر آسان نہیں کر سکتی۔ کسی قسم کی ترقی انسان کو مکمل طور پر پرسکون، قناعت پسند، مسرت آشنا نہیں بنا سکتی۔ جب تک اوپر والے کا فضل نہ ہو، کچھ بھی مثبت نہیں ہوتا۔

سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور مغرب میں غروب ہو جاتا ہے۔ دونوں الگ الگ وقت کے تابع ہیں۔

مشرق تبدیلی کا خواہاں نہیں، استواری کا دلداوہ ہے۔

مشرق میں خواہش کو دبانے کا عمل ہے مغرب میں ابھارنے کا......

یہاں عقیدہ اہم ہے اور وہاں قاعدہ......

دونوں میں فرق اتنا زیادہ ہے کہ یہ دونوں راضی نامہ نہیں لکھ سکتے ...... اور اگر کبھی مشرق نے مغرب کی سوچ میں ضم ہونے کی کوشش کی بھی تو اس کو مذہب سے ہاتھ دھو کر فلاح کا راستہ چھوڑ کر یہ منزل مل سکے گی...... پھر شرمندگی، احساس گناہ، بے حیائی کا نیا سفر ہوگا اور مشرقی لوگ......

کبھی کبھی میں سوچا کرتا ہوں کیا ترقی کی اس قدر قیمت ادا کرنا درست ہے؟ کیا آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کے قرضوں کی طرح معمولی انسان بھی صرف تبدیلی کی قسطیں ادا کرتا فوت ہو جائے گا......؟ نہ ترقی حاصل کر پائے گا، نہ فلاح...... نہ حال کی ترقی اس کی ہوگی، نہ مابعد کی۔ ہم کیوں نہیں جان پائے کہ انسان کلی طور پر کبھی بھی مادیت میں ضم نہیں ہو سکتا۔ غالباً یہ مشیت کی منشا بھی نہیں۔

یہ تب کی بات ہے جب اصغری زندہ تھی اور جہانگیر شاہدہ کے گھر شفٹ نہ ہوا تھا۔

وہ دونوں ہنستے کھیلتے باہر نکلتے لیکن جب تک جہانگیر اور شاہدہ بند کمرے میں ہوتے، بڑی خوفناک آوازیں آتی رہتیں۔

''تم پکے حرام زادے ہو......'' کونونٹ کے لب ولہجہ میں بجلی کے لشکارے جیسی آواز آتی، آگے کچھ منمنا سا جواب ملتا جیسے طالب علم کو غلط جواب نکالنے پر حساب کے استاد کا خوف دامنگیر ہو......

''الو کے پٹھے اگر یہی تمہارا معیار زندگی تھا تو مجھے کیوں بیاہ کر لائے تھے......؟''

باوجودیکہ دونوں کمروں کے درمیان صرف کھلے دروازے کا حجاب تھا۔ بگی داڑھی والا میں ہمایوں فرید جواب نہ سن پاتا اور اپنے بیٹے کی آواز مجھ سے پہچانی نہ جاتی۔

''اور تمہارا یہ باپ؟ ہوگا کوئی بڑا امپورٹ ایکسپورٹ والا...... مجھے اس کی تڑی نہ دینا۔ میں کسی سے نہیں ڈرتی......وہ بھی کسی ریٹائرڈ اولڈ فول سے...... میرے باپ کا تم لوگ کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتے ...... ہی از اے بزنس ٹائی کون...... جانتے ہو بزنس ٹائی کون کیا ہوتا ہے۔ جانتے ہو سٹوپڈ۔''

''ہم کب مقابلے کی سوچتے ہیں......'' آگے پھر جہانگیری آواز منمنا جاتی۔

''میں دیانت داری کو نہیں جانتی۔ یہ کم عقل...... نالائق للو قسم کے لوگوں کے بہانے ہیں۔ جو نہ زندگی میں کچھ بن سکے اور نہ ہی ان کا بننے کا کچھ ارادہ ہو......تم خوفزدہ، نن کم پوپ، چھوٹے اور ٹوٹے ہوئے آدمی ہو۔ یاد رکھو اگر تم نے جلد کچھ نہ سوچا تو میں جا بھی سکتی ہوں۔ مجھے اس گھر سے ویسے بھی کچھ نہیں لینا دینا۔ باسٹرڈ......'' یہ میری بہو شاہدہ کا میزائلی حملہ تھا۔

یہی وہ وقت تھا جب میں نے اپنا کمرہ اوپر والی منزل میں منتقل کر لیا۔ اصغری اور میں شاہدہ کی باتیں سن کر سو نہیں سکتے تھے۔ نیند کی گولیاں کھا کر بھی مجھے ساری ساری رات نیند نہ آتی۔ نیند تو غالباً جہانگیر کو بھی نہیں آتی تھی، لیکن وہ جوان تھا اور ابھی اپنی آئی ایم ایف جیسی بیوی کے آگے حال احوال بیان کرنے کا اہل تھا۔ جہانگیر اب مجھے

خمیدہ کمر Shuffle کرتا ہوا بوڑھا بوڑھا نظر آتا تھا۔

پھر اچانک جہانگیر نے ڈاکٹری چھوڑ کر مقابلے کے امتحان میں داخلہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔ بہار کے دن تھے۔ آڑو اور آلوچے کے شگوفے لان میں پھول رہے تھے۔ ہوا میں آزاد پرندوں کی چہک اور پھولوں کی خوشبو تھی۔ لان میں امریکی Sprinkler آہستہ آہستہ جھولتا فوارے کی طرح بوندیں چھوڑ رہا تھا۔ اس مصنوعی فوارے کی پھوار میں چڑیاں نہانے کی کوشش میں تھیں۔ کئی دنوں سے میری جہانگیر سے تفصیلی ملاقات نہ ہوئی۔ وہ دونوں ہمیں رسمی سلام کرکے اپنے پروگرام میں نکل جاتے۔

اصغری کچھ وقت ارجمند کو یاد کرنے میں بسر کرتی۔ پھر ڈرتے ڈرتے ہارون کو دیکھنے نیچے جاتی۔ اب کچھ عرصہ سے وہ ہارون کی زیارت کرنے بھی نیچے نہ گئی تھی...... اصغری کو اپنی ہائی جین پر بھروسہ نہ تھا، اس لئے وہ ہارون کو اٹھانے سے پرہیز کرتی۔

میں نائی کی دوکان پر خط بنوانے کے لئے گیا تھا، لیکن حسن اتفاق سے دوکان بند تھی۔ میں نے واپس آکر ارجمند کا بھیجا ہوا سیل والا استرا نکالا اور اپنی بگی داڑھی کو ہموار کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے دراصل عینک کے ساتھ بھی اپنا چہرہ آئینے میں صاف ستھرا نظر نہ آتا۔ عینک کا آخری نمبر بھی ناکافی تھا اور اب میں لنز کے ساتھ صبح کا اخبار پڑھتا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے استرا بند کیا۔

سامنے جہانیر کھڑا تھا۔ جب اس کی شادی ہوی تو اس کا قد پانچ فٹ گیارہ انچ تھا۔ رنگ سفیدی مائل گندمی آنکھیں روشن اور مسکراتی ہوئی۔ اب وہ درمیانے قد، سانولے چہرے اور اداس آنکھوں والا نوجوان تھا۔ باڈی بلڈنگ کے شوقین جہانگیر کے کندھے خمیدہ، دانت زرد اور ناخن میلے تھے۔ اسے دیکھ کر یبوست منحوسیت کا خیال آتا۔

''آؤ آؤ......''

''آپ داڑھی Trim کر رہے تھے بابا......''

''ہاں ہاں...... بڑا مزہ آتا ہے۔ خلیفہ کے پاس جانا نہیں پڑتا۔ کم از کم ایک سہارے سے چھٹی ملی......''

''میں آپ کا خط بنا دوں......''

''نہیں نہیں...... میں تو ایسے ہی شوقیہ داڑھی بناتا ہوں، ورنہ وہ خلیفہ رزاق بڑا اچھا خط بنا دیتا ہے......''

''کچھ زیادہ ہی اچھا بنا دیتا ہے آپ کا خط۔ مولوی سے نظر آتے ہیں۔ میں ٹرم کر دوں داڑھی فرانسیسی شاعر لگیں گے؟''

میں جی سے چاہتا تھا کہ جہانگیر میرا خط بنا دے، لیکن اندر ہی اندر شاہدہ سے پتہ کیوں خوفزدہ تھا۔ نہ جانے اسے اچھا لگے یا نہ لگے...... نہ جانے یوں باپ بیٹے کے قریب آنے پر وہ کیا سمجھے؟ میں کچھ اسے بخار رہا ہوں۔ اپنے جال میں پھنسا رہا ہوں۔

''میں آپ سے مشورہ لینے آیا تھا...... ایک''

''ضرور ضرور......'' ہنس کر میں نے کہا......'' اس عمر میں ہم اور دے بھی کیا سکتے ہیں۔ ہمارے پاس سوائے مشورے کے اور دینے والی کون سی چیز ہے؟ آؤ بیٹھو......''

''وہ جی میں نے سوچا ہے کہ میں...... سی ایس ایس کرلوں...... میں...... شاید اچھا ڈاکٹر ثابت نہیں ہو سکتا...... پھر نہ اس میں اتھارٹی ہے نہ پیسہ......''

میں غسل خانے سے نکل کر باہر آ گیا۔ مجھے جوانی والی اصغری بھول چکی تھی، لیکن اتنا ضرور یاد تھا کہ جہانگیر کی تعلیم کے لئے جوان اصغری نے بڑے پاپڑ بیلے تھے۔ اسے ڈاکٹری تک پہنچانا پھر ہاؤس جوب کے لئے سفارشیں تلاش کرنا...... شادی کا مرحلہ یہ اصغری جیسی دھان پان کے لئے ماؤنٹ ایورسٹ فتح کرنے کے مصداق تھا۔ خیر شادی تو جہانگیر نے اپنی مرضی سے اپنی ہی ہم جماعت سے کی، لیکن اسے ڈاکٹر بنانے میں ہم میاں بیوی کے کئی سال امید و بیم میں کٹے۔ اپنی کئی خوشیاں قربان کرنے کے

بعد یہ راحت ہمیں نصیب ہوئی کہ ہمارا بیٹا ڈاکٹر بن گیا۔

''تمہارا اچھا بھلا کیریئر ہے.....تم اسے کیوں چھوڑنا چاہتے ہو......'' میں خوفزدہ ہو گیا۔

''میں ...... اچھا ڈاکٹر نہیں ہوں ابا۔ میں Organized نہیں ہوں۔ میری شخصیت Focused نہیں...... میں......مجھ میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہے ...... میں مقابلہ نہیں کرسکتا، نہ کسی فرد کا نہ سوسائٹی کا، ترقی کا راز مسابقت میں ہے۔ میں ساری عمر سرکاری نوکری کروں گا چھوٹے چھوٹے ہسپتالوں میں ...... کبھی پرائیویٹ کلینک نہ بنا سکوں گا اپنا''۔

''خواہ مخواہ ہم کسی سے کم نہیں۔ میں نے نہ کبھی کوئی ٹٹ پونجیا دوست بنایا نہ کسی غریب رشتہ دار کو پاس پھٹکنے دیا، کس لئے؟ تاکہ تمہارے راستے میں کوئی حائل نہ ہو......''

''میں پر اعتماد نہیں ہوں......'' جہانگیر بولا۔

''یہ تم سے کس نے کہا.....تم پڑھائی میں ہمیشہ پہلے چار پانچ لڑکوں میں آتے رہے ہوں...... اگر اعتماد نہ ہوتا تو کیا یہ ممکن تھا......''

''نہیں ابو...... پڑھائی میں اول، دوئم آنا کوئی معیار نہیں ہے۔ ہر کتابی کیڑا ایسے کر سکتا ہے.....میرے کوئی دوست نہیں۔ میں محفل میں روانی سے پر اعتماد طریقے سے بات نہیں کرسکتا۔ میں سیاست، معیشت، محفلی گفتگو سے نا آشنا ہوں۔ میں اپنی ہی کلاس فیلو کے پروں میں چھپ گیا۔ اس نے کیا آرام سے فائنل امتحان نہیں دیا، لیکن نہ اسے کوئی احساس جرم ہے، نہ ہی اس کے اعتماد میں کمی آئی ...... اب جب ہماری شادی ہوگئی ہے ابو تو میں ہر معاملے میں اس سے ہنٹ لیتا ہوں۔ اس سے کیوں حاصل کرتا ہوں۔ میں کسی معاملے میں اسے کچھ ڈکٹیٹ نہیں کرسکتا۔ جب میں شاہدہ کے گھر فنکشنز پر جاتا ہوں تو میں بالکل Oddman Out ہوتا ہوں۔ پر اعتماد

شخصیت کے لئے جو کچھ درکار ہے۔ وہ مجھ میں نہیں ہے۔ ابو، مان لیں ...... وہاں میں الو باٹا محسوس کرتا ہوں۔ للو سا۔ آپ کی اور بات ہے۔ آپ سیلف میڈ آدمی ہیں۔ آپ نے ٹھونک بجا کر زندگی سے دست پنجہ ملا کر زندگی بسر کی ہے۔ مجھے تو آپ نے روئی میں لپیٹ کر چوزے کی طرح پالا ہے...... میں کچھ نہیں کر سکتا"۔

میں نے بڑی شفاف، با اصول، پر اعتماد زندگی بسر کی تھی۔ میرے ہاتھوں پر سفارش، رشوت، بینکوں کے روپے پیسے کے خرد برد کا کوئی لہو نہیں تھا۔ میں ہمیشہ اپنی ہمت اور کام کام سے آگے بڑھا۔ میں نے نہ کبھی بزنس میں دو نمبر کام کیا، نہ کبھی پی آر کو اپنایا، نہ ہی کسی سیاسی دباؤ، ہتھکنڈے اور ہیر پھیر سے کچھ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ میں ایک ایسا کردار تھا جسے شاید قائد اعظمؒ پسند کرتے لیکن اب تو یہ سند بھی قابل اعتماد نہ رہی تھی۔ اصغری کے سگھڑپنے ڈیفنس میں چار کینال کی کوٹھی بن گئی۔ تھوڑی سی سیانی، کافی محنتی اور چپ چاپ سی اصغری اور جہانگیر جیسے نیک دل بیٹے کو میں نے حاصل کر لیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں نے اپنی اننگز بڑی شفاف کھیلیں۔ لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ زندگی سے جو بھی مائع کشید کریں اس میں تلچھٹ ضرور ہوتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ بڑھاپے کے گلاس میں یہ درد را مواد بڑھتا جاتا ہے۔

"آپ کیا سوچ رہے ہیں ابو......؟"

"کچھ نہیں کچھ نہیں بیٹے......"

شادی سے پہلے جہانگیر ماں کا لاڈلہ، اکلوتا، من چاہا تھا۔ اصغری تو چھپا چھپا کر بعد میں بھی بیٹے کے گرد طواف کرتی رہی، لیکن جہانگیر کے رویے میں سرد مہری آ گئی تھی۔ وہ جہانگیر جو کالج سے واپسی پر ماں کو گود میں اٹھا کر چکر پھیریاں دیا کرتا تھا، کہیں نظر نہ آتا۔ وہ سرد مہری سے ماں پر نظر ڈالتا۔ اس کے کسی التفات کا نوٹس نہ لیتا ...... ماں اس کے لئے ایک فالتو چیز بن گئی تھی۔ شادی کے بعد اس کا نظریہ اپنی ماں کے متعلق بدل گیا تھا۔

''آپ مائینڈ نہ کریں ابو تو ایک بات کہوں''

''کہو...... کہو...... بلکہ ضرور کہو۔ باتوں کو دل میں نہیں رکھنا چاہئے۔ اس سے جزیشن گیپ بڑھتا ہے...... خاص کر بزرگوں پر تو اپنا نکتہ نظر ضرور واضح کرنا چاہئے لیکن احترام کے ساتھ......''

''بیچاری امی نے میری تربیت ٹھیک نہیں کی۔ انہوں نے مجھے اتنا ٹوکا، اس قدر راہیں بند کیں میری کہ میں آج کی ماڈرن مسابقت بھری زندگی کے قابل نہیں رہا۔ شام کو سات بجے گھر آؤ...... نماز پڑھو، روزے رکھو...... ابو کے آگے خبردار بولے...... بڑوں کو سلام کرو...... پلیٹ ثاف کرو جیسے مکے میں جھاڑو پھیرتے ہیں۔ نہا کر سکول جاؤ۔ کوئی ایک آڈر ہوتا تھا امی کا...... کوئی دوست نہ بننے دیا۔ کوئی رات باہر نہ گزارنے دی...... اب یہ حال ہے کہ کسی نئے ماحول میں جاؤں تو ہاتھوں میں پسینے آجاتے ہیں۔ ٹانگیں کانپنے لگتی ہیں۔ کوئی کام کروں، لگتا ہے غلط کر رہا ہوں۔ Conecntration کا یہ عالم ہے کہ ادھر بات کرتا ہوں، ادھر بھول جاتا ہوں...... آپ کو کیا معلوم ابو...... کبھی تو مجھے شبہ ہوتا ہے کہ میں مریضوں کو درست دوا بھی لکھ کر نہیں دے رہا...... اس طرح تو میں دس پتی رہ جاؤں گا ابو...... موٹی عینک والا پرچیاں لکھنے والا ہٹی ڈاکٹر...... جس کے خلاف مریض اخباروں میں خط لکھتے ہیں''۔

''لیکن سی ایس ایس کر کے کیا ہوگا...... وہاں بھی تو اتنی ہی تنخواہ ہوگی جہانگیر...... ڈاکٹر اور سی ایس ایس افسر کا ایک ہی گریڈ ہوتا ہے......''

جہانگیر نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں مزید نہ بول سکا۔ میرے اندر ڈاٹ لگ گیا۔

''گریڈ ایک ہی ہوتا ہے ابو، لیکن اتھارٹی سول سرونٹ کی زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی پاورز کا کیا مقابلہ۔ آپ کو معلوم نہیں ابو، سیاسی لوگوں کے ساتھ جوڑ توڑ کر کے میں کہاں سے کہاں پہنچ جاؤں گا۔ شاہدہ کا خیال ہے مجھے سیاست میں جانا چاہئے......

وہی میرا آخری کیریئر ہوگا...... اصلی طاقت اصلی پاور وہیں ہے......''

ڈنڈوت کے سے انداز میں صوفے پر میں آگے ہوگیا۔ مجھے پرانے ماہ وسال یاد آرہے تھے۔ شاہد بھائی کی دوکان پر بیٹھ کر میں نے آہستہ آہستہ اپنے لئے الیکٹرونک گڈز امپورٹ کرنے کا ایک لمبا چوڑا بزنس تیار کرلیا تھا۔ اس میں کئی پڑاؤ آئے تھے۔ ہال روڈ سے گلبرگ اور وہاں سے ڈیفنس تک کئی ناکامیاں بھی ہوئی تھیں۔ نقصانات بھی سہے تھے، لیکن مجھے اپنی لائن چھوڑنے کا کبھی خیال نہ آیا۔

''تم محنت کرتے چلے جاؤ جہانگیر...... برکت اللہ ڈالے گا''۔

اصغری کی ریاضتیں میری نگاہوں میں گھوم رہی تھیں......

''ہمیں پاور سے کیا لینا ہے بچہ...... ہم کو سیاسی جوڑ توڑ سے مطلب...... ہم نے کفایت سے گزارہ کیا...... ایک پائی قرض مجھ پر نہیں ہے۔ کبھی پاور کا تصور بھی میرے دماغ میں نہیں آیا...... دیکھ لو کسی سے کم نہیں...... آرام دہ گھر ہے...... تعلیم یافتہ بیٹا بیٹی ہے...... اللہ رسول کا نام ہے اور کسی کو کیا چاہئے...... دنیا بھی ملی اور دین بھی، ترقی بھی ملی اور فلاح بھی۔ ہمارے نبی ﷺ تو دو جہاں کے بادشاہ ہیں، وہ ہمیں بھی دونوں جہان دلواتے ہیں......''

جہانگیر کو لگا جیسے باپ نے اس کے ماتھے میں ڈالا مار دیا۔

''یہ آپ کی سوچ تھی، ابو جس نے مجھے مروا دیا۔ یہی آپ کی قناعت پسندی تھی جس نے مجھ سے میرے ترقی کے خواب چھین لئے...... آپ اور امی تو اتنے قابض تھے میرے جسم پر...... میری روح پر...... کہ میں سانس بھی آپ کو خوش کرنے کے لئے لیتا تھا...... آپ کا بس چلتا تو مجھے روئی میں لپیٹ کر پالتے...... فیڈر سے اب تک دودھ پلاتے...... خود نہلاتے...... منہ میں چوسنی ڈالتے اپنے سامنے رکھتے...... ابو یہ محبت نہیں ہے جو آپ نے مجھ سے کی...... پر قینچ پرندہ...... ہوں میں زخمی پرندہ...... آپ نے شہباز کے ناخن کاٹ دیئے ہیں اور اب اس سے شکار کرنے کی امید

رکھتے ہیں..... ایسے نہیں چلے گا..... ایسے چل نہیں سکتا..... میں دیوانہ ہو جاؤں گا.....
یہ گھر ہے؟ آپ نے گھر دیکھے نہیں..... نہ آپ کا کوئی Exposure تھا، نہ آپ نے
مجھے آنکھ کھول کر کچھ دیکھنے دیا ابو..... میں..... بدحواس خبطی ہوں..... میں شاہدہ کے
لئے کچھ نہیں کر سکتا..... وہ ٹھیک کہتی ہے، آپ دونوں بڈھوں نے مجھے Passivity
سکھا دی ہے..... میں Fight Back نہیں کر سکتا..... مجھے سی ایس ایس کرنا پڑے
گا ابو..... ورنہ میں پیچھے رہ جاؤں گا ہر دوڑ میں.....''

''پیچھے رہ جانے سے تمہاری کیا مراد ہے جہانگیر؟..... ترقی کی دو قسمیں ہوا کرتی ہیں
..... ایک دنیاوی، دوسری روحانی..... ایک مادی ترقی، دوسری فلاح دارین.....''

''آپ شاید سمجھ نہیں رہے ابو..... زمانہ قیامت کی چال چل رہا ہے اور آپ ابھی
گڈے کی سواری میں خوش ہیں۔ یہ رفتار کا زمانہ ہے ابو۔ جو بیٹھ کر سوچتا رہے گا، وہ
پیچھے رہ جائے گا۔''

''تمہاری تعلیم اچھی ہے، اگر کوشش کرو تو ایف آر سی ایس بھی کر سکتے ہو..... دیکھتے
نہیں، آج کل ڈاکٹروں کی آمدنی کتنی ہے؟..... تم باہر جا کر ابھی بھی اپنی تعلیم بہتر
کر سکتے ہو''۔

''ان ڈاکٹروں کی ابو..... جن کے ریسورس ہیں..... جو پرائیویٹ کلینک بنا سکتے
ہیں۔ میرے جیسے ڈاکٹر تو مشکل سے ہٹی چلا سکتے ہیں۔ بازار میں دوکان ڈال سکتے
ہیں.....''

''شروع شروع بازار میں دوکان چلانا کوئی برائی نہیں جہانگیر.....''

''یہی تو آپ کی مشکل ہے ابو..... نہ آپ سٹیٹس کو سمجھتے ہیں، نہ دولت کو، نہ ماڈرن
لائف کو..... آپ ابھی ایک اور عہد میں جی رہے ہیں جہاں دولت ہوتی ہے، لیکن
معیار زندگی نہیں ہوتا۔ جہاں سب کچھ ٹھہرے پانیوں کی طرح جامد و ساکت رہتا ہے
..... یہ زندگی ہے، زندگی ہے یہ..... چل کر شاہدہ کے گھر دیکھیں۔ ادل بدل، یہ جاوہ آ

.....مصروفیت، سوشل لائف، رفتار..... آپ نے مجھے اور ارجمند کو اردو میڈیم سکول میں پڑھایا۔ ہم نے اقبال غالب کے نام تو سن لئے، لیکن ہمیں وہ گفتگو بھی نہ آسکی جو آج کل اردو میڈیم Elites کرتے ہیں۔ لیکن ہم وہ باتیں بھی نہیں کر سکتے جو اقبال غالب والے کرتے ہیں۔ آپ نے میں نہ سیر و سیاحت کا شوق ڈالا، نہ ہمیں معلوم ہو سکا کہ باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ سکول سے گھر..... گھر سے کالج ..... ہر وقت واپس گھر گھر گھر ..... کسی دوست کو گھر نہیں لا سکتے، کسی کے گھر جا نہیں سکتے ..... آپ اسے تربیت سمجھتے ہیں۔ آپ سمجھتے تھے میں لڑکی ہوں جسے چادر اور چار دیواری میں بند کر کے آپ درست کر رہے تھے۔ سچ بتائیے میں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا کہ آپ نے مجھے یوں لڑکیوں کی طرح پالا؟ کیا آپ نے مجھے شریف بناتے بناتے خصی نہیں کر دیا؟..... مجھ سے میری مردانگی نہیں چھین لی.....؟ میں مرد ہوں؟ مردوں کی یہ ہمت ہوتی ہے۔ مرد ایسے بزدل ہوتے ہیں..... اپنی بیوی سے ڈرنے والے؟"

میں بھی ساری عمر دو کانسے گھر اور گھر سے دفتر جاتا رہا تھا۔ میں سر جھکا کر بیٹھ رہا۔ کانٹوں سے محفوظ رہنے، اندر اور باہر کے شر سے پناہ حاصل کرنے کا مجھے اور کوئی طریقہ بھی نہ آتا تھا۔ اسی گر کے ساتھ میں نے جہانگیر کی پرورش کی۔ یہی وہ آخری جنگ تھی جو سعادت مند جہانگیر نے مجھ سے لڑی اور عین اس لڑائی سے تیسری رات جب میں اور اصغری داتا دربار گئے ہوئے تھے، وہ اپنے بیٹے ہارون اور شاہدہ کو لے کر اپنے سسرال چلا گیا اور اسی ایس ایس کی تیاری کرنے لگا۔ داتا دربار سے لوٹے تو اس کا رقعہ ملا۔

"اماں..... میں آپ سے مل کر اس لئے نہیں جا سکتا کہ پھر میں یہ گھر چھوڑ ہی نہیں سکتا۔ یہاں رہ کر میں سی ایس ایس کی تیاری نہیں کر سکتا۔ آپ کی نگاہیں اور ابو کی باتیں مجھ میں احساس جرم پیدا کریں گی۔ میں آتا جاتا رہوں گا۔ آپ بھی پلیز ہمیں ملنے آیا کریں..... امید ہے آپ سمجھ جائیں گے۔

اس رقعے کے بعد ہم دونوں دیر تک چپ چپ بیٹھے رہے، نہ جانے کیوں مجھے اچانک ارجمند بھی بہت یاد آئی ...... ہم دونوں اتنا تو سمجھ گئے تھے کہ بچوں کی پرورش میں ہم سے کہیں غلطی ہوگئی تھی، ورنہ وہ دونوں ہمارے ساتھ رہنے پر رضامند رہتے۔

مجھ سے قریباً پچیس سو سال پہلے کپل وستو کے راجہ شدودھن نے بھی یوں ہی سوچا تھا۔ وہ گوتم قبیلہ کا راجہ تھا، وہ علاقہ جو آج نیپال کہلاتا ہے، یہاں ہی کپل وستو کے مقام پر اس کی مہارانی مایا نے سدھارتھ کو جنم دیا جو پہلے گوتم پھر سدھارتھ رفتہ رفتہ شاکیا منی اور انتم میں بدھا کہلایا۔ بدھ کی پیدائش سے کچھ عرصہ بعد مہارانی مایا فوت ہوگئی اور سدھارتھ کی پرورش کا ذمہ دار راجہ شدودھن ہی ٹھہرا۔ شدودھن راجہ جو کھشتری تھا اور شاکیا منی تھا، اپنے بیٹے گوتم کے لئے اس درجہ متفکر اور بدحواس تھا کہ اس نے ہر طور کوشش کی کہ پر دکھ درد کے دروازے بند رکھے۔ بڑھاپا، بیماری، موت کے مناظر محل کے اندر داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ کسی مرجھائے ہوئے پھول کو ٹہنی پر رہنے کی اجازت نہ تھی۔ کانٹوں کو شاخوں سے اتار دیا جاتا، لیکن زندگی کا منفی Exposure نہ ہونے کے باعث گوتم سوچنے پر مجبور ہوگیا۔ جس منفی سوچ کو راجہ نے محل سے نکالا تھا۔ وہی سوچ سدھارتھ کے تخیل میں جا بسی۔ شدودھن کی اس خود ساختہ جنت سے بدھا کا دل اچاٹ ہوگیا۔ حضرت آدم کی کہانی ایک بار پھر دوہرائی گئی اور ایک رات سدھارتھ انتیس برس کی عمر میں رانی یشودھرا اور اپنے بیٹے کے پہلو سے نکلا اور جنت کی خوشیوں سے دبے پاؤں غم سے بوجھ زندگی کی تلاش میں نکلا۔

بدھا جاننا چاہتا تھا کہ کس طرح دکھ کو جڑوں سے اکھاڑ کر پھینکا جا سکتا ہے، دکھ کا حاصل کیا ہے اور دکھ انسان کی زندگی میں کہاں کہاں معاون ثابت ہوتا ہے۔ آٹھ سال دو برہمنوں کے آگے دست بستہ ٹریننگ لیتا رہا...... لیکن اس سے کچھ حاصل نہ ہوا۔ چھ سال اس نے اپنی ذات کو شدید مجاہدات کے حوالے کیا...... لیکن پھر اس پر صرف اتنا عرفان ہوا کہ زندگی کی راحت فقط درمیانی راستہ اختیار کرنے میں ہے۔ منفی

اور مثبت کے درمیان میں دکھ اور خوشی کے وسط میں...... اس کے باپ شدودھن پر محل میں کیا گزری؟ یہ دوسری کہانی ہے...... یشودھرا اور بچے نے گیا کے درخت تلے نروان حاصل کرنے والے کا کیسے انتظار کیا۔ یہ تیسری کہانی ہے، جس پر لوگوں کی توجہ اس لئے نہیں جاسکی کہ جو لوگ انسانیت کے لئے بڑے کام کر جاتے ہیں۔ ایسے ہاتھیوں کے پیروں تلے کچھ بونے، ادنیٰ رسومات، ناکارہ مسلک، پس بھی جاتے ہیں، لیکن پھاوڑا جب دھرتی کا کلیجہ پھاڑ کر نئی فصل کاشت کرنے کا عزم کر لیتا ہے تو اسے علم نہیں ہوتا کہ زیر زمین بسنے والے کیڑے مکوڑے، جڑی بوٹیاں، گھاس پھوس کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ یہی ارتقاء لانے والے بڑے آدمی کی قسمت اور چھوٹی مخلوق کی قربانی ہے، جس کے تحت بنی نوع انسان آگے سے آگے، آگے سے اور آگے ارتقاء کرتا چلا جاتا ہے...... اور اسی ارتقاء کے سہارے ابد کی جانب اور آگے بڑھتا ہے۔

مجھ بگی داڑھی والے راجہ شدودھن کا کمرہ اوپر والی چھت پر تھا۔ جن دنوں شاہدہ ہمارے پاس تھی، وہ کبھی کبھی ہمارے پاس خیر خیریت دریافت کرنے چلی آتی اور مماس کی طرح ہمارے دائرے کو چھو کر نکل جاتی۔ اوپر والے دو کمروں کے سامنے چھوٹا سا ٹیرس تھا، جس کے سامنے رواں دواں سڑک تھی۔ میں لوہے کی آرام کرسی میں دھنس کر اسی ٹیرس سے سڑک کا منظر دیکھتا رہتا۔ یہیں بیٹھ کر مطالعہ کرتا، اخبار پڑھتا اور یہاں ہی ورزش کے طور پر چلا بھی کرتا تھا۔ مجھے ایک عرصہ سے کبھی بس پر سفر کرنے کا موقع نہ ملا۔ لمبی سیاہ گاڑی پر دوکان سے گھر اور گھر سے دوکان جاتے آتے احساس نہ ہوا کہ بزنس ختم کرنے کے بعد یہ آسائش بھی زائد ہو جائے گی۔ میں نے ساری زبنس گول کر دی تھی۔ اب مجھے مزید بھاگ دوڑ کی ضرورت نہ تھی۔ کبھی کبھار پرانے دوست یار رشتہ دار ملنے آجاتے تو وہ اسی ٹیرس پر بیٹھ کر چلے جاتے۔ ان لوگوں کے بھی تیز رفتار زمانے میں بہت سے مسائل تھے۔ اس لئے یہ بھیڑ بھی جلد

چھٹ گئی اور میل ملاقاتی اپنے مسائل میں گم ہو گئے ...... یہ بہت بہت پہلے کی بات ہے۔

شاہدہ جوس پیتی ہوئی اوپر والی منزل پر آئی۔ ابھی جہانگیر شاکیامنی ہم سے رخصت نہ ہوا تھا۔ میں چھوٹے میز پر شیشہ لگائے الیکٹرک شیور سے خط بنانے میں مصروف تھا۔

''آسکتی ہوں جی''

''آیئے آیئے زہے نصیب بسم اللہ ......'' شاہدہ نے میز پر رکھا ہوا آئینہ ٹشو سے صاف کیا۔

میں دل میں سوچنے لگا کہ شاہدہ کیا مجھے سلام کرے گیا نہیں؟ سارے میں پائین ایپل کی خوشبو پھیل گئی۔

''آپ یہاں بیٹھ کر شیو کرتے ہیں'' شاہدہ نے سلام کے بغیر گفتگو کا آغاز کیا۔

مجھے اپنے اس فعل پر کچھ شرمندگی کا احساس ہوا۔

''یہاں ذرا روشنی زیادہ ہے......'' اب عینک کے نمبر ختم ہو چکے تھے اور میں لنز لگا کر اخبار پڑھنے لگا تھا۔

ٹشو سے کرسی صاف کر کے شاہدہ بیٹھ گئی۔ کچھ دیر پائین ایپل کا جوس پینے کا شغل جاری رہا۔

''وہ ایک بات کرنا تھی آپ سے ...... جہانگیر تو ہرگز معاملہ آپ کے سامنے پیش نہیں کرے گا''۔

''ہاں ضرور......'' مجھ کو اپنی اہمیت کے احساس نے سیدھا بٹھا دیا۔

''ہم لوگ امی کی طرف شفٹ کرنا چاہ رہے ہیں......''

میں نے بہت سی باتیں پوچھنا چاہیں۔ کیوں؟ کس لئے؟ کتنے عرصے تک ...... لیکن سارے سوال دل میں چھپا کر میں خوش دلی سے بولا......''

ہاں ہاں کیوں نہیں ...... کیوں نہیں“

”یہ میں جہانگیر سے کہہ رہی تھی کہ ابو کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ وہ تمہاری طرح Unreasonable نہیں ہیں......“

اس تعریف کو میں نے غنیمت جانا اور خاموش رہا۔

”ویسے میں ایک بات پوچھوں ...... آپ مائنڈ تو نہیں کریں گے؟“

”نہیں نہیں پوچھو ...... پوچھو......“

”یہ جہانگیر کو آپ نے کیسے پالا ہے؟ میں سمجھ نہیں سکی۔ اس قدر Sissy آدمی ...... آپ مرد پال رہے تھے کہ لڑکی ...... چوڑیاں پہنا دیں، دوپٹہ پہنا دیں اسے...... کسی سے سیدھی بات نہیں کر سکتا، ہکلانے لگتا ہے ...... Confidence نام کی کوئی چیز نہیں اس میں ...... آپ نے جہانگیر کو لائف کے قریب نہیں ہونے دیا، کچھ Face نہیں کرنے دیا He has no Confidence ...... اگر یہ یہاں رہا تو سی ایس ایس نہیں کر سکے......“

میں نے کہنا چاہا کہ اسی گھر سے تمہارے جہانگیر نے ایم بی بی ایس کیا تھا، لیکن چپ رہا۔ ہر شدو دھن کو چپ رہنے کا حکم ہے۔

”اچھا جی ...... کوئی Hard Feelings کے بغیر ہی کام بن جائے تو اچھا ہے۔ بس جہانگیر کا کام تو اتنا ہے جو ہو چکا اس پر بھی خوفزدہ ...... جو ہو رہا ہے اس سے بھی ڈرے ہوئے اور جو ہونے والا ہے اس سے تو مائی گوڈ۔ اتنے Scared کہ جان ہی نکلی جاتی ہے......“

وہ بغیر اضافی جملوں کے اٹھ کر نیچے چلی گئی۔ صرف ایک پھڑ پھڑاتا ہوا ٹشو اس کی نشانی میز پر رہ گیا۔ جانے سے کچھ دن پہلے ڈرائنگ روم میں زبردست ہنگامہ بھی ہوا تھا......

میں بارہ کھلنے والی کھڑکی کے سامنے لائمیں بیٹھا تھا، لیکن پردے کھنچے تھے، اس لئے

اندر والوں کو احساس نہ ہوا کہ آواز باہر بھی جا سکتی ہے۔ شاہد نے گرج کر کہا...... ''جب میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں نے ابو جی کو انفورم کر دیا ہے تو اب تمہیں فارمل اجازت لینے کی کیا مصیبت ہے...... یہ کوئی سرکاری تبادلہ ہے کہ فارمل اطلاع دینا ہو گی''۔

''امی ابو اس بڑے گھر میں بالکل تنہا رہ جائیں گے، شاہدہ This is not fair ''

ڈاکٹر جہانگیر نے منمنا کر جواب دیا......

''اور یہ میرے ساتھ فیئر ہے؟ میں ایک ایکڑ کی کوٹھی چھوڑ کر اس چار کنال کے ڈربے میں آئی۔ میرا خیال تھا کہ تم جلد کوئی انتظام کرو گے، لیکن تم جیسے چکن ہارٹڈ لوگ خود بھی پستے ہیں اور دوسروں کو بھی پسنے کا حکم لگا دیتے ہیں۔ تمہارے نزدیک یہ Idealism ہے۔ مائی فٹ......''

''میں کب کہتا ہوں کہ میں Idealism کا شکار ہوں......''

''میں جانتی ہوں، سمجھتی ہوں ساری چالیں...... انگور کھٹے ہوں تو آدمی نیک بن جاتا ہے۔ تم جیسے لوگوں کو اگر دولت، سٹیٹس اور موقع ملے تو تم نہ جانے کیا کیا کرو...... نمبرون لچے بدمعاش نکلو...... تمہارا ہاتھ ہی نہیں پڑتا، اس لئے تم نے نیکی کی وردی پہن رکھی ہے...... تم یہاں رہے تو جہانگیر میں تمہیں چھوڑ دوں گی...... یہ جگہ میرے لئے گالی ہے ...... ان کمفرٹیبل ہے...... میں قربانی تو دے سکتی ہوں، لیکن ساری عمر قربانی کا بکر نہیں بنی رہ سکتی...... انسان ایک بار پیدا ہوتا ہے، ایک بار زندگی گزارتا ہے۔ "Life is for once only"

منمنا کر جہانگیر نے کچھ جواب دیا۔

''بلڈی شٹ...... تم اپنے ماں باپ کے لئے Considerate ہو اور میرے لئے...... میرے بچے کے لئے؟...... تم کو علم ہی نہیں میں یہاں کس طرح Suffer کر رہی ہوں۔ تم مجھے دے ہی کیا سکتے ہو باسٹرڈ؟ تمہارے پاس ہے کیا دینے کے

لئے ایک سیکنڈ ہینڈ سوزوکی کار...... یہ Bitchy ہاؤس، ایک نالائق کک...... ایک ہاف بیکڈ باپ...... ایک پاگل ماں...... یہ سب کچھ دینے کے لئے تم نے شادی کی تھی مجھ سے ...... میں نے تمہاری خاطر اپنی ممی ڈیڈی کا دل توڑا...... ساری فرینڈز چھوڑیں۔اس ڈرٹی پجن ہول میں آ کر انہوں نے میرا ہی مذاق اڑنا تھا ناں۔اتنی ساری قربانی کا یہ صلہ دیا تم نے جہانگیر......؟تم اتنا بھی ریلیز نہیں کرتے کہ اس Un hygeinic جگہ میں میرا بچہ نہیں پل سکتا...... میں......کوئی فرشتہ نہیں ہوں کہ تمہاری ہر بات مان لوں گی ...... کچھ باتیں تمہیں بھی ماننا ہوں گی جہانگیر...... ایک بڈھے پھوس جوڑے کی خاطر ہم اپنی زندگی کا پیٹرن برباد نہیں کر سکتے ہاں۔"

جہانگیر اور شاہدہ کے چلے جانے کے بعد ہم دونوں پھر اوپر والی چھت سے اتر کر نیچے آ بسے، لیکن ہماری زندگی کا پیٹرن بالکل نہ بدلا۔ہم پہلے بھی بغیر پانی کے پھول تھے اب بھی ماہی بے آب بن کر وقت گزارتے رہے۔صرف اتنا ہوا کہ میرے سامنے والے سارے دانت یکے بعد دیگرے ٹوٹ گئے اور مجھے علم نہ ہو سکا۔اب نہ مجھے نام یاد رہتے، نہ لوگوں کے چہرے دیکھ کر کوئی شناخت ابھرتی۔پل بھر پہلے کا واقعہ ذہن سے محو ہو جاتا۔صرف پرانی یادیں گھیرا ڈالے بیٹھی رہتیں۔ جہانگیر کا بچپن، اصغری کی جوانی، ارجمند کا چہرہ، جوانی میں رخصت ہو جانے والا باپ اور بہن بھائی ......جن کو زندگی کھا گئی یا میری ترقی اور پھر اقبال...... ایک واہمہ، ایک خواب، پرانے گھر، سکول میں ہونیوالے واقعات چھوٹی چھوٹی باتیں جنہوں نے انہونی کی سی شکل اختیار کر لی تھی۔ماں گویا زندہ اور جاندار ہو کر میرے انتظار میں رہتا۔گھنٹوں چھوٹی سی آرام دہ کرسی میں بیٹھ کر پھاٹک کی طرف ٹکٹکی باندھ کر بسوں کو دیکھتا رہتا۔بظاہر بچوں کے لوٹ آنے کے علاوہ مجھے اور کسی چیز کا انتظار نہ رہتا۔شاید میں موت سے خائف تھا، اسی لئے ماضی میں پناہ لیتا تھا۔شاید میں خوشی کے معجزے کا انتظاری تھا جو اب ناممکل تھا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ انتظار مہینوں کا ہے کہ سالوں کا...... کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے...... ہمیشہ دل نے کہا...... عقل کہتی رہی کچھ ہونے کو باقی نہیں رہا۔ اب اور کیا ہوگا...... سزائے موت...... لیکن ایک بات میری سان وگمان میں نہ تھی کہ اصغری بھی بچھڑ سکتی ہے۔ وہ سلیپروں میں کھڑ پڑ کرتی، گھر کے سازوسامان کو چیتھڑوں سے صاف کرتی۔ اپنے دونوں بچوں کی رخصتی کے بعد ایک سایہ سا گھومتی پھرتی موجود تھی۔ اس کے چلے جانے کے بعد بھی مجھے انتظار رہتا، کچھ بدل جانے کا...... اچانک بہار کے آے کا...... شاید اقبال کا؟...... بہرکیف ایک اندھی سی شام کو بغیر اطلاع کے جہانگیر وارد ہوگیا...... اصغری کی موت کے بعد میں جہانگیر سے ملنے نہیں گیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس نے سی ایس ایس کا امتحان دیا کہ سسر کی فیکٹری میں حلول کرگیا۔ پوتے کی یاد کبھی کبھار آتی تھی، لیکن میں نے اس یاد کو بھی اسی الماری میں ہینگر پر لٹکا کر رکھ دیا، جہاں اور بہت سی استری شدہ یادیں کپڑوں کی صورت پہنے جانے کی منتظر تھیں۔ ملازم چھٹی پر تھا۔ میں چائے کی پیالی بنا کر ڈرائنگ روم میں آرہا تھا، جب جہانگیر دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ دروازہ کھلنے پر نظر آیا کہ جہانگیر کی گاڑی بڑی تھی اور اسے ڈرائیور چلا کر لایا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں نے دل میں شکر کیا کہ شام کا اندھیرا تھا اور ابھی میں نے بتی نہیں جلائی تھی۔ ایک شہر اور اتنے لمبے فاصلے......

''یہ آپ کیا کر رہے ہیں ابو'' جہانگیر نے باپ کے ہاتھ سے پیالی پکڑ کر تپائی رکھی۔

''چائے پینے لگا تھا۔ پیو گے''

''اور وہ کہاں ہے غلام نبی''

''وہ سوات گیا ہے چھٹی پر......''

''کب آئے گا''

''پرسوں آجائے گا۔ پندرہ دن کی چھٹی پر گیا تھا......''

''آپ اتنی لمبی چھٹی نہ دیا کریں اسے...... امی کے بعد آپ کو کون لک آفٹر کرے

گا''۔اس کی آواز میں احساس جرم تھا......سعادت مند بیٹے کا احساس کم مائیگی۔

''ہاں......تم ٹھیک ہو......''

''جی......''

''اور بے بی کہاں ہے؟......'' مجھے یاد نہیں تھا کہ کاکے بی اصلی نام ہارون ہے۔

''میں آپ کو کچھ بتانے آیا تھا۔''

''ہاں......ہاں ضرور......''

جہانگیر نے اٹھ کر کمرے کی بتیاں روشن کر دیں......

''میں نے فیصلہ کیا ہے......میں امریکہ چلا جاؤں......یہ کمپیوٹر کا زمانہ ہے اور میں نے کمپیوٹرز میں ایم سی ایس کر لی ہے......''

لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا، وہ سی ایس ایس کرنے کے لئے شاہدہ کے گھر منتقل ہوا تھا۔جب تک اصغری رہی، ہم کبھی کبھی ان دونوں سے ملنے جاتے بھی رہے، لیکن ہماری معلومات جہانگیر کے معاملے میں ہمیشہ ناکافی رہیں۔مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ کبھی اس نے مجھ سے کمپیوٹر کا ذکر کیا ہو۔

میں نے روشنی میں اپنے ڈاکٹر بیٹے کو دیکھا۔وہ اب کسی فیکٹری کا چیف ایگزیکٹو لگ رہا تھا۔ڈاکٹری اور سرکاری افسری اس کے قریب قریب کہیں نہ تھی۔

''لیکن تم تو یہاں سے سی ایس ایس کرنے گئے تھے جہانگیر......''

''بس ایسے ہی ہے ابو......وہاں میرے سسر نے مجھے اپنی فیکٹری میں جگہ دے دی۔امتحان نہ دے سکا میں۔''

''اچھا......اچھا کیا چھوڑ دیا امتحان''۔

''نہیں ابو......اب میں خود اعتماد مرد بن گیا ہوں......میں کسی کارخانے دار کی پلیٹ سے لے کر نہیں کھا سکتا۔مجھے اپنا مستقبل......اپنے بچے کا مستقبل خود بنانا ہے......میں ان لوگوں کا دست نگر نہیں رہ سکتا۔اگر شاہدہ کے لئے یہاں رہنا مشکل تھا تو

میرے لئے بھی وہاں زندگی کچھ آسان نہیں ..... میری غیرت کے بھی کچھ تقاضے ہیں آخر۔''

میں نے ٹھنڈی چائے کا گھونٹ بھر کر اسے دیکھا ..... ''لیکن امریکہ کی زندگی تو بہت مشقت طلب ہے ..... شاہدہ اتنی اوکھی زندگی بسر کر لے گی ..... وہ تو نازوں میں پلی ہے۔ پانی بھی اٹھ کر خود نہیں پی سکتی .....''

''اب اس کے لئے کوئی چوائس نہیں ہے ابو، فیکٹری چلا کر میں بھی بندوں کو چلانا سیکھ گیا ہوں''۔

''یہاں سسرال میں ہم دونوں کی کوئی عزت نہیں۔ وہ بھی اب ریلیز کرتی ہے۔ یہ اسی کا فیصلہ ہے کہ ہم باہر چلے جائیں اور اپنی زندگی خود بنائیں اسے بھی شوق چڑھا ہے ..... وہ بھی ارجمند کی طرح Independent ہونا چاہتی ہے''۔

جب میں جہانگیر کو ایئرپورٹ چھوڑ کر واپس لوٹا تو مجھے پتہ چلا کہ اتنے بڑے شہر کی اداسی کیا ہوتی ہے اور رونق کے دل میں تنہائی کا چٹاخ کیسے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ امریکہ سدھارنے سے پہلے کبھی کبھی جہانگیر مجھے فون کر دیتا تھا۔ دو مرتبہ عید کے موقع پر شاہد بے بی کو بھی لے کر آئی، لیکن بچہ دادا کے ہاتھ سے کچھ لے کر کھا نہ سکا۔ اسے باہر کی چیزیں کھانے کی اجازت نہیں تھی۔ ایک دفعہ میں نے آئس کریم والے سے قلفی لے کر بے بی کو دی تو ہارون نے للچائی نظروں سے قلفی کو دیکھا اور پھر لوٹاتے ہوئے کہا ..... ''دادا مجھے Allowed نہیں ہے۔''

جہانگیر نے جلدی سے قلفی بچے کے ہاتھ سے اچک لی اور بولا ..... اپنے بیٹے کو کھلاتے نہیں اور پوتے کی خدمت ہو رہی ہے ..... ساری زندگی آپ نے مجھ سے سوتیلے بیٹے کا سا سلوک کیا۔ شاہدہ اور بچہ ابلا ہوا پانی پیتے تھے، اس لئے بازاری پانی کی الگ بوتل بھی ساتھ آتی۔ میں انہیں اپنے نل کا پانی بھی پلا نہیں سکتا تھا ..... نام بھی شاہدہ کے والدین نیر کھا تھا، اس لئے مارے انا کے میں بھی نام نہ سیکھ سکا اور بچے کو بے بی ہی بلا

رہا......

کپل وستو کے محل میں مہارانی مایا نے جب گوتم کو جنم دیا تو راجہ شدودھن کو علم نہ تھا کہ بیٹے کی پرورش کیوں کر اور کیسے کی جاتی ہے؟ راجہ شاکیا قبیلہ کا سردار رہا تھا۔ اسے حکومت، سیاست اور ظلم کا علم تو ضرور تھا، لیکن پرورش، مہربانی اور آنسوؤں کی تاثیر سے وہ نابلد تھا۔

مرنے سے پہلے مہارانی مایا نے شدودھن کی گود میں سدھارتھ کو دے کر کہا ''راجہ جی اس کا منہ تو دیکھئے بھلا...... یہ چت چور تو بڑے گہرے دھیان میں لین ہے......اس کا من کیسے لگے گا؟ اس سنسار میں''۔

''تم اپنی چنتا کرو مہارانی جی۔ اس بالک کی اور مت دیکھو......''

لیکن مہاں مایا کو اپنا دھیان نہ تھا...... مہاراج ادھیراج یہ سنتان کبھی کشٹ نہ اٹھائے...... میں جیتی رہتی تو اس کے منہ سے یہ ساری چنتا ہرن کر دیتی، پر اب یہ بالک آپ کے شرن ہے۔ اسے کشٹ اور اداسی سے بچائے گا ورنہ میری آتما''۔

راجہ کی ممتاز محل جاتے جاتے جملہ ادھورا چھوڑ گئی...... پر راجہ راج پاٹھ کے چلن بھول گیا...... اب اسے ایک ہی کارگزاری سے غرض تھی کہ بہت سوچنے اور دھیان کرنے والے چہرے پر اداسی کی چھاپ نہ ہو...... گوتم کشٹ نہ جھیلے، نہ اندر نہ باہر...... گیان دھیان کی چنتا کسی طرح گوتم کے چہرے کی پرچھائی نہ بنے۔

مرنے سے پہلے اصغری بولی۔ ''ہمایوں صاحب آپ بڑے بھولے اور سیدھے آدمی ہیں۔ میں نے ساری عمر بچوں کی تربیت کا بوجھ آپ پر نہیں ڈالا۔ لیکن اب بیچ منجدھار جانا پڑے گا۔ مجھے نظر آ رہا ہے...... جہانگیر کا اپنا کوئی اس کے قریب نہیں۔ آپ کے گھر والوں نے تو کوئی رشتہ نبھانے کی کوشش نہ کی۔ سب اپنے اپنے بلوں میں گھس گئے۔ ارجمند پہلے سے امریکہ زادی ہو گئی ہے اب جہانگیر بھی سسرال جا بسا...... برسوں ادھر میرا مائیکہ بھی چھوٹ کر کراچی جا بسا...... اب آپ ہی آپ ہیں......

جہانگیر بڑا صابر اور حساس ہے۔ دل کی بات کو زبان پر آتے آتے برسوں لگ جاتے ہیں۔ آپ اگر اس کی خاموشی کو نہ سمجھے تو قیامت آجائے گی ...... وہ ...... اپنی کسی خواہش کا اظہار تو کرنے والا نہیں ...... بس اسے اداسی سے بچایئے گا۔ میں ہوتی تو ...... ''قدرت نے اصغری کو نہ تو اپنا پنتھ نبھانے دیا، نہ ہی دکھڑا ہی بیان کرنے کی خوش بیان دی۔ ''لیکن میں بھی کیا کر لیتی بھلا۔ آپ ہی آپ ہیں اب تو......''

اصغری کی ساری خواہشیں بھی اس کی باتوں کی طرح ادھوری تھیں جیسے اس کی پوری بات سن کر جواب دینے والا کوئی تھا ہی نہیں ...... اس ادھوری عورت نے جانے میں بھی عجب بے تکا پن دکھایا......

ہم باپ بیٹا ڈائیلاگ تو قائم نہ کر سکے، کیونکہ وہ امریکہ میں تھا، لیکن ہم دونوں کے درمیان ایک ایسا پل تعمیر ہو گیا تھا جو ٹیلی پیتھی کے سہارے چلتا تھا۔ فون پر جتنی باتیں ہوتیں وہ غیر ضروری ہوا کرتیں۔ ہم اندر کے حالات زیر بحث نہ لا سکتے۔ بہن کی نقل میں یا اپنی آزادی کی تلاش میں جہانگیر بھی امریکہ چلا گیا۔ اسے بھی شاید کسی بودھی درخت کی تلاش تھی جس کے نیچے بیٹھ کر وہ راحت اور غم دونوں سے چھٹکارا حاصل کر سکتا۔ امریکہ میں اسے کمپیوٹرز کی ایک بڑی کمپنی میں بڑی اچھی نوکری مل گئی۔ شاہدہ اس تبدیلی پر خوش تھی اور بالآخر اسے آزاد چلن کی ویسی زندگی مل گئی، جس کی وہ ہمیشہ سے آرزو مند رہی۔ جہانگیر کے فون باقاعدگی سے آتے، لیکن ڈاکیہ کبھی کوئی پریم پتر نہ لایا۔ میں جانتے بوجھتے ہوئے ہر روز ڈاکیے کا انتظار کرتا رہتا۔ کبھی کبھی لفافے میں ہارون کی تصویریں مل جاتیں تو میں ان تصویروں کو تکیے تلے رکھ کر بار بار نکالتا، دیکھتا اور پھر رکھ دیتا...... خالی کمروں میں گھومتے رہنا، کئی بار پڑھے ہوئے اخبار کو پھر پڑھنا ...... بازار جا کر سب کچھ بھول جانا، درختوں سے زرد رو پتے گرتے دیکھنا، پرندوں کی آواز پر کھڑکی کھول کر پرندوں کو عقابی نظروں سے تلاش کرنا، ملازم کو اپنا خدا سمجھنا، سردیوں میں جرابوں اور سویٹر سمیت سونا اور گرمیوں میں کھانسی کے اندیشے سے بغیر

ایئر کنڈیشنر کے رات بسر کرنا، عبادت میں دل لگانے کی ناکام کوشش اور مسجد میں نماز ادا کرنے کو اہم تو سمجھتا...... لیکن ایسا تواتر سے کر نہ سکتا۔ نہ جانے کیوں رفتہ رفتہ ساری بھیڑ چھٹ گئی۔ رشتہ دار سب راستوں میں کھو گئے یا میں نے ان کا تعاقب بھی سلیقے سے نہ کیا۔ زندگی لوگوں سے اور کام سے خالی ہو کر بنجر ہو گئی...... کچھ تو جہانگیر کی یاد کا جھکڑ اس صحرا پر اڑائے پھرتا۔ کچھ ارجمند کو پرایا مال سمجھ کر بھولنے کی کوشش میں دن کٹتے۔ پھر خالی خولی ہو کر کہیں نہ کہیں بیٹھ رہنے کو پرانی یادوں کو کان لگا کر سننے میں وقت گزرنے لگا۔

پتہ نہیں یوں کتنے سال گزرے...... میرا وقت اب کیلنڈروں کا تابع نہ رہا تھا۔ میں موسموں اور واقعات کا سہارا لے کر بھی اپنے وقت کی بانٹ نہ کر پاتا۔ اب تو رب کی وقت کی طرح میرے ماہ و سال بھی آپی آپ گزرنے لگے۔ پھر اچانک ایک دن جہانگیر وارد ہو گیا۔ اس کے ساتھ صرف دو سوٹ کیس اور ایک بیگ تھا۔ شاہدہ اور ہارون ساتھ نہ تھے۔ لمبے سفر کی تکان نے اس کے چہرے کو اور بھی اداس کر رکھا تھا۔ ہم دونوں میں خاموشی، تنہائی اور ان کہی محبت کا گہرا حجاب تھا۔ ہم نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور رسمی باتوں کا آغاز کیا...... کچھ دیر کے بعد یہ باتیں بھی ختم ہو گئیں۔ کوئی راستہ دل کی اندھیری غار میں نہ اترا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے چھپتے، شرماتے اور کتراتے سے رہے۔

''شاہدہ کا کیا حال ہے؟......'' کوئی دسویں مرتبہ اندر کے باپ نے پوچھا۔

''ٹھیک ہے...... ہو امریکہ میں بہت خوش ہے۔ جس طرح کی آزادی اسے درکار تھی مل گئی ہے۔ نہ سسرال، نہ مایکا۔ سارے جنجال ختم''۔

''لیکن وہاں تو کام بہت کرنا پڑتا ہے......''

جہانگیر مسکرایا۔ پھر بولا۔'' کام تو ہم دونوں مل کر ہی کرتے ہیں۔ میں برتن دھو دیتا ہوں، وہ واشنگ کرتی ہے......''

''ابو جی...... امریکہ میں ہر کام برابر ہے۔ مرد عورت کی کوئی تمیز نہیں...... کام کام ہے...... چاہے پرائم منسٹر کا ہو یا ٹرک ڈرائیور کا......''

''اچھا اچھا......'' میری سمجھ بوجھ پرانی تھی۔ میں پرانی روایات کو اتنی آسانی سے بھول نہیں سکتا۔ مشرق میں ابھی مرد اور عورت کی دنیا اس قدر گڈمڈ نہ ہوئی تھی۔ دونوں کے رول اور کام کافی حد تک Defined تھے۔ امریکہ میں یونی سکیس کی تیاریاں شروع تھیں۔

''بس Gloves پہن لیتا ہوں...... ایپرن سجا لیتا ہوں۔ میرے ایپرن پر ابا جی آئن سٹائین کی تصویر بنی ہے...... میں اسے دیکھتا ہوں تو مجھے آپ یاد آ جاتے ہیں''۔

آئین سٹائن کی تصویر ایپرن پر؟ کبھی کبھی اپنے آپ کو عزت بخشنے کی خاطر...... لوگ بے ادبی کے بھی مرتکب ہو جاتے ہیں...... بڑے ناموں کو چھوٹے مقاموں پر استعمال کر کے بے حرمتی کا شکار ہوتے ہیں۔ جیسے جناح بوٹ ہاؤس، لنکن باربر شاپ، اقبال ٹی ہاؤس وغیرہ......

''اور بے بی......؟'' میں نے دانستہ ہارون کا نام استعمال نہ کیا۔ مجھے ابھی تک نہ بھولا تھا کہ پوتے کا نام رکھنا دادے کا آبائی حق ہے اور شاہدہ کے گھر والوں نے مجھے اس اعزاز سے محروم رکھا تھا۔

''وہ تو بے حد خوش ہے ابا...... نہ اسے شاہدہ کی پرواہ ہے نہ میری...... سکول سے آ کر انٹرنیٹ...... پھر ہوم ورک......''

''اسے اپنا سکول پسند ہے جہانگیر؟......'' حیرانی سے میں نے سوال کیا۔

''پسند؟...... اسے تو سکول سے عشق ہے...... خود بستہ پیک کرتا ہے، خود تیار ہوتا ہے...... خود سکول بس کے لئے وقت پر چلا جاتا ہے......''

میں سراسیمگی کے عالم میں سوچتا رہا کہ وہ کیسا سکول ہو گا جس کے لئے ہارون خود تیار ہوتا ہے...... آپ بس پکڑتا ہے۔ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ شاہدہ کی کال

تھی۔ وہ دونوں بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے ...... جہانگیر اسے سارے سفر کی تفصیلات بتاتا رہا۔ نہ جانے کیوں اس نے مجھ سے اس کا ذکر نہ کیا...... میں اٹھ کر باورچی خانے میں چلا گیا اور جہانگیر کے لئے کافی پھینٹنے میں مشغول ہو گیا......

دس بارہ دن میں اسی کوشش میں رہا کہ جہانگیر کو کے ایف سی، میکڈونلڈ، پیزا ہٹ اور چائنیز کھانا کھلاؤں۔ میں جہانگیر کو سمجھانا چاہتا تھا کہ اب پاکستان پسماندہ نہیں رہا۔ ہم نے اتنی ترقی ضرور کر لی ہے کہ اپنے شہر میں پیزا ہٹ، تھائی فوڈ، بروسٹ، میکڈونلڈ موجود ہیں۔ جہانگیر گھوم پھر کر غلام نبی سے فرمائش کرتا کہ اسے کڑھی، سرسوں کا ساگ، نہاری، ہریسہ، کنا اور شب دیگ کے ساتھ ساتھ مکئی کی روٹی، پراٹھے اور قیمے والے نان پیش کئے جائیں۔ وہ ایک ہی ہلے میں فرنی کی کئی کئی ٹھوٹھیاں، بازاری قلفیاں، کھیر کھا لیتا۔ کشمیری چائے پر تو اس کی جان نکلتی۔ ہر کھانے کے بعد باورچی خانے میں پہنچ کر لجاجت سے استدعا کرتا...... ''ایک پیالی کشمیری چائے مل جائے گی؟ جناب غلام نبی صاحب......'' ہم باپ بیٹا ایک دوسرے سے دور دور رہ کر ایک دوسرے میں بس رہے تھے۔ ایک رات جب کشمیری چائے سے اٹھنے والی باداموں کی خوشبو سارے میں پھیلی، جہانگیر نے کہا......'' ابا جی ...... ہماری خواہش ہے کہ آپ ہمارے ساتھ امریکہ شفٹ ہو جائیں''۔

''ہماری کہ......تمہاری......'' میں سرد مہری کے پچھلے تجربے میں ابھی غوطہ زن تھا۔

''ایک ہی بات ہے ابا جی ...... آپ میرے ساتھ چلیں۔ ہارون اور شاہدہ خوش ہوں گے''۔

''لیکن کیوں......؟ کیوں خوش ہوں گے''۔

''میں......وہاں آپ کے بغیر خوش نہیں رہ سکتا ...... پتہ نہیں کیوں جب میں لمبے راستوں پر ڈرائیو کرتا جاتا ہوں تو آپ مجھے ان خالی کمروں میں گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں...... میں تو آپ کا تصور اماں کے بغیر نہیں کر سکتا''۔

''اور اگر میں انکار کر دوں ......تو......؟''

کچھ دیر جہانگیر سوچتا رہا پھر بولا...... ''اس صورت میں ایک ہی بات ہو گی...... میں واپس آ جاؤں گا اور یہیں رہوں گا......آپ کے پاس......''

''اور تمہاری بیوی اور بے بی......''

کچھ دیر لمبے لمبے سانس بھرتا جہانگیر چائے پیتا رہا۔ پھر کسمسا کر بولا...... ''وہ تو شاید نہ آ سکیں۔ دیکھیں آگے آگے ہارون کی تعلیم کا اصلی مسئلہ ہو گا...... ہمارے وطن کی تعلیم سے تو اب کیریئر نہیں بنتا ناں......شاہدہ میں ایک خوبی ہے ابا جی۔ وہ وقت کی ضرورت کے تحت بہت جلد تبدیل ہو جاتی ہے......اسے کچھ چھوڑ کر راستہ بدل کر، غلط یا درست فیصلہ کر کے دیر تک احساس جرم نہیں ہوتا۔ وہ Move Over میں یقین رکھتی ہے......میں بند گٹر کی طرح ہوں۔ ایک بار Choke ہونے لگے تو پھر ہوتا ہی چلا جاتا ہے......''

اس کے بعد ہم میں کوئی بات نہ ہوئی اور ایک ان کہا سمجھوتہ ہو گیا کہ میں کوٹھی بیچ کر امریکہ سدھاروں گا...... جہانگیر کا زیادہ وقت علاقے کے پراپرٹی ڈیلروں کے ساتھ گزرتا، لیکن ملکی حالات، ڈالر کی چڑھتی قیمت اور بھارت کے جارحانہ سیاسی رویے کی بدولت قیمتیں گر رہی تھیں۔ دو ایک بار اخباروں میں اشتہار بھی دیئے، لیکن گاہک ان مانے جی سے کوٹھی دیکھ کر یوں لوٹے، جیسے سانولی چھوٹے قد کی غریب لڑکی کا رشتہ دیکھ کر لڑکے والے واپس چلے جایا کرتے ہیں۔ پھر جہانگیر نے کوٹھی کے گیٹ پر فار سیل کا بڑا سا بینر لگا دیا۔ ہم دونوں مل کر گھر کا سامان پیک کرنے لگے۔ پیکنگ کے دوران بھی کچھ وقت باہمی مشورہ کے تحت بسر ہونے لگا۔

''ابا جی آپ کوٹھی کو فرنشڈ حالت میں بیچیں۔ آپ کو اس طرح کسی کباڑیئے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی اور آپ سامان کی کھچل سے بھی بچ جائیں گے۔ سامان الگ فروخت نہیں کرنا۔ یہ بہت Hassle ہے''۔

''ایسے ہوسکتا ہے کہ میں ضرورت کا کچھ سامان گیراج میں رکھ جاؤں......''

''جب کوٹھی بک گئی ابا جی، تو پھر گیراج میں سامان کون رکھنے دے گا؟ ویسے بھی صوفے، قالین، میزیں، الماریاں پرانی وضع کی ہیں۔ان کا کیا ملے گا بھلا''۔

میں نے کہنا چاہا کہ سامان کے ساتھ استعمال کی وجہ سے یادوں کی ایک برات رہا کرتی ہے۔اس کا کیا کروں گا؟ لیکن چپ رہا۔جس روز پی آئی اے کے دفتر سے جہانگیر ٹکٹیں بنوا کر واپس لوٹا، شام کافی جا چکی تھی۔پچھلی لان میں بڑے چھتنارے درخت پر میری نگاہ پڑی۔کوؤں کی ایکٹولی سنبل کے درخت پر کائیں کائیں کرتی آ کر بیٹھتی، پھر پہلے سے زیادہ شور کرتے، بلبلاتے، واویلا مچاتے سارا گروہ شام کے دھندلکے میں اڑ کر غائب ہو جاتا۔درخت ساکت وصامت ان کی اڑان سے بے پرواہ اپنی جگہ اٹل رہتا۔کوے نہ جانے کہاں کا روند کر کے ایک بار پھر ہلا مار کر ڈالیوں پر آ گرتے۔شام کا اندھیرا انکی بے قرار کو درخت میں جذب کرنے کی کوشش کرتا۔ میں اس سٹپٹاہٹ کو اپنے اندر کی کھلبلی کے ساتھ میچ کر کے دیکھ رہا تھا۔

جہانگیر نے آ کر لمبی سانس لی۔اپنے دونوں پاؤں بوٹوں سمیت سنٹرل ٹیبل پر جمائے اور صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر بیٹھ گیا۔

''کمال کا کام ہوا ہے آج تو۔میرا ایک پرانا دوست پی آئی اے کے آفس میں مل گیا۔وہ اس کوٹھی کو فوراً خریدنا چاہ رہا ہے......اور قیمت بھی اچھی مل جائے گی...... کراچی سیشفٹ کرنا چاہ رہا ہے۔آپ کو عارف یاد ہوگا ابا جی......میرے ساتھ ساتویں میں پڑھا کرتا تھا......ہم اکٹھے فٹ بال کھیلا کرتے تھے''۔

''وہ......وہ عارف جس کے چہرے پر ماتا کے دماغ تھے......''

''جی بالکل بالکل وہی عارف......کراچی کے حالات ٹھیک نہیں......اس کے ایک بھائی کو کسی نے شوٹ کر دیا۔لوگ دل برداشتہ ہو کر کراچی چھوڑ رہے ہیں......وہ بھی سمجھتا ہے اور میں بھی جانتا ہوں کہ ہمیشہ تجویز کام نہیں آتی۔کبھی کبھی عجب طور پر خوش

قسمت آپ کے تعاقب میں وہتی ہے...... اب آپ ساری کشتیاں جلا دیں۔ ابا جی ...... آپ سکندر کا نصیبہ لے کر پیدا ہوئے ہیں...... آپ کا ہر کام بروقت اللہ کی طرف سے ہو جاتا ہے......"

جہانگیر زندگی کے دریا کو قابل عبور سمجھتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا...... جب کافی رات جا چکی اور نیند کی گولی کھانے کے باوجود مجھے نیند نہ آئی تو میں جہانگیر کے کمرے تک گیا، ہلکی سی دستک دی۔ اندر سے کم ان پلیز کی آواز سن کر میں اندر داخل ہو گیا۔ جہانگیر پلنگ پر لیٹا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نیند تھی۔

"آیئے آیئے......" اس نیا ٹھنے کی کوشش کی۔

"لیٹے رہو...... لیٹے رہو"

میں کچھ دیر سراسیمہ ساصوفے پر بیٹھا رہا۔ پھر لمبی خاموشی کو توڑ کر بولا......"بات یہ ہے کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا بیٹا......"

"لیکن کیوں...... کیوں ابا جی......"

"تمہاری ماں زندہ ہوتی تو ضرور چلی جاتی بیٹا...... لیکن میں نہیں جا سکتا......"

جہانگیر کے چہرے پر پریشانی آ گئی۔

"لیکن......"

"بات یہ ہے کہ نروان حاصل کرنے کے لئے تمہیں اکیلے ہی نکلنا ہو گا...... میں نے جہاں تک ممکن تھا، تمہیں راحت میں پالا...... کوشش کی کہ تمہیں کوئی غم کوئی محرومی کوئی تکلیف نہ ہو لیکن......"

"میں آپ کو یہاں چھوڑ کر وہاں کیسے خوشی کی زندگی بسر کر سکتا ہوں...... میں اتنا Stress کیسے برداشت کروں گا ابا جی......"

"میں سمجھ گیا ہوں، ہر انسان کے لئے گرم سرد کٹھالیوں میں سے گزرنا ضروری ہے۔ میں تم کو صرف راحت کا سبق دینا چاہتا تھا، لیکن غم بھی تو انسان کا استاد مکرم ہے۔

ہماری روح دکھ کے بغیر بالیدہ نہیں ہو سکتی، اوپر اٹھ نہیں سکتی۔ تم تو ماڈرن آدمی ہو، جانتے ہو۔ جب تک راکٹ کے نیچے دہکتی آگ نہیں جلتی، تب تک اس کا خلائی سفر شروع نہیں ہوتا...... گھبراؤ نہیں واپس لوٹ جاؤ...... نروان حاصل کرنے کے لئے کپل وستو چھوڑنا پڑتا ہے شاکیا منی...... ہجرت بنیادی اصول ہے آگاہی کے لئے۔ وہاں تمہیں اپنا راستہ مل جائے گا...... جب تک تم مجھ سے فارغ نہ ہوئے قد آور درخت نہیں بن سکو گے، ہمارے لئے فراق ضروری ہے"۔

"لیکن اتنی تکلیف...... اس قدر سوچ کا وزن میں کیسے برداشت کروں گا...... اور پھر آپ یہاں کیا کریں گے اکیلے؟"

"جب فطرت اکیلا کر دے تو گھبرانا نہیں چاہئے جہانگیر...... یہاں ان کمروں میں تنہائی کی زندگی بسر کرتا میں بھی اپنے راستے کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اب مجھے علم ہو گیا ہے کہ مرد اور عورت کا اسلام اپنے جوہر میں ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ عورت پرورش کے لئے بنی ہے اور مرد کفالت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ پرورش کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے، لیکن جب بیٹا اپنی کفالت کے قابل ہو جاتا ہے تو باپ کی ضرورت نہیں رہتی...... پھر باپ کو بیٹے سے دست کش ہو جانا چاہئے"۔

"یہ غلط ہے جھوٹ ہے...... میں آپ سے کبھی بھی دست کش نہیں ہو سکتا"۔

"غور سے سنو بیٹا...... تم تفکر کرو تو جان جاؤ گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جد الانبیاء کا مسلک اور ہے اور بی بی ہاجرہ کسی اور راستے کی مسافر ہیں...... حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بت نکال کر پھینک دے۔ اسے سیدھے راستے پر چلنے والے پیغمبر بیٹے، گھوڑے مویشی باغ...... کھیتیاں عورتیں سب راستے کا روڑا ہیں۔ نبی کے لئے ان کی رغبت ٹھیک نہیں۔ جب مکان خالی ہوا تو مکین خود بخود آ جائے گا...... حضرت ابراہیم علیہ السلام بیٹے کی قربانی پر رضامند ہو گئے، لیکن عورت کے لئے اور حکم آیا تھا۔ بی بی ہاجرہ پرورش کی ضامن تھیں۔ وہ صفا و مروا کی پہاڑیوں پر دوڑتی رہیں۔ التجائیں

کرتی رہیں، روتی گڑگڑاتی رہیں حتیٰ کہ دودھ کے ابال کی طرح چشمہ نکلا تو بی بی ہاجرہ نے خوفزدہ ہو کر کہا...... زم زم...... رک رک...... پرورش کی ذمہ داری میں سرگرداں وہ بھاگتی رہیں اور آج کوئی عورت صفا و مروا کے مقام پر نہیں بھاگتی۔ بی بی ہاجرہ نے سب عورتوں کے حصے کی سعی کر لی۔ ان کی دعاؤں کے طفیل کل عالم اسلام آب زم زم کی زمزمیاں بھر بھر لاتے ہیں...... خود بھی اس پانی سے پاک ہوتے ہیں اور دوسروں کا میل بھی کاٹتے ہیں۔ عورت مرتے دم تک بچے کے لئے سرگرداں رہے عین سعادت! باپ بیٹے میں ضم ہو جائے حکم عدولی۔"

"آپ کی بات میں نہیں سنتا اباجی...... میں ایک لمحہ ایک دن آپ کے پیغمبر نہیں کاٹوں گا......"

"تمہیں وہاں کوئی تکلیف ہے......"

"جی نہیں......" جہانگیر بولا۔

میں نے اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا...... "بھائی میرے پھر بات تو سن لو...... آنول تو ماں بھی کاٹ دیتی ہے...... میں تو پھر صرف باپ ہوں"۔

"آپ جو مرضی کہیں...... آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا، پڑے گا چلنا...... میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا...... نہیں جاؤں گا۔"

"بھلے آدمی جد الانبیاء کا حکم ہے، بیٹے کے گرد طواف کرنے کے بجائے خانہ کعبہ کے چکر پھیرے کرو۔ اب ان کے آگے تیری بات کیا حیثیت رکھتی ہے......"

جہانگیر یکدم چپ ہو گیا

"اچھا جی......"

میں نے دل برداشتہ جہانگیر کے ہاتھ پر ابھروں رگوں بھرا اپنا ہاتھ رکھا اور آہستہ سے بولا...... "زندگی میں سیکھنے کے دو ہی طریقے ہیں، بیٹا۔ یا تو بڑوں کی بات مان لو اور شاہراہ کو اختیار کر لو یا پھر اپنے تجربوں کی پگڈنڈیوں پر چلتے پھرتے بند راستوں

میں سے لوٹتے ہوئے نروان حاصل کرو...... دیکھ لو پاٹلی پتر کا شا کیا منی باپ کی عطا کردہ راحتوں میں نہ رہ سکا......تم کو ہجرت کا راستہ اپنانا پڑا...... بھیا اب ہم دونوں الگ الگ ہیں۔آنول کٹ چکی ہے...... مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اور دیکھو کبھی پلٹ کر نہیں دیکھنا، ورنہ پتھر کے بن جاؤ گے“۔

مجھے چھوڑ کر جہانگیر چلا گیا۔پھر جہانگیر کی اطلاع کم کم ملتی رہی۔میرا بن باس اور جہانگیر کا نروان شروع ہو گیا۔ہم دونوں آگہی کی مختلف منزلوں میں بھٹک رہے تھے۔

خبر آئی اس کے دن مصروف رہتے ہیں۔ جمعے کی نماز وہ اسلامک سنٹر میں پڑھتا ہے۔دن پر دن اسلام کی طرف راغب ہوتا جا رہا تھا۔یہ بھی سنا کہ شاہدہ کو اسی بات کا خوف تھا کہ کہیں ایک دن بیٹھے بٹھائے جہانگیر حجاب پہنانے پر اصرار نہ کر بیٹھے۔ امریکہ جیسے **ملک** میں اسے ہر قسم کی آزادی تھی، روپے پیسے کی کمی نہ تھی ......لیکن یہ فکر اسے اندر ہی اندر پریشان رکھتی ......شاہدہ کو اسلام کی ساری باتیں پسند تھیں، لیکن وہ تعداد ازدواج اور حجاب سے اس درجہ خوفزدہ تھی کہ اسے جہانگیر بھی بنیاد پرست نظر آتا، شاہدہ کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔وہ جب سسرال میں تھی تو یہاں ہم دونوں تھے جن سے جہانگیر محبت کرتا تھا۔اپنے کارخانے دار باپ کے گھر چلی گئی تو وہاں جہانگیر کی غیرت تھی جو اسے پر پیچ کیے رکھتی تھی۔اب امریکہ میں اسے بنیاد پرستی سے خوف آنے لگا تھا۔نہ جانے یہ خوف اس کے اندر کب سے اور کیوں تھا۔ہر جنت کو یہی خوف کا کیڑا کھا جاتا ہے۔شاہدہ تبدیلی کی خواہش مند ہوتے ہوئے بھی اس سے سمجھوتہ نہ کر سکتی۔ تعداد ازدواج اور حجاب کا اسے ذاتی طور پر کوئی تجربہ نہ تھا، لیکن وہ اس سے ایسے خوفزدہ تھی جیسے ایڈز کی بیماری ہو اور اسے یہ بیماری لگنا ہی لگنا ہو۔اس کی ساری آزادی کو اس خوف نے غلامی میں بدل دیا تھا۔

بیلکونی میں بیٹھا میں سوچتا ہوں کہ امریکہ کا سب سے بڑا تضاد بیک وقت محبت کی طلب اور آزادی کی خواہش ہے......اور اب ٹھونک بجا کر امریکی فرد نے یہ فیصلہ

کرلیا ہے کہ محبت کا بندھن کبھی کبھی اور آزادی کی آب وہوا ہمیشہ رہنی چاہئے۔ آزادی کی یہ خواہش امریکہ کے معاشرے میں ایک بے اطمینانی پیدا کررہی ہے۔ انسان چونکہ تضاد سے بنا ہے، آگ اور پانی ے سنا جوگ کی وجہ سے تضاد اور دوئی کی خوبو اس میں ہمیشہ رہتی ہے۔ وہ آگ کی طرح بھڑکتا، لپکتا اور گرم کرتا ہے اور ساتھ ساتھ مثل پانی بجھاتا، بجھتا، بہتا اور سردبھی کرتا ہے۔ اس کی خوبی اس کی خرابی میں بدل جاتی ہے اور اس کی خرابی ہی اسے خوبی کا راستہ سمجھاتی ہے۔ اسی لئے یہاں ایک لمحہ فکریہ یہ بھی سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ کسی انسان پر تنقید کہاں تک جائز ہے۔ جس چور کو ہم سزا دلانے لے جارہے ہوں، شاید وہی قطب بن کر ہماری اور اپنی عاقبت سنوار دے۔ گو خرابی سے خوبی کا سفر یقینی نہیں، لیکن امکانات ضرور ہیں۔ اسی امکان میں اس کی خود مختاری پنہاں ہے...... اسی امکان میں اس کے سارے امکانات پوشیدہ ہیں۔ زندگی کے سفر میں ساری رنگینی، تڑپ اور اسرار اسی بنیادی دوئی میں اس کے اندیشوں میں چھپے ہیں۔ خوبی اور خرابی، جنگ و امن، حق و باطل خوشی و غم توام ہیں، زوج ہیں، خوبی کب خرابی میں بدل جاتی ہے۔ نیکی کو کب اور کیسے بدی کا چولا پہن لینا پڑتا ہے۔ غم کن حالات میں خوشی کو راہ دیتا ہے اور حق کی جنگ کب باطل میں بدلتی ہے۔ زندگی کا سارا سفر اسی ادل بدل کے سہارے گزرتا ہے۔

بیلکونی میں بیٹھ کر سوچتا ہوں۔ اقلیتوں کے مسئلے ترقی کی دوڑ اور اس سے وابستہ مسائل نے محبت کے عیسائی فلسفے پر سب سے کاری ضرب لگائی ہے۔ Free Will کی آزادی طاقت ور لوگوں کا مسلک ہے۔ مرضی اور اختیاری ارادہ انسان کو جہاں ترقی کا سبق پڑھاتا ہے۔ وہیں محبت سے آزادی حاصل کرکے انسان پر اعتماد ہو کر نفرت کرنے کو بھی اپنے بنیادی حقوق میں شامل کرلیتا ہے۔ جب تک حرت مسیح کا ٹکٹ سکہ چلتا تھا، کسی سے نفرت کرنے کے بعد لوگ احساس جرم میں مبتلا رہتے تھے۔ پادریوں کے آگے دستہ بستہ Confessions کرکے اپنے آپ کو پاک

کرتے رہتے تھے، لیکن اب محبت کی صلیب سے اتر کر اپنی مرضی کو کسی کی خاطر قربان کرنا آج کے سفید فام معاشرے کا شیوہ نہیں۔ ایسے عمل سے آزادی تلف ہوتی ہے اور محبت اور آزادی میں بنیادی تضاد ہونے کی وجہ سے امریکہ کے معاشرے نے آزادی کے حق میں ووٹ دے دیا ہے اور محبت سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔

آزادی اکیلے آدمی کا سفر ہے۔ رسی تڑوا کر سرپٹ بھاگنے کا عمل ہے۔ محبت ہاتھ باندھ کر اپنی خوشی اور اپنی آزادی کے پھول ارپن کر کے سرنے ہوڑائے اشکبار آنکھوں سے Free Will کو ارادی طور پر ساقط کرنے کا نام ہے۔ محبت اس غلامی کا طوق ہے جو انسان خود اپنے اختیار سے گلے میں ڈالتا ہے۔ یہ عہد پیری مریدی کا نہیں کہ مرشد منوانے اور سالک ماننے کے مقام پر ہو۔ یہ زمانہ شادی کا بھی نہیں کہ شادی میں بھی قدم قدم پر اپنی مرضی کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جس طرح اپنے بیٹے کو قربان کرنے پر راضی برضا رہے، یہ محبت کی ایک عظیم مثال ہے۔ محبت میں ذاتی آزادی کو طلب کرنا شرک ہے، کیونکہ بیک وقت دو افراد سے محبت نہیں کی جاسکتی، محبوب سے بھی اور اپنی ذات سے بھی۔ محبت غلامی کا عمل ہے اور آزاد لوگ غلام نہیں رہ سکتے۔

میں نے یہ دیکھا ہے کہ زیادہ محبت کرنیوالے عموماً اظہار محبت میں کوڑھ مغز ہوتے ہیں۔ وہ پھول اور چوکلیٹ لے کر محبوب کے دروازے پر حاضری دینا بھول جاتے ہیں۔ عام طور پر وہ دربان سے لیکر محبوب تک اپنی ذات کا گلدستہ ہی پیش کرتے رہتے ہیں۔ سٹ پٹا جانا، چپ لگنا، ہاتھ پاؤں پھول جانا، بغیر جواز پیش کیے چپ چاپ لوٹ جانا، محبت کرنے والوں کا وطیرہ ہوا کرتا ہے۔ آزادی پسند لوگ پوجا کرنے، آرتی اتارنے، مالا جپنے سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ آپ نے امریکہ کی پارکوں، بازاروں، ایئرپورٹوں، بسوں، ہوٹلوں میں ایسے جوڑے دیکھے ہوں گے، جن کے ہاتھ ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہو پاتے، جن کے بدن بیلوں کی طرح ایک

دوسرے سے لپٹے جاتے ہیں۔اس محبت میں ایسے درجے کا اعلان ہے جس کی توفیق آزاد عاشق کو کم کم ملتی ہے۔ یہ محبت کسی آئینے میں اپنی صورت دیکھتے رہنے کی ہوس ہے۔عاشق محبوب کے آئینے میں اپنی ہی ذات پر مفتون رہتا ہے۔امریکہ میں جہاں ہر شے چمکائی ستھرائی سجائی اور آئیڈیل بنائی جاتی ہے جہاں اپنے Product کو بہتر بنانے کا جنون ہے۔ یہاں محبت ایسے Perfectionist ہاتھوں سے بڑے عذاب جھیلتی ہے۔یہاں آزادی پسند عاشق پہلے محبوبہ تلاش کرتا ہے۔پھر اسے کبھی خوردبین لگا کر کبھی دوربین کی مدد سے بغور دیکھتا ہے۔محبت کی اولین سرشاری میں ہی محبوب کی سرجری شروع ہو جاتی ہے۔ اس کی عادتیں، کردار، عقل شکل، ماضی کی مناسبتیں، مشغلے سب کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں۔نفرت کرنے پر قادر آزاد انسان نکتہ چین بن جاتا ہے۔اب عاشق اور محبوب دونوں سچ کی بے نیام تلوار لے کر باہر نکلتے ہیں اور جونہی عاشق کی آنکھوں سے عقیدت واحترام کی عینک اترتی ہے، اسے محبوب کچھ ایسی تیس مارخاں نظر نہیں آتی ۔یہاں سے محبت کا سفر خاردار جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتا ہے۔آزادی کے طالب علم کے لئے زیادہ دیر زنجیر پا رہنا ممکن نہیں رہتا پھر اپنی بغل سے اپنا ہی بت نکال کر وہ از سر نو اس کی پوجا شروع کر دیتا ہے اور اسی لئے غیر کی محبت کا رہین نہیں رہتا۔مغربی معاشرے کا یہی المیہ ہے...... کہ یہاں محبوب کا ''ناٹھیک'' ٹھیک نہیں ہوا کرتا۔تھوڑی دیر کے لئے تو آزاد عاشق چاکری پر رضامند رہ سکتا ہے۔لیکن مستقل طور پر عموماً امریکی فرد کا یہ شعار نہیں۔

محبت نہ تو اپنی ذات کی نمائش ہے، نہ من وتو کی تفریق ہے۔امریکہ کے آزاد معاشرے کے لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر آپ کو اپنی ملازمت پسند نہیں تو فوراً بدل لیں۔ موسم راس نہیں آتا تو کسی ایسی ریاست میں بسیرا کریں جہاں موسم آپ کی طبیعت کے مطابق ہو، اگر بیوی ناپسند ہے تو معاشرے کے دباؤ بچوں کی خاطر اسے لٹکائے نہ پھریں۔جب بھی کوئی موسم حالت، جگہ انسان آپ کی شخصیت سے ٹکرائے، اسے فوراً

راستے سے الگ کردیں اور محبت کا جواء اتار کر آزادی کا کنکوا اڑائیں۔

مغربی معاشرے نے غالباً انسان کے اس بنیادی تضاد کو بھلا دیا ہے کہ وہ مجبور بھی ہے اور بااختیار بھی۔ محبت اور آزادی کے تضاد میں عموماً آزادی ہی جیت جایا کرتی ہے...... جہاں تک ایک پاؤں اٹھانے کا تعلق ہے ہم بااختیار ہیں، لیکن دوسرا پاؤں اٹھانے پر قادر نہیں۔ آزادی ہمیشہ پابندی سے مشروط رہے گی، اگر انسان تمام پابندیاں توڑ کر ساری اقدار سے مادر پدر آزادی حاصل کرکے زندہ رہنا چاہے تو اسے یا تو کسی پہاڑ کی چوٹی پر رہنا پڑے گا یا جیل کی کوٹھڑی میں۔ میں بھی آزادی کی تلاش میں ارجمند کے گھر آیا تھا۔ یہاں پر ایسی محبت حاصل ہوگی جس کا کئی برسوں سے میں عادی نہ رہا تھا۔ یہاں مجھے نہ آزادی کا احساس ہوا نہ محبت کا۔ ڈاکٹر بلال کا اپنا دائرہ کار ہے، ارجمند اپنی مصروفیت میں گم رہتی ہے۔ قیصر اور جمشید کے ساتھ پتہ نہیں کیوں میری اچھی Equation نہ بن سکی۔ وہ دونوں بھی اپنی روٹین کے تابع ہیں۔ چھوٹے چھوٹے میرے ساتھ وقت گزارنے کے بجائے ابھی سے کمپیوٹر کے اردگرد رہتے ہیں۔ کارٹون دیکھتے رہنا ان کی ہابی ہے۔ وہ برگر، چپس، کوکا کولا، جوس، چوکلیٹ کے رسیا ہیں۔ جب جی چاہتا ہے فریج کھول کر کچھ نہ کچھ نکالتے اور کھانے لگتے ہیں۔ وہ اپنے معاملات میں ابھی سے آزاد ہیں، انہیں نہ کسی سے اجازت لینے کی ضرورت ہے، نہ انفورم کرنے کی۔ اس طرح ارجمند پر ان کی پرورش کا بوجھ کم ہوتا ہے۔ لاتعلقی بڑھتی تھی تو یہ بھی اس کی ضرورت تھی، کیونکہ ایسے میں اسے آزادی بھی زیادہ ملتی، لیکن محبت کئے بغیر کسی دوسرے انسان کو نہ کوئی جان سکتا ہے، نہ جان دے سکتا ہے۔ ریستورانوں، کلبوں میں، تفریحی پروگراموں میں ہمدردی پیدا ہوسکتی ہے۔ Infatuation کا روگ لگ سکتا ہے، محبت ممکن نہیں۔ سب سے زیادہ ماں بچے پر وقت ضائع کرتی ہے، لیکن یہ وقت ضائع ہو کر ایک ایسی نعمت میں بدل جاتا ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ مغربی لوگوں نے کام کے حق میں ووٹ دے کر مشرقی

لوگوں کی اس فلاح کو کھو دیا ہے، جہاں وقت کو ضائع کر کے ہی محبت ملا کرتی ہے۔
Support System با معنی ہوتا ہے۔ رشتہ داریاں چلتی ہیں۔ پیری مریدی
کا سلسلہ قائم ہوتا ہے اور ضائع وقت سونے میں بدل جاتا ہے۔

اس اینٹی محبت کا معاشرہ قائم کرنے میں اقلیت نے بنیادی کام کیا ہے۔ سفید فام واضح طور پر اینٹی محبت پر عمل کرتے ہیں۔ چونکہ مغربی لوگ محبت کو جزو ایمان نہیں سمجھتے، اس لئے انہوں نے احساس جرم تلے خیراتی ادارے کھولے ہیں۔ ویل فیئر سٹیٹ بنا کر بے روزگار، پس ماندہ لوگوں کی مدد کی ہے۔ بوڑھے لوگوں کے ادارے بنائے ہیں۔ جہاں بڈھے موت کے انتظار میں درست دوائیاں، طاقت افزا وٹامن، خوراک، آرام حتیٰ کہ تفریح بھی باقاعدگی سے کرتے ہیں، لیکن ان بڈھوں سے محبت کوسوں دور رہتی ہے۔ وہ Volunteers اور وقت بے وقت آنے والے مہمانوں کو انتظار میں خالی دن خالی راتیں بسر کرتے ہیں۔ Baby Care Day Care سنٹر کے پاس بچہ چھوڑا بھی جا سکتا ہے اور پل بھی جاتا ہے، لیکن نہ اسے ماں کا دودھ ملتا ہے، نہ ماں کی محبت کا شہد آگیں رس اس کی رگوں میں دوڑتا ہے۔ اپنے اپنے کاموں کے بعد ساتھی پر کام کی تھکن، اضطراب اور ڈیپریشن نکالنے کا نام شخصی آزادی ہے۔ کام کے بعد دونوں ساتھی خیں خیں کر کے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ کوئی بھی تازہ دم کرنے والی محبت پر وقت اور توجہ صرف کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ گھر پر بھی کاموں کی زیادتی منہ کھولے دونوں کو ہڑپ کرنے پر آمادہ نظر آتی ہے، ہو سکتا ہے کہ اس اینٹی محبت کا الزام ہم صنعتی انقلاب پر دھریں اور ترقی کی خاطر ان قربانیوں کو درست جانیں جو آج کا ماڈرن تعلیم یافتہ آدمی دے رہا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ جب محبت حاصل نہیں ہوتی تو آدمی کھاتا ہے، لیکن سیر نہیں ہوتا۔ مکان قسطوں پر حاصل کر لیتا ہے، لیکن وقت کی کمی کے باعث مکینوں سے بچھڑ جاتا ہے۔ محبت کی تلاش چھوڑ کر جنس کا لٹیرا ڈانس میں تھرکتا ہے، لیکن روح پیاسی رہتی ہے، بازاروں کے

طواف کر کے زیبائش، آرائش، نمائش کی اشیاء خریدتا رہتا ہے، لیکن ان اشیاء کی قسطیں گننے کے بعد انہیں انجوائے نہیں کر سکتا، کیونکہ وقت اور محبت کی قلت اسے نہ تو کسی چیز سے، نہ ہی کسی انسان سے رابطہ قائم کرنے دیتی ہے اور نہ ہی اس کمی کے متعلق سوچنے کی مہلت فراہم کرتی ہے۔

اینٹی محبت معاشرہ قائم کرنے میں اقلیتوں سے نفرت نمبر ا اہم کام کیا ہے۔ کالے، براؤن، چپٹی ناک والوں سے چونکہ محبت نہیں کی جا سکتی اس لئے ان کو آزادی دے کر اور خود ان سے گلو خلاصی کرنے کے لئے آزادی حاصل کرنا ضروری ہے۔ مشرق معاشرے میں ابھی لوگ محبت کے پیاسے ہیں اور پریم جل کے بغیر ان کی پیاس نہیں بجھتی۔ رشتے ناطے ابھی جذبوں میں گندھے ہیں یا وقت کو سونا بناتے ہیں۔ ہم بچھڑے لوگوں کی یادوں کو مختلف موسموں میں ازسر نو تلاش کرنے میں وقت ضائع کرتے ہیں۔ نغمہ، چاندنی اور چہرہ ابھی بے ربط نہیں ہوئے۔ مغرب اور مشرق اسی لئے کبھی مل نہیں سکے کہ ہماری سوچ مختلف ہے۔ امریکہ خاص طور پر اور سفید فام مغربی معاشرہ عام طور پر محبت سے بچھڑ چکا ہے۔ سفید فام لوگوں نے جان لیا ہے کہ محبت کا سفر دراصل صحرائی لوگوں کو راس آسکتا ہے اسی لئے انہوں نے فرد کے لئے آزادی کا دریچہ کھول کر اسے پہنائیوں میں تنہا اڑنے کی دعوت دی ہے، بلکہ اسے تنہائی پر اکسایا اور ترغیب دلائی ہے...... ایسے معاشرے میں انسان راضی برضا نہیں رہ سکتا، نہ مزاج یار کے تابع رہ کر زندگی بسر کر سکتا ہے۔ مشرق کے سفر میں نفس کو ساقط کر کے نروان تک پہنچا جا سکتا ہے۔ مغرب میں شخص کے ماتھے پر تلک لگا کر گلے میں ہار منہ میں گلوری دبا کر حواس خمسہ کی گاڑی میں بیٹھ کر لذت کا سفر کیا جاتا ہے۔ محبت کا سفر محبت کی خاطر ہو یا اللہ کے لئے اختیار کیا جائے تو اس میں آنسو، صبر اور ایثار ہی ایثار کا موسم رہتا ہے۔ یہاں شاید خوشی نہیں ملتی، لیکن شانتی اور قناعت ضرور ہم رکاب رہتی ہے۔ حدود سے نکلنے کی آرزو نہیں رہتی۔ محبت کی سرشاری میں انسان حاکم نہیں محکوم

بنتا ہے۔ دوسروں پر ضرب کاری لگانا اور ان سے آگے نکل جانا ممنوع ٹھہرتا ہے۔ آزادی کی ابابیل دوسروں سے آگے اڑنے کو اپنا طرہ امتیاز بناتی ہے۔ مسابقت کی فضاء اسے راس آتی ہے، آزادی کا منطقی تقاضا ہے کہ وہ کسی ایمان، چاہت یا فعل کی نفی کرتے ہوئے احساس جرم میں مبتلا نہ ہو۔ جہاں محبت ذات کی نفی میں لگی رہتی ہے، وہاں آزادی کا مرکزی Spindle ہی شُھا یا Self ہے۔ اسی کے گرد زندگی کے سارے محرکات چکر لگاتے ہیں۔

جس گزبو کا میں بار بار آپ سے ذکر کرتا ہوں، وہ دراصل لکڑی کا بنا ہوا ایک کنڈ ہے جس کا اندر لکڑی کی بنچیں ہیں۔ ایک جانب سے رستہ کھلا ہے اور اس کی چھت چوبی ستونوں کے سہارے کھڑی ہے۔ اس کنڈ کی کوئی دیوار نہیں۔ یہ لکڑی کے ڈنڈوں کے سہارے کھڑا ہے اسی لئے ہر موسم میں یہ ہوادار رہتا ہے۔ ہوائیں، بارشیں، منظر آسانی سے نظر آتے ہیں۔ اس گزبو کے نشیب میں امریکہ کا ایک گنجان جنگل ہے جس میں اونچے اونچے درخت ہری بھری جھاڑیاں، درختوں سیلپٹی بیلیں، سرسبز گھاس، پرندے، بے ضرر جانور آزاد پھرتے ہیں۔ آسمان کی جانب منہ کر کے دیکھیں تو کبھی کبھی سوپرسونک جہاز دھوئیں کی لمبی دم چھوڑتے بھی نظر آئیں گے، تھوڑی دیر کے لئے ذہن سائنسی ترقی پر حیران ہوتا رہتا ہے۔ اس کی برکات گننے میں مشغول رہتا ہے، لیکن پھر قدرتی مناظر اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔

پکی سڑک سے اتر کر میں اس ٹاور نما جھونپڑے میں داخل ہوتا ہوں۔ بنچیں بالکل صاف ہیں۔ دھول نما کوئی چیز نہیں۔ یہاں نیلگوں آسمان پر، پتوں کی چکنی جلد پر، سڑکوں پر مٹی نہیں ہوتی۔ مجھے لاہور کی آندھیاں یاد آ جاتی ہیں جو مئی کے مہینے میں ہر جگہ سے مٹی اٹھا کر لاتی ہیں۔ صبح اٹھیں تو فرشوں پر چیزوں پر مٹی کی ہلکی سی تہہ پڑی نظر آتی ہے۔ اس شفاف ماحول میں نہ جانے کیوں جی چاہتا ہے کہ کہیں سے مٹی کا بگولا اڑتا آئے اور گزبو کی بنچوں پر سستانے کے لئے رک جائے۔ میں بگولے سے

پوچھوں...... ''یہاں کہاں بھائی، وطن سے کیوں بچھڑے؟''

وہ جواب دے ''امریکہ میں کڑکنے والی بجلی اور گرجنے والے طوفان سے ملنے آیا ہوں۔ سنا ہے جب یہاں سردیوں میں بجلی پورے گھن گرج سے چمکتی ہے تو چڑیا گھر کے شیر بھی بدک جاتے ہیں۔''

میں کہوں ''پر تیرا یہاں کیا کام...... گھر چل وہاں جھاڑو بہارو پھیرنے والیاں تجھے یاد کرتی ہیں۔''

وہ بزبو میں منہ چھپا کر کہے...... ''اے بڈھے تجھ سے کس نے کہا یہاں مجھے یاد کرنیوالے نہیں ہیں۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ یہاں بھی ایسے لوگ بستے ہیں جو اپنے شہر کی گلیاں، گلیوں میں بیٹھی مٹی، تانگوں کے ٹب اڑا دینے والی آندھیوں کو یاد کرتے ہیں''۔

ابھی آندھی کا بگولہ یہاں سے رخصت ہو کر تین منزلہ کونڈوز کے پیچھے چھپا ہی تھا کہ لمبی روبینہ آ گئی۔ اس عورت سے کبھی کبھی میری ملاقات اسی گزبو میں ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ایک واکر میں تین سالہ بچی ہے۔ یہ بچی شکل وصورت میں لبنان سے امپورٹ کی ہوئی لگتی ہے، جبکہ روبینہ کا حسن سندھی لڑکیوں جیسا ہے۔ ستواں ناک، تراشیدہ ہونٹ، کتابی چہرہ...... روبینہ مجھے سلام کرنے کے بعد بچی کو واکر سے آزاد کر دیتی ہے...... میں بچی کا نام بھول چکا ہوں۔ مجھے تو روبینہ کا نام بھی یاد نہیں۔ شاید اصل نام کچھ اور ہی ہو، لیکن وہ مجھے سلام کرنے کے بعد بنچ پر میرے سامنے بیٹھ جاتی ہے۔

''کیا حال ہے ثمینہ......'' میں کہتا ہوں

''ٹھیک ہے...... میرا نام روبینہ ہے جی''۔

''ہاں بھئی اب نام یاد نہیں رہتے'' میں شرمندہ سا ہو کر کہتا ہوں۔ کیا بتاؤں یادیں مجھ سے کیسی آنکھ مچولی کھیلتی ہیں؟

''کوئی بات نہیں جی...... میں ڈاکٹر حسن کی بیوی ہوں۔''

مجھ پر حسن نامی ڈاکٹر کی کوئی حالیہ یاد نہیں ابھرتی...... حال مجھ سے بچھڑ چکا۔ میرے بڈھے نیوران حالیہ یادوں کو محفوظ نہیں کر سکتے۔ میں پچھلی یادوں کی مچھلیاں پکڑنے میں دن گزارتا ہوں اور مستقبل میں میرے لئے صرف فنا ہے جس کے لئے میں تیار نہیں ہو پاتا۔

''ہم جی...... میں نے پچھلی بار آپ کو بتایا تھا کہ ہم لوگ دس سال سے یہاں ہیں''۔

مجھ پر کوئی پچھلی بار منکشف نہیں ہوتی، لیکن میں ہاں ہوں کرتا ہوں۔

''بات یہ ہے چاچا جی...... کہ دس سال سے یہاں رہنے کے بعد بھی یہاں کی سوسائٹی میں دل نہیں لگا۔ حسن تو چاہتے ہیں کہ واپس چلے جائیں، لیکن بچے رضامند نہیں ہوتے''۔

میں گھنگھریالے بالوں والی گوری چٹی بچی کو گراس ہوپر پکڑتے دیکھتا ہوں۔ مجھ پر اس کے دوسرے بچوں کی عمر، شکل قد کوئی بھی چیز واضح نہیں۔

''جب ہم یہاں آئے تھے تو ہمارا خیال تھا کہ یہ جلاوطنی چند سال کی ہے، لیکن پھر یہاں کی زندگی دلدل بن گئی۔ روزی کمانے آئے تھے۔ اب یہاں کے ہی ہو رہے ہیں۔ کچھ سمجھ نہیں آتا...... کیا کریں چاچا جی۔ وطن بھولتا نہیں اور تن آسانی واپس نہیں جانے دیتی''۔

''سمجھ کے کیا لینا ہے بی بی...... ہجرت بھی ایک سنت ہے۔ آپ اس پر عمل کر رہی ہی خیر ہے!''

''اب تو یہی بات حسن بھی کہتے ہیں...... لیکن جی ہم تو دین کی خاطر نہیں آئے پھر یہ...... ویسی ہجرت تو نہ ہوئی ناں نبی ﷺ والی......''

''ایسی ویسی نہ سوچو...... ہجرت بھی اپنے اپنے ظرف کے مطابق کی جاتی ہے تم روزی کی خاطر آئی بیٹھی ہو یہی بہت کافی ہے...... یہاں رہو اچھا کھاؤ، اچھا پہنو، اچھا

معیارِ زندگی اپناؤ، بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلاؤ باقی سب بھول جاؤ...... بس یہ سمجھو اصلی ہجرت نہ سہی اس کا سایہ پکڑ لیا۔"

تعلیم سے مجھے یاد آیا کہ یہاں کی رپورٹوں کے مطابق امریکہ میں ہر دس سیکنڈ کے بعد ایک بچہ سکول چھوڑ دیتا ہے۔ چھٹی جماعت میں پڑھنے والے بیس فیصد بچوں کو یہ بھی علم نہیں کہ دنیا کے نقشے پر امریکہ کہاں ہے۔ ہر سال قریباً سات لاکھ طالب علم پڑھے لکھے جاہل بن کر گریجوایٹ کہلاتے ہیں۔

امریکہ میں پبلک سکول کی تعلیم روز افزوں تنزلی کی طرف مائل ہے۔ اس کا کچھ کیا جانا چاہیئے، لیکن میں روبینہ کے ساتھ گفتگو کو دو ہزار یہ کی اس رپورٹ کے مطابق بتانا نہیں چاہتا۔ شاید میری باتیں سن کر وہ اور بھی الجھ جائے۔

"حسن کا زیادہ وقت تو مسجد میں گزرتا ہے۔ وہ اسلامک سنٹر کے پرجوش رکن ہیں" روبینہ کہتی ہے۔

"آپ امریکن سوسائٹی میں مدغم نہیں ہو پائے؟" میں پوچھتا ہوں۔

وہ تھوڑی دیر اپنے بائیں ہاتھ کے ناخنوں کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔ پھر کچھ اکھڑے سے لہجے میں کہتی ہے۔

"چاچا جی عجیب سی مشکل ہے، لیکن آپ سے کیا پردہ ...... جب ہم پاکستان میں تھے تو ہم دونوں کچھ ایسے پکے مسلمان نہیں تھے۔ میں نے کبھی سر پر دوپٹہ نہیں لیا تھا۔ حسن صرف عیدوں پر نماز پڑھنے مسجد جایا کرتے تھے، لیکن یہاں آ کر ہم نے دیکھا کہ یہاں کا بہاؤ تیز ہے۔ اگر ہم نے اپنی شناخت قائم نہ رکھی تو ہم بہہ جائیں گے، اکثریت کے ساتھ۔ ان دم چھلا بن کر۔"

"وہ تو ہے...... اکثریت چیز ہی ایسی ہے...... اس کے فطرتی بہاؤ کے کیا کہنے؟"

"یہاں چاچا جی صرف وہ مسلمان امریکنوں سے میل جول رکھ سکتے ہیں جنہیں نہ تو یہ فکر ہو کہ ذبیحہ گوشت کوئی چیز ہوتی ہے، نہ انہیں شراب پر کوئی اعتراض ہو، نہ ہی مرد

اورعورت کے باہمی آزادانہ میل جول پر ہی برا مانیں...... اگر ان تین چیزوں کا کچھ بھی خیال ہے تو رابطے بن نہیں سکتے...... جیسے برصغیر میں ہندو مسلمان صدیوں ساتھ رہے، لیکن گھل مل نہ سکے۔''

''آخر ڈاکٹر حسن ہسپتال میں تو امریکنوں سے ملتے ہی ہوں گے۔ان کا تو روز کا ساتھ ہے ان لوگوں کے ساتھ......''

''حسن بڑے شفیق ڈاکٹر ہیں...... میں نے آپ کو بتایا تھا ناں Pediatrician ہیں مائیں ان پر بڑا اعتماد کرتی ہیں۔بچوں سے حسن کا ویسے بھی رویہ بہت نرم ہے، لیکن وہ میل جول کو بڑھنے نہیں دیتے...... ان کا خیال ہے کہ اگر آنا جانا بڑھ گیا تو پھر ہم امریکن طرز سوچ کو روک نہیں سکتے۔حسن کو تو اصرار ہے کہ بچے گھر پر اردو بولیں، لیکن وہ بے وقوف آسان راستہ اختیار کرتے ہیں۔ہم اردو میں بات کرتے ہیں، وہ انگریزی میں جواب دیتے رہتے ہیں۔باتیں ساری سمجھ لیتے ہیں، لیکن اردو کو استعمال نہیں لاتے......''

''ہاں یہ مشکل تو ہے...... یہاں کے بچوں کی۔''

''مشکل نہیں چاچا جی ...... بڑی مشکل ہے۔آپ کو تو پتہ ہے میرا بیٹا عارف میڈیکل میں داخل ہوگیا ہے۔بڑی بیٹی ڈنٹسٹ بن رہی ہے...... اب ان سے تو یہ امید بیکار ہے کہ وہ اردو پر توجہ دیں۔یہ میری سارا بھی کچھ مہینوں میں مونٹی سوری میں چلی جائے گی...... پھر یہ بھی فرفر انگریزی بولے گی۔اردو تو گئی ناں ہاتھوں سے، پنجابی تو دور کی بات ہے۔''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں ثمینہ......''میں نے غلط نام سے اسے پکارا۔

''نہیں چاچا جی آپ سب کچھ کہہ سکتے ہیں''۔آپ ہمارے بڑے ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ آج کل چھوٹوں کا زمانہ ہے۔آپ کی مان کر بھی ہم وہی کچھ کریں گے جو چھوٹے کہتے ہیں۔اس دور میں بڑوں کی مان کر بڑے پتھریلے راستے پر چلنا

پڑتا ہے۔''

''آپ واپس نہیں جا سکتے......''

''تین سال پہلے گئے تھے جی۔ حسن نے وہاں سیٹل ہونے کی کوشش بھی کی تھی...... پر وہاں کے لوگوں نے ہمیں اپنایا نہیں۔ کچھ راستے بدل گئے...... چا چا جی ہم لوگ اس بات پر کلیئر نہیں ہیں کہ ہمیں دراصل کیا چاہئے مغرب یا مشرق...... دین یا دنیا...... ترقی یا فلاح...... جب ہم نے پاکستان بنایا تو قائداعظمؒ پر تو یہ بات واضح تھی کہ ہم الگ ملک میں کیوں رہیں گے، لیکن ہم پر ابھی تک یہ بات نہیں کھلی کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ کیا ہمیں دنیا درکار ہے کہ آخرت؟ پتہ ہے ہم اس قدر مضطرب کیوں ہیں؟ ہمارے بڑوں نے میں بتایا نہیں''۔

''میں نے بھی کبھی سوچا نہیں بیٹی......''

''جو آدمی کسی فیصلے پر پہنچ جاتا ہے وہ مضطوب نہیں رہتا...... جو سوچ کر بار بار اسے دوہراتا رہتا ہے، وہ الجھنوں کو دعوت دیئے جاتا ہے...... ہم ساری اقلیتیں جو امریکہ میں رہتی ہیں، بار بار فیصلوں پر نظر ثانی کرتی ہیں، اسی لئے ہمارے مسائل ختم ہی نہیں ہوتے، نظر ثانی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔''

اس وقت اترائی کی جانب سے خوبصورت سا سفید خرگوش جھاڑیوں سے نکل آیا اور چپ گڑپ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ننھی سارا نے یکدم ماں کا ہاتھ پکڑ کر اسے خرگوش کی طرف گھسیٹنا شروع کر دیا۔

''یہ اقلیت بھی عجیب چیز ہوتی ہے چا چا جی...... ٹھہر جا...... ٹھہر سارا...... گھسیٹ ناں میں چلتی ہوں...... بابا چلتی ہوں......''

اپنے ہی بچے کے اصرار پر روبینہ کھچ گئی۔

''کیا عذاب ہیں یہ بچے بھی۔ اچھا کرتی ہیں یہ امریکن عورتیں بچہ ڈے کیئر میں...... خود آزاد ہم کو تو رواتیں، رسم و رواج لے ڈوبے...... شٹ۔''

وہ بچی کے اصرار پر جنگل میں اتر گئی۔ اس کے اترنے کے چند لمحے بعد خرگوش کہیں غائب ہوگیا۔ میں نے کچھ لمحے اس کا انتظار کیا۔ پھر سڑک پر لوٹ آیا۔ وہ درختوں کی اوٹ میں ہوگئی تھی۔ بارش کے آثار پیدا ہو چکے تھے اور میں اپنی چھتری گھر بھول آیا تھا۔ لیکن جونہی میں سڑک تک آیا روبینہ اپنی بچی کی انگلی تھامے سامنے سے آتی دکھائی دی۔ بارش سے پہلے ہوا ذرا تیز رفتاری سے چل رہی تھی، روبینہ نے ہوا میں ہاتھ لہرا کر مجھے اللہ حافظ کہا، لیکن میں رک گیا۔

''میں پہلی بار نیچے گئی تھی، چاچا جی مجھے تو بڑا خوف آیا......'' وہ قریب آ کر بولی۔

''تم مجھے کہہ دیتیں۔ میں تمہارے ساتھ چلا چلتا......''

ہم دونوں ایک بار پھر گیز بو کی طرف چلنے لگے جہاں چھوٹی سارا کی پش چیئر پڑی تھی۔

''چاچا جی پردیس میں خوف کیوں آیا ہے؟''

میں نے دماغ پر زور دے کر سوچا۔ بھلا پردیس میں کیوں خوف آتا ہے؟...... کیا اپنے وطن میں خوف بھی حفاظت میں لپٹا ہوتا ہے۔

''نئی چیز، جگہ، واقعہ اس لئے خوف کا باعث ہوتے ہیں کہ انسان جس چیز کو نہیں جانتا جس سے اس کی واقفیت نہیں ہوتی، وہ خوف کا باعث بنتی ہے''۔

''کئی بار بہت واقفیت کے باوجود خوف کم نہیں ہوتا۔ چاچا جی سارا بکھیڑا اقلیت ہونے کا ہے۔ ہم جانتے ہیں اگر کہیں غلطی سے شبے میں ناواقف کے باعث ہم پھنس گئے تو پھر ہمانے بچنا نہیں...... حسن تو بالکل اپنے دادے کی طرح ہوتے جا رہے ہیں چاچا جی...... اب تو انہوں نے داڑھی بھی رکھ لی ہے۔ میں ان سے بار بار کہتی ہوں۔ بھائی اگر یہاں رہنا ہے تو لبرل ہونا پڑے گا۔ ایسے داڑھی واڑھی رکھنی ہے تو گھر چلیں۔ کیوں چاچا جی میں ٹھیک کہتی ہوں ناں...... داڑھی والے آدمی سے لوگ ایسے ہی بدک جاتے ہیں''۔

''بھائی ٹھیک ہی کہتی ہو۔ بنیاد پرستی اب الزام ہو گیا، پہلے یہ خوبی تھی''۔

''چاچا جی ایک بات میں سمجھ چکی ہوں...... لیکن ڈر لگتا ہے کہتے ہوئے''

''کیوں؟...... کیوں ڈر لگتا ہے''

''لوگ کہیں مجھے مار نہ ڈالیں''

''ایسی بھی کیا بات ہے؟''

''وہ چاچا جی ...... خود مسلمان اب چاہتے ہیں کہ اسلام میں کچھ ایسی تبدیلیاں آ جائیں جن کی وجہ سے ہم دوسری قوموں کے ساتھ آسانی سے رہ سکیں۔ آج کا ماڈرن تعلیم یافتہ مرد اسلام کے سارے رکن مانتا ہے، لیکن جہاد کے متعلق شبہات میں گرفتار ہے۔ وہ جہاد بالنفس کو تو پھر بھی مان لے گا، لیکن دوسرا جہاد...... تلوار والا اس کے لئے وہ ایمان کہاں سے لائے؟ وہ چاہتا ہے کہ یہ سیف والا جہاد کسی طرح لبرل پانیوں سے دھل جائے۔ جب دنیا میں یو این او ہے، ہیگ میں انٹرنیشنل جھگڑے نپٹائے جا سکتے ہیں، ہر ملک میں اپنا قانون بھی ہے تو پھر جہاد کیسا اور کیوں؟''

''تم ٹھیک کہتی ہو ثمینہ''۔

اس نے اپنا نام درست نہ کرایا اور بولتی گئی۔ ایسے ہی چاچا جی عورت کے لئے حجاب بڑی زحمت بنا ہوا ہے۔ وہ اسلام کی ساری باتیں مان سکتی ہے، لیکن پردہ نہیں کر سکتی۔ کبھی وہ کہتی ہے پردہ آنکھ کا ہوتا ہے، کبھی نعرہ لگاتی ہے کہ پردہ دل میں کرنا چاہئے۔ پردے کو تو میں بھی نہیں مانتی چاچا جی...... یہاں آ کر تو کوئی بے وقوف ہی حجاب لے گی ہے ناں۔''

''ہاں آج کے عہد میں جہاد اور پردہ مشکلات تو پیدا کرتا ہے ناں''۔

''چاچا جی اگر اپنے ملک میں ہوں تو پھر تو اور بات ہے۔ یہاں اقلیت بن کر ایسی باتوں کا جواب دینا مشکل ہے۔ چاچا جی ...... چاچا جی ...... اقلیت ہمیشہ کٹہرے میں کھڑی ہو کر کیوں زندگی بسر کرتی ہے۔ اس کے ہاتھ پلے کچھ نہیں ہوتا۔ وہ کب

تک احساسِ کمتری میں مبتلا اپنے ہونے کا جواز پیش کرتی رہے کب تک؟''

میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا، کیونکہ میرے پاس اسے دینے کے لئے کوئی جواب تھا ہی نہیں۔

ہم دونوں چپ چاپ چلنے لگے۔

''آپ مجھے ایک بلاک پیچھے تک چھوڑ آئیں گے چاچا جی۔ بارش سے پہلے جو ہوا چلتی ہے مجھے اس سے بڑا ڈر لگتا ہے۔''

''ضرور......'' مجھے معاً وہ چھتری یاد آ گئی جو میں گھر بھول آیا تھا۔ میں بھی بارش میں بھیگنے سے بہت ڈرتا ہوں۔ لمبے زکام ...... دمیم کا اٹیک ...... کورٹیوزون ...... سانس کا اکھڑنا...... لمبی پکڑ...... پر کیا کرتا ہے...... وہ ڈرتی جو تھی۔

''پتہ ہے چاچا جی! ان دنوں ہم چوبرجی کے پچھواڑے رہتے تھے۔ تب وہاں زیادہ آبادی نہیں تھی۔ ایک دوپہر کو کالی آندھی آئی...... ہم گراؤنڈ میں کھیل رہے تھے میرا دوپٹہ ہوا میں اڑ گیا...... میں اس کے پیچھے بھاگی۔ کچھ دیر تو دوپٹہ آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ پھر غائب ہو گیا۔ میں آندھی میں بھاگتی رہی پھر ایک درخت تلے بیٹھ رہی۔ کوئی گھنٹہ بھر آندھی کا زور رہا...... میں بیٹھی رہی بیٹھی رہی چاچا جی، لیکن مجھے ڈر نہیں آیا...... ایسا ڈر نہیں آیا جو اس ہوا سے آ رہا ہے......''

آندھی میں دوپٹہ گنوا بیٹھنے والی لڑکی کے خوف کو سمجھنے کی کوشش میں ہم دونوں دوسرے بلاک میں پہنچ گئے۔

واپسی پر مہابھارت یاد آ گئی۔ رانی دروپدی کے پانچوں وہر تھے اور جب جلکش نے راجہ یدھشٹر کے بھائی مار ڈالے تو مہاراج ادھیراج کو بہت دکھ ہوا۔ بڑے جتن سے جلکش کو پکڑا گیا۔ جب راجہ یدھشٹر کے سامنے جلکس پیش ہوا تو راجہ نے کہا ''دیکھ جلکش تو نے بلاوجہ میرے بھائی قتل کر ڈالے...... رانی دروپدی کے سہاگ سے کھیلا کہ وہ بھی اس کی مانگ کا سیندور تھے۔

جلکش بولا...... ''مہاراج یہ درست ہے کہ میں نے تیرے بھائی مار ڈالے اور درو پدی کا سہاگ اجاڑا، پر اس کی وہ وجہ نہیں جو تو سمجھتا ہے''۔

''پھر اصلی وجہ بیان کر......''

جلکش بولا...... ''اے مہاراج مجھے آج تک اپنے سوالوں کے جواب نہیں مل پائے۔ جب یہ سوال مجھے بے چین کرتی ہیں تو میں غصے میں بھوت بن جاتا ہوں...... نہ مجھے دھرم اچھا لگتا ہے نہ انتی...... نہ میں سیدھا مارگ سمجھتا ہوں نہ اندر رہنے کا بھید بھاؤ جو راستے میں آتا ہے مٹا ڈالتا ہوں۔''

''مجھ سے پوچھ جلکش میں تجھے شانتی کا مارگ سمجھاؤں گا...... پھر تیرے دل سے راجہ بننے کی چنتا، محلوں میں جیون بسر کرنے کا لالچ اور استریوں کا لوبھ نکل جائے گا''۔

جلکش نے ہنس کر کہا...... ''اچھا بتا پھر دھرتی سے وزنی کون؟''

یدھشٹر بولا...... ''ماں''۔

جلکش نے وچھا اور ''آکاش سے اونچا؟''

''باپ''۔

''ہوا سے تیز رفتار؟'' جلکش نے سوال کیا۔

''من''۔

''گھاس سے زیادہ پیدا ہونے والی چیز؟''

''مکر''

''اور پردیسی کا رفیق کون ہے'' جلکش نے پوچھا۔

''سلوک'' یدھشٹر نے جواب دیا۔

''گرہستی کا دوست''۔

''عورت''۔

''اب تو پھنسے گا راجہ۔ یہ بتا اکیلا پھرنے والا کون'' جلکشن ہنسا۔

''سورج''

جلکشن چند لمحے چپ رہا پھر بولا...... ''اس دنیا میں بے فکری کیسے پراپت ہو''۔

''غصہ مارنے سے''۔

جلکش حیرانی سے گویا ہوا...... ''جسے دنیا کی ترقی درکار ہو اور نہ ملے، بتا اس کا دکھ کیسے ہرن ہو......''

یدھشٹر بولا...... ''لالچ اور محبت دور کر کے......''

جلکشن نے ابرو اٹھائے اور پوچھا ...... ''یہ بتا وہ کونسا مرض ہے جو کبھی دور نہیں ہوتا''۔ یدھشٹر اس بار ہنسا ''دیکھ ادھرمی لالچ و حرص ایسا مرض ہے جو کبھی دل سے دور نہیں ہوتا۔ یہ چولا بدل بدل کر آتا ہے''۔

''کیا دھن دولت کے لئے اس دنیا کے لئے جتن کرنا چاہئے؟''

یدھشٹر نے کہا...... ''دیکھ اپرادھی آدمی صرف دھرم کے لئے جتن کرنے آیا ہے۔ جو دھرم کا پلڑا پکڑتے ہیں۔ دھرم ان کی حفاظت کرتا ہے۔ ورنہ نرک میں داخل ہونا آسان ہے۔ ہر بے دھیان کام کرودھ، لوبھ ہنکار کے راستے ہی تو نرک میں قدم رکھتا ہے......''

جلکش نے سر جھکا کر کہا...... ''مہاراج تجھے اختیار ہے جو چاہے میرے ساتھ کر۔ میں اپنا آپ تیرے قدموں میں ارپن کرتا ہوں......''

جلکش کے سوال حل ہوئے، لیکن میرے اندر ترقی اور فلاح کی قینچی سے سب کچھ کٹتا رہا۔

بیلکونی ٹائم میں پلاسٹک کی کرسی سے پشت لگا کر میں نے سوچا......شاید روبینہ کی بات درست ہے۔ ہر اقلیت خوفزدہ رہتی ہے۔ وہ مکمل طور پر اپنی شناخت بھی گنوانا نہیں چاہتی۔اسی لئے مور پنکھ لگا کر اکثریت میں ضم ہونا بھی اس کے لئے ممکن نہیں۔

یہی دوہری خواہش اس کے خوف کو گھمبیر بنا دیتی ہے، لیکن کبھی کبھی معاملہ اس سے الٹ بھی ہو جاتا ہے۔ کمزور اکثریت کو طاقتور اقلیت سے پالا پڑ جاتا ہے، برصغیر میں مسلمانوں کو اپنی شناخت قائم رکھنے کے لئے کئی بار مختلف قسم کے امتحانوں سے گزرنا پڑا۔ پارسی اقلیت معاشرتی طور پر اکثریت میں ضم نہیں ہوئی۔ جنگ آزادی کے بعد انگریز گو اکثریت میں نہیں تھے، لیکن حاکم ہونے کے باعث اس اقلیت کا سٹیٹس، رسم و رواج، تعلیم سب قابل تقلید ہے...... ہندو نے بہت جلد اس حقیقت کو بھانپ لیا کہ انگریز کی بالا دستی کو قبول کئے بغیر کوئی نفع کا سودا نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمانوں کو عجب مخمصے کا سامنا تھا۔ انہیں یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ وہ ترقی کے حق میں ووٹ دیں یا فلاح کا راستہ اختیار کریں۔ سرسید نے نئے تقاضوں کے پیش نظر علی گڑھ کالج کی شکل میں فلاح کے بجائے حصول ترقی کو ترجیح دی۔ حالی نے بڑھتے ہوئے مد و جزر کے نتائج سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ ڈپٹی نذیر احمد نے ابن الوقت کا نقشہ کھینچ کر اس حالت سے ڈرانے کی کوشش کی جو اندھا دھند تقلید کے باعث فلاح کے راستے سے ہٹا دیتی ہے۔ اقبال نے بھی سائرن بجائے۔ جنگ آزادی کے وقت انگریز جو اقلیت میں موجود تھا، وہی قیام پاکستان کے بعد ناموجود ہو کر بھی فعال رہا اور بڑے شہروں میں مسلمانوں کی شناخت مغربی ہوتی چلی گئی۔ بریلوی اور دیوبندی دونوں تحریکیں اسی جداگانہ اسلامی شناخت کو قائم کرنے کی آرزومند تھیں۔ بریلوی چاہتے تھے کہ رحمتوں پر تکیہ کر کے کشتی بیچ منجدھار چھوڑ دی جائے۔ دیوبندی تحریک مسلمانوں میں مضبوطی اور خود انحصاری کو شعار بنانا چاہتی تھی۔ اس اختلاف کے باوجود خواہش دونوں کی ایک ہی تھی کہ مسلمانوں کی شناخت قائم رہے اور وہ فلاح پائیں۔ لیکن تعجب ہے قیام پاکستان کے بعد جو اقلیت امریکہ میں وارد ہوئی، اس کا مسئلہ سنگین تر تھا۔ امریکہ سڑکوں، بازاروں اور اشیاء کا معجزہ ہے۔ یہاں قدم قدم پر حیرت کا بازار گرم ہے۔ عام انسان کے لئے یہ فراوانی کا خواب ہے۔ امریکہ حیرت کے دریا کا وہ ساحل ہے جہاں

کھڑے ہوکر پہلی بار انسان اپنے اندر تبدیلی محسوس کرتا ہے اور اس کی اپنی شناخت متزلزل ہوتی ہے۔ جس قدر کوئی حیران، انگشت بدنداں ہوگا، اتنی ہی اس میں تبدیلی آئے گی۔ محیر العقول اشیاء کی سرعت سے بھرتی منڈی آپ کو دنگ کرتی ہے۔ بازار آپ کو گم کیئے دیتے ہیں۔ ان کی سیر گویا ہر شہری کا جنت میں مفت داخلہ ہے۔ پھر یہاں کے نظام دنگ کرتے ہیں...... آہستہ آہستہ اکثریت گھیرے میں لے لیتی ہے اور نو وارد حیرت زدہ پر رنگ چڑھنے لگتا ہے۔ کمزور اقلیت کے پاس دکھانے سنانے، ابھارنے اور منوانے کے لئے کوئی چیز نہ ہو تو وہ اکثریت کے بہاؤ میں ایسے ہی بہنے لگتی ہے جیسے دریا کے ریتلے ساحل۔

سب سے پہلے اقلیتی ابن الوقت کا لباس بدلتا ہے۔ عموماً یہ تبدیلی سردیوں میں شروع ہوتی ہے۔ مرد تو خیر جنگ آزادی کے بعد سے پینٹ قمیض کے رسیا رہے لیکن نو وارد عورتیں یہ کہہ کر جینز پہننے لگتی ہیں کہ سردیوں میں ایک تو سردی سے بچاؤ بہتر ہوتا ہے اور دوسرے کام کاج میں یہ لباس زیادہ کمفرٹیبل اور پھرتیلا بنا دیا ہے۔ جواز جو بھی دیا جائے اپنے عمل کو مضبوطی عطا کرنے کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ شروع میں جینز کے ساتھ لمبے بازو کی قمیض سویٹر یا ونڈ بریکر استعمال میں آتا ہے۔ آہستہ آہستہ گرمیوں تک لباس وہی ٹھہرتا ہے جو مروج ہو بغیر آستین کی بنیان دیکھ کر نہ اچنبھا ہوتا ہے نہ افسوس...... امریک مقیم اقلیتی عورت ماڈرن لگنے ہی میں اپنے آپ کو اکثریت کا حصہ سمجھنے لگتی ہے۔

دوسری چیز جو اقلیت میں ذرا بعد میں بدلتی ہے، وہ نو وارد کی زبان ہے اور زیادہ اہم ہے۔ کچھ لوگ بہت جلد امریکی لہجے کو اختیار کر لیتے ہیں۔ ذہن سے زیادہ ایسے لوگوں کی قوت سماعت تیز ہوتی ہے، وہ Slang سے خوب آگاہی پیدا کرتے ہیں۔ گو زبان نہیں آتی، لیکن لب ولہجہ کے زور پر پٹرول پمپ پر کام کرنے والا، ٹیکسی ڈرائیور، ڈےکیئر میں بچوں کی دیکھ بھال کرنیوالیاں، دوکان کی سیلز گرل، غرضیکہ جہاں بھی کام

میں لوگوں سے تال میل زیادہ ہو، سب زبان کے اتار چڑھاؤ اور لب ولہجہ کی باریکیوں کو سمجھ جاتے ہیں ۔رے کو کیسے رول کر کے ادا کرنا ہے اور لا کی آواز نکالتے وقت منہ کو کیسے گول کیا جاتا ہے یہ کچھ زیادہ وقت طلب مراحل نہیں ہوتے، جس طورح عورتیں میک اپ استعمال کرتی ہیں ۔ایسے ہی اقلیتی زبان کے لہجے میں اپنی کم علمی کو چھپالیتا ہے۔دوسرے ممالک سے آئے ہوئے تارکین کی مشکلات دیکھ کر امریکن سکولوں میں اب اے بی سی پر زور نہیں دیا جاتا، بلکہ آوازوں کی شناخت سے حروف سکھائے جاتے ہیں۔اس طرح بول چال تو جلد درست ہوتی ہے، لیکن زبان کے رموز ہمیشہ وقت طلب ہوا کرتے ہیں اور لسانی مہارت ایک مدت کے بعد حاصل ہوتی ہے اسی لئے اقلیت میں زبان دان کم پیدا کرتے ہیں۔

یوں لباس اور زبان کے مور پنکھ لگا کر کوا ہنس چال کے قابل ہو جاتا ہے، لیکن اس یافت کے ساتھ ساتھ اقلیت کو بہت سی اپنی چیزیں چھوڑنے کا احساس بھی گھیر لیتا ہے۔Exposure کے ایسے فائدے عموماً مالی شکل میں لوٹتے ہیں ۔پھر آزادی کا فروعی احساس بھی ہوتا رہتا ہے، لیکن اس ترمیم اور اضافے کے باوجود اقلیتی افراد کو ایک طرف تنہائی دوسری جانب احساس جرم کاٹتا رہتا ہے۔اپنے لباس اور زبان سے بے وفائی کی مشکل اسے اندر ہی اندر پژمردہ رکھتی ہیں۔تنبولی سے پان لے کر کھانے سے ہونٹ تو سرخا سرخ رہتے ہیں، لیکن اندر تارکین کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لالی اصلی نہیں۔

ہولے ہولے زبان اور لباس سے فارغ ہو کر اس نئے سورج سنسار کی روشنی میں اقلیت کو اپنے میں کئی طرح کی کمی نظر آنے لگتی ہے، وہ مکمل طور پر اپنا رنگ تو بدل نہیں پاتا، لیکن عورتیں کالے سانولے گندمی رنگ کے خلاف خوب جہاد کرتی ہیں۔خاص طور پر بال اور رنگ بیلچ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتیں۔

امریکہ میں شکل کو مغربی معیار پر ڈھالنے کے لئے بال اور رنگ بدلنے کے لئے

کریم، لوشن، ہیر ڈائی کی پوری انڈسٹری اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ خوبصورتی میں کمتر ہونے کا احساس کمتری اندر سے گھونسے مارتا رہتا ہے، لیکن اقلیت ہار نہیں مانتی۔ جب رنگ، لباس اور زبان کی تبدیلی کافی نہیں پڑتی اور کوا محسوس کرتا ہے کہ مور پنکھ پھیکے پڑ رہے ہیں تو رفتہ رفتہ وہ اپنی اقدار اور مذہب کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ جہاں پہلے نبیوں کے بتائے ہوئے فلاح کے گر زندگی کے فیصلوں پر حاوی تھے۔ وہاں اب ہیومن رائیٹرز کا خیال رہتا ہے۔ اکثریت میں گم ہونے کی خواہش ہر قسم کی رکاوٹ کو ختم کرتی ہے۔ پچھلی قدریں چھوڑ کر صرف کام کی اخلاقیات باقی رہ جاتی ہیں۔ اقلیتی فرد صرف کام کے سہارے زندہ رہنے کا فن سیکھ لیتا ہے۔ کام کے سامنے ہر قدر ماند پڑ جاتی ہے۔ اصلی قدریں جعلی دستاویزیں نظر آتی ہیں۔ رشتے ناطے بھوسی بن جاتے ہیں۔ بوڑھے بڈھا ہاؤس میں اور بچے بے بی کیئر میں پہنچ جاتے ہیں۔ یہ تبدیلیاں لا کر اقلیتی افراد سمجھتے ہیں کہ اب وہ اکثریتی دیگ کا حصہ بن گئے ہیں۔

لیکن اتنا سب کچھ بدلنے، چھوڑنے بے تال ہو جانے پر بھی نیگرو، پاکستانی، سری لنکن، جاپانی، چینی، سب دور سے پہچانے جاتے ہیں۔ خود اقلیت کو اشتباہ نظر کا دھوکا ہوتا ہے کہ وہ اکثریت میں بدل گئے ہیں، کسی سفید فام امریکی کو یہ شبہ ہرگز نہیں ہوتا۔ وہ تو اس قدر جداگانہ نسلی امتیاز کا شعور رکھتے ہیں کہ ترکوں کو یورپ کا حصہ بننے نہیں دیتے۔ اپنے آپ کو ایرانی، ترک یا لبنانی سمجھنے والا پاکستانی یہ سمجھ نہیں پاتا کہ یہ اعزاز امریکی کے نزدیک کچھ ایسے فخر کی بات بھی نہیں اور جن سے ہم براؤن لوگ اپنی شناخت مستعار لے رہے ہیں ان کی چولیں بھی اکثریت میں فٹ نہیں ہو سکیں۔ ان کے لئے بھی کسی امریکی کے دل میں نرم کونا نہیں۔

جب اکثریت کا بہاؤ تیز ہو تو اقلیت کے خس و خاشاک اس میں تیزی سے بہتے ہیں، لیکن جب دریا سست رفتار ہو کر میدانی علاقے میں سستی سے چلنے لگے تو پھر درختوں سے گرے ہوئے تنے، ٹوٹے پل، شہروں سے آنے والا کوڑا کرکٹ پانی کے

بہاؤ کو روکنے لگتا ہے۔ امریکہ کے آزادی پسند لوگوں نے جب ریڈ انڈین قالیت کو جنگلوں میں بھگا دیا تو کچھ دیر کے بعد ان کو بھی احساس جرم نے ستایا۔ ان کے خدا ترس لوگوں نیسوچا کہ یوں تو ساری دنیا میں ظلم ہم سے منسوب ہو جائے گا۔ امریکی پر سونا کو دھچکا لگے گا۔ اقلیت کو برابری کا احساس دلانا، اس کی حفاظت کرنا، اس کے کلچر اور مذہب کو اہمیت دینا جمہوری حکومت کی نیک نامی کے لئے ضروری تھا۔ اس طرح ریڈ انڈین Reserves میں دھکیلے گئے۔ اسلامک سنٹر، صوفی تحریکیں، ہندو پنتھ، چی، تاؤ، کنفیوشس کی تعریف پر اکثریت کا ایک حصہ زور وشور سے مامور ہو گیا۔ ہیومن رائٹرز کو بروئے کار لا کر اکثریت اپنے آپ کو لبرل، انسانیت پسند، بھدر پرش پیش کرنے میں سہولت محسوس کرنے لگی۔ ادھر اس رویے سے اقلیت کا خیال ابھرا کہ وہ اکثریت میں ضم ہو رہی ہے، لیکن اکثریت اس بات کا خیال رکھتی ہے کہ کسی طور بھی اقلیت کو سیاسی طاقت حاصل نہ ہو اور وہ بڑے دھارے کا حصہ نہ بنے۔

شری رجنیش نے جب اپنی سیاسی اہمیت جتانا شروع کی، انہیں منہ کی کھانا پڑی۔ امریکی سیاسی نابغے جانتے ہیں کہ اگر کتے کو زنجیر سے باندھا جائے تو وہ زہری ہو جاتا ہے۔ پچکار کر لے پالک بنا کر رکھا جائے، اس کی ٹریننگ پر وقت صرف کیا جائے تو وہ گھر کی رکھوالی کرتا ہے۔ اخبار لانے، ڈاک پکڑانے، اجنبی کی اطلاع دینے اور سکنک بھگانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اکثریت بھی اس ٹریننگ پر لگتی رہتی ہے۔ ایک سے قانونی حقوق لے چکنے کے بعد اپنی شناخت گنوا بیٹھنے کے بعد بھی یہ حقیقت نہیں بدلتی کہ اقلیت بھی اکثریت کا حصہ نہیں بن پاتی۔ وہ اکثریتی دریا پر خس وخاشاک کی طرح بہتی ہے۔ نیگرو بہرحال نیگرو رہتا ہے۔ جاپانی، ترکی، چینی، پاکستانی بہرکیف اپنے آپ کو نئے ماحول میں مانوس اجنبی سمجھتے رہتے ہیں۔

جس طرح ایک کالی لڑکی، چھوٹے قد کے مرد، موٹے آدمی، گنجے کو ایک گہرا احساس کمتری رہتا ہے، ایسے ہی اقلیت کبھی بھی کمتر ہونے کے جذبات سے بچ نہیں

سکتی۔اس کے اپنے چاہنے والے ساری عمر اس کی کمی کا ذکر برملا نہیں کرتے، لیکن دوسرے لوگوں کی زبانیں روکی نہیں جا سکتیں۔ وہ موٹو، گٹھو، کلو جیسے نام بلا تکلف استعمال کرتے ہیں۔اب Complexed انسان کے لئے تین راستے ابھرتے ہیں ...... یا تو وہ اس جسمانی کمزوری کا بھرپور دنیاوی علاج کرے۔ جو بھی بشری تقاضا ہو، اسے اپنی بقاء کا راستہ بنائے یا پھر روحانی علاج کی طرف رجوع کرے اور کسی معجزے کے انتظار میں رہے۔اگر یہ دونوں چیلنج اس کی ہمت سے زیادہ ہیں تو پھر اپنی کمتری کو مان کر برا ماننے اور رنجیدہ ہونے کی سٹیج سے نکل جائے اور معاشرے میں پچھلی بنچ پر بیٹھنے کی عادت ڈال لے اور اپنے آپ کو اصلی شہری کے بجائے دو نمبر کا انسان سمجھ لے۔ جتنی کریمیں، گنج کے علاج اور ورزشوں کے سنٹر انسانوں کی آرزوؤں کے باعث کھمبیوں کی طرح مارکیٹوں میں آئے ہیں۔جن سے کروڑوں کا کاروبار چل رہا ہے، احساس کمتری میں مبتلا ان لوگوں کی جیبیں خالی کرنے کے ذرائع ہیں

......

جوں جوں انسان اپنی کمی کو زیادہ محسوس کرتا ہے، اس کا رجوع دولت کی طرف تیزی سے ہوتا ہے۔دولت وہ زبردست مور پنکھ ہیں جس سے بیچارہ کوا ہنس بننے کے آخری خواب دیکھتا ہے...... فرد کی حد تک تو دولت کا نسخہ کافی کامیاب رہتا ہے۔کار، بنک بیلنس، کوٹھی، ہوائی سفر، دبدبہ، فرعونیت اور ہم چوں ما دیگرے نیست والا Illusion قائم رہتا ہے، لیکن عموماً دولت اقلیت کا مسئلہ مجموعی طور پر حل نہیں کر سکتی۔جب اقلیت ضم ہونے کی تمام تراکیب استعمال کر چکتی ہے اور کامیاب نہیں ہو پاتی۔ جب چینی پانی میں اور زیادہ حل نہیں ہو سکتی تو ایک بار پھر محلول سوکھنے لگتا ہے۔چینی علیحدہ ہو کر Crystals کی شکل اختیار کرنے پر مجبور ہے۔

اس وقت اقلیت مایوسی کا شکار ہو کر مراجعت کرتی ہے۔اپنے مذہب، کلچر، زبان، لباس کی طرف۔

واپسی کا سفر...... لیکن اس پچھل لوٹنے کا ذکر میں پھر کروں گا۔ میری بیٹی گھر میں ہے اور مجھے کھانے کے لئے آوازیں دے رہی ہے۔ اس کی آواز میں سائرن بجنے کی کیفیت ہوتی ہے۔ ارجمند سر سے پاؤں تک Workaholic ہے۔ وہ چلتے پھرتے کھانا کھاتی ہے۔ بیٹھ کر ٹی وی نہیں دیکھ سکتی۔ واک مین لگا کر کپڑے استری کرتی ہے۔ کتاب پڑھتے وقت بھی کمپیوٹر لگائے رکھتی ہے۔ اس کے نزدیک سب سے قیمتی چیز وقت ہے۔ وہ ہر لمحے اسے سونے میں تبدیل کرتی رہتی ہے۔ کبھی وہ وقت کو گھر کے کام میں بھناتی ہے۔ کبھی اپنے جسم کی ورزش میں بدل دیتی ہے...... اس کی سب سے بڑی تفریح یہ ہے کہ وہ مصروف رہے اور کام کی زیادتی کے خلاف ہر ایک سے گلہ بھی کرتی رہے۔

یہی پھوکٹ، کھوکھلا، بھوسی بنا وقت امریکہ کا اصلی ویسٹ ہے۔ جنک یارڈز میں جو کچھ اکٹھا ہوتا رہتا ہے وہ تو Recycle کیا جا سکتا ہے۔ لیکن وقت کے بھرکس سے کچھ نہیں بنتا۔ انسان خالی الذہن ہو کر ہوا میں گھورنا، ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے کا فن بھول گیا ہے Meditation کے سنٹر تو ہیں، لیکن وہاں بھی گیان دھیان کو کام میں بدل کر مصروف رہنا اصل مقصد ہے۔ کاموں سے بے پرواہ، تعلقات سے بے نیاز، ندی کنارے بیٹھ کر دریا کے بہاؤ کو دیکھتے رہنے کا فن اب شہری لوگوں کو بھولتا جا رہا ہے۔ جب امریکی بریک کے لئے گھر سے نکلتا ہے تو اسے بہت سے انتظامات کرنے ہوتے ہیں۔ مچھلی پکڑنے کا سامان، سٹیل اور مووی کیمرے، کتابیں، سلیپن بیگز حتیٰ کہ کچھ لوگ تو باربی کیو کی انگوٹھی اور Marinate کیا ہوا گوشت مرغی بھی ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ہالی ڈے بذات خود کام میں بدل جاتی ہے۔ کھیتوں کو فارغ چھوڑے رکھنے سے شعاعیں مٹی میں داخل ہوتی ہیں اور ہوا میں سے گرنے جھڑنے والا پولن بڑی روئیدگی لئے کھیتوں میں جاری ساری رہتا ہے۔ انسان جب کام کاج چھوڑ کر ٹانگیں پھیلائے، سر کے پیچھے ہاتھوں کی کنگھی سے سہارا دے کر مندی مندی

آنکھوں سے نیلگوں آسمان کو دیکھتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کے شعور اور لاشعور کا درمیانی دروازہ کھلتا ہے۔پھر وجدان کی پریاں اشارہ پا کے اسے تحت الشعور کی دنیا میں لے جاتی ہیں۔تخلیق کے پرندے پھڑ پھڑاتے ہیں صدیوں کی گم گشتہ آر چی ٹائپ شبی ہیں ملتی ہیں۔ماضی اور مستقبل کے اسرار و رموز سے شناسائی ہوتی ہے۔ انسان اپنے آپ کو Hyonotise کرنے کی قوت سے شناسا ہو جاتا ہے۔تحت الشعور ہی یادوں کا سٹور ہاؤس ہے۔ان سلجھی گھتیوں کا پنڈورا باکس ہے۔یہیں سے عرفان ذات کا علم ملتا ہے۔مصروف انسان کی یہاں تک رسائی نہیں ہو پاتی۔

میں آپ سے اقلیت کی بے چارگی کے بارے میں بات کر رہا تھا، لیکن فرد کی گمشدگی کی طرف کھسکتا چلا گیا...... ترقی کے لشکارے تو حیرت میں ڈبوتے گئے لیکن فلاح کا دروازہ بند ہوتا چلا گیا۔

''ابو......'' بیلکونی میں ارجمند کی آواز پھر آتی ہے۔

''آ جائیے مجھے ہسپتال جانا ہے...... دیر ہو رہی ہے ابو۔''

میں خیالوں کے الجھے دھاگوں کا لچھا پلاسٹک کی کرسی پر رکھتا ہوں۔سامنے والے گھر کی بیلکونی سے گریک بڈھا چابیوں کا گچھا نیچے سڑک پر پھینکتا ہے۔اس کا جوان سال بیٹا ان چابیوں کو دونوں ہاتھوں میں کیچ کرتا ہے۔جب بڈھے نے چابیوں کو نیچے گرایا تو میں نے دعا کی تھی کہ یہ چابیاں سیدھی نوجوان کے ہاتھوں میں پہنچیں، سڑک پر نہ گریں...... مجھے وہم تھا کہ اگر چابیاں نیچے گر گئیں تو گریک نوجوان کے لئے اچھا نہ ہوگا، وہ اتنے بڑے بڑے ٹرک چلاتا ہے جن میں کاریں سامان سفر ہوتی ہیں۔ ایسے ٹرک ڈرائیور کی زندگی کے لئے مجھ جیسے بڈھے کو خوف آتا ہے۔میں اس کے لئے صرف دعا کر کے شگون کا سہارا لے سکتا ہوں۔

ہم بڈھے لوگ حزن و ملال کے بندے ہوا کرتے ہیں۔

خوف ہمارا گائیڈ ہے...... ہم جیسے عمر رسیدہ یہاں کے دوزخ سے نکل کر مابعد کے

جہنم میں داخل ہو جائیں گے۔ اس تسلسل کی وجہ سے ہمیں علم بھی نہ ہوگا کہ یہ کارنامہ کیسے ہوا۔ شاید اسی خوف کی وجہسے ہم مضبوط فیصلوں کے سہارے نہیں جیتے۔ ہم شگونوں کی انگلی پکڑ کر فیصلے کرتے ہیں۔ ہمیں ہر وقت استخارے کی ضرورت رہتی ہے۔ ہم اخباروں میں دیکھتے ہیں آج کا دن کیسا گزرے گا؟ جنم کنڈلی ہماری بنیادی کھوج ہے۔ نجومی، عامل، پیر فقیر، تعویذ گنڈا، وظیفے وظائف ہماری اصلی زندگی ہے۔ ہم بشری تقاضوں کو پورا نہیں کر پاتے اور مذہب کی اساس جو صبر و شکر ہے، اس کو بھی مان نہیں سکتے۔ کیونکہ صبر کسی شگون کا سہارا نہیں لیتا۔ ہم کہیں خواب و خواہش کے درمیان، اصل و نقل کے مابین، حقیقت اور خواب سے ملا جلا ایک ملغوبہ تیار کرتے ہیں اور اسی معجون مرکب کو چاٹ چاٹ لا حاصل زندگی بسر کرتے ہیں۔

آواز پھر آتی ہے...... ''ابو جی آجائیں پلیز......''

''آرہا ہوں، آرہا ہوں۔ آ گیا بس۔''

ایک بار میں نے گھر کے آگے ڈھیر اخبار رسالوں میں سے ایک ٹیبلو نکالا۔ اس میں درج تھا۔ انجلا گیارہ برس کی تھی، لیکن ایک لمبی بیماری کے دوران اس کی ٹانگیں جواب دے گئیں۔ والدین نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، لیکن انجلا چلنے پھرنے کے قابل نہ ہوئی۔ ہار کر اسے سان فرانسسکو کے ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔

انجلا میں ایک خوبی تھی۔ وہ معذوری کے باوجود پرامید رہا کرتی۔ کوئی لمحہ ایسا نہ آتا جب وہ اپنے اللہ سے مایوس ہوئی ہو۔ جب کبھی کوئی نرس یا ڈاکٹر اس سے تسلی آمیز بات کرتا تو وہ کہتی...... آپ کیوں مایوس ہوتے ہیں، مجھے اشارہ آچکا ہے۔ میں چلوں گی اور سکول میں پڑھوں گی۔''

ایک رات اچانک اس کا پلنگ چلنے لگا۔ وہ چلائی دیکھو دیکھو معجزہ ہو گیا۔ میں چل سکتی ہوں...... فوراً اس نے پلنگ سے چھلانگ لگائی اور چلنے لگی...... انجلا سکول جانے لگی اور کھیلوں میں حصہ لینے کے قابل ہوگئی...... کچھ لوگ کہتے ہیں، اس کی شدید

آرزو نے یہ معجزہ کیا...... کچھ دین داروں کا خیال تھا کہ اسے تو پہلے سے اشارہ آچکا تھا۔اسی شگون نے اس کا ایمان مضبوط کیا اور وہ معجزے کے قابل ہوئی۔

کچھ تحقیقی لوگوں نے اظہار کیا۔پلنگ کا چلنا معجزہ نہ تھا۔اس رات سان فرانسسکو میں زلزلہ آیا۔اسی ہسپتال میں ایک پورا بلاک گر گیا۔یہ اب انسان کی استعداد یا مرضی پر منحصر ہے کہ وہ انجلا کے چلنے کو زلزلے سے منسوب کرے یا معجزے سے۔وہ شگون کی راہ چلے یا حقیقت کی لاٹھی ہنکائے۔خیال اور حقیقت یہ متضاد راستے دونوں سچے ہیں۔صرف فیصلہ آپ کا اپنا ہے......کبھی کبھی ایک پٹڑی سے اتر کر دوسری پر چل نکلنا بھی اتفاقاً اور اتفاقیہ ہوتا ہے......مشکل یہ ہے کہ بوڑھا آدمی جدھر بھی چل نکلے، وسوسے اس کی جان نہیں چھوڑتے۔خوف اس کا مستقل ساتھی ہے۔

شام کو پھر میں بیلکونی میں بیٹھ کر ارجمند کا انتظار کرتا ہوں۔لاہور میں میری بہت سی مشکلات تھیں جن کا تعلق پیسے سے نہیں، فعال ہونے سے تھا۔بجلی کا بل، ٹیلی فون کی ادائیگی، اپنی ڈاک خود پوسٹ کرنے جانا پڑتا تھا۔عموماً کسی پلمبر، الیکٹریشن، گٹر کھولنے والے کے ساتھ مغز پچی کا مرحلہ پیش آتا۔بڑے گھر کا میک اپ بڑی فعالیت چاہتا اور اب مجھ میں نگرانی کرنے والے کام کروانیکی ہمت نہ تھی۔یہاں مجھے کوئی اہم کام نہیں ہے، بلکہ یوں سمجھئے کہ اپنے لئے مائیکرو اوون میں کھانا گرم کرنے کے سوائے مجھ پر کوئی بھاری ڈیوٹی نہیں۔راحتیں قریب قریب مکمل ہیں، لیکن اب دن بہت لمبا ہو گیا ہے۔لاہور میں نظریاتی اختلافات کے ہاتھوں دوستوں میں بول چال بند ہو جایا کرتی تھی۔لیگ اور پیپلز پارٹی نے خاندانوں کو دو پارٹیوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ڈرائنگ روم کی فضائیں وربل ڈائیریا کے ہاتھوں بدبودار تھیں۔قیمتیں فلک بوس ہو رہی تھیں۔ڈالر کی قیمت بڑھ جانے کے باعث کئی گھروں میں مالی استحکام ناممکن تھا اور لوگ ان مشکلوں کے ہاتھوں حیرت زدہ مرنے مارنے کی سوچ رہے تھے۔لیکن ......ان ہی مشکلات کے ہاتھوں اکثریت زندہ بھی تھی۔بوریت کا وقت نہ تھا۔سوچنے

اور تفکر کرنے کی مہلت نہ تھی۔ ارجمند کے صاف ستھرے گھر میں مجھے بار بار گھڑی دیکھ کر مایوس لوٹنا پڑتا منٹ سالوں میں کٹتا۔ مشکلات میں گھرا انسان تیز سوچتا اور تیز ترین دوڑتا ہے۔ اس کے لئے وقت ہمیشہ کم اور وسائل کم تر ہوتے ہیں۔ وہ جدوجہد کی سان پر چڑھا رہتا ہے، لیکن اس کا وجود اسے تنگ نہیں کرتا۔ جونہی وافر وقت حاضر مال بن کر آجائے، اپنے وجود کے ساتھ وقت گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر نفسیاتی بیماریاں تنہائی کی بے معنویت ستانے لگتی ہے۔ عرفان ذات حاصل کئے بغیر اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ ذکر کے بغیر کسی طور بھی انسان مجتمع نہیں ہو پاتا۔ کیا کیا جائے اطمینان نہ وہاں تھا نہ یہاں، ایک اس کی ذات سے بندھے رہنے میں فلاح کی پھوار پڑتی رہتی تھی۔

پلاسٹک کی کرسی کو میں نے دسویں مرتبہ ٹشو سے صاف کیا۔ کرسی پر کہیں ایک ذرہ بھر مٹی نہ تھی، لیکن میرے پاس وقت ہی وقت تھا اور میں ہر بوڑھے آدمی کی طرح تذبذب کے ہاتھوں اس یک درست مصرف سے ناآشنا تھا۔ مجھے خالی سیڑھیوں پر چل کر تحت الشعور تک پہنچنا نہ آتا تھا۔ نہ ہی مابعد تک کوئی ہوائی جہاز جاتا تھا۔

مشکل یہ ہے کہ انسان اپنے ماضی سے بہت کم سیکھتا ہے۔ تجربہ انسان کا بدترین استاد ہے۔ یہ علم عطا کرنے سے بہت پہلے ہاتھ میں امتحانی پرچہ پکڑا دیتا ہے۔ کمال اتاترک نے اپنے تجربات سے سیکھنا اور سکھانا چاہا۔ وہ اپنے لئے اور اپنی قوم کے لئے فلاح کی تلاش میں تھا۔ اس نے وہ ٹوپی اتاری اور ہیٹ کو اپنایا۔ ترکی زبان کا رسم الخط بدل کر زبان کو رومن تحریر کے تابع کیا۔ مولوی کو معاشرے کا ولین سمجھ کر اسے قرار واقعی سزا دی اور مذہب میں بشرط استواری کو ایمان کی کمزوری جانا۔ عورتوں کو آزادی کی راہ سجھا کر منزل کا سراغ نہ دیا۔ تجربے پر تجربہ کیا، امتحان سے پہلے گزرا اور نتائج بعد ازاں نکلے۔

افسوس اتاترک کے سوچ کے وہ نتائج نہ نکلے جن کی اتاترک کو امید تھی۔ تجربہ نئی

سمت میں ضرور لے گیا۔ تبدیلی کا حامل بھی تھا۔ پر کہیں خواب دیکھنے والے کمال اتاترک نے ادھورا تجربہ کیا اور ینھہ پختہ خواب دیکھے، اسی لئے آج تک ترکی یورپ کا حصہ نہ بن سکا۔ وہ یورو کے لئے ترس رہا ہے اور یورپ پرے پرے کہتا نظر آتا ہے۔ اکثریت میں مدغم ہونے کی خواہش اتنی شدید ہے کہ ابھی تک ترکی اپنی راہ متعین نہیں کرپایا۔ ایشیا کا حصہ وہ کہلانا نہیں چاہتا اور یورپ اسے اپنانا نہیں چاہتا۔

دوسرا تجربہ ایران کے شہنشاہ نے کیا۔ اس نے ہر طور مغربی کلچر میں ضم ہونے کی کوشش کی۔ جوں جوں تیل کی فراوانی کے ہاتھوں ایرانی خوشحال ہوئے، ویسے ہی وہ شناخت کے طور پر پامال بھی ہوگئے۔ پھر امام خمینی نے ایرانی لوگوں کے بکھرے تسبیح دانوں کو ایک دھاگے میں پرونے کی کوشش کی۔ یہ تجربہ بھی دو ہزاریئے کے قریب آ کر دم توڑتا نظر آتا ہے۔ ایک تجربہ اسپین میں بھی ہوا تھا۔ طارق بن زیاد کشتیاں جلا کر اسپین پہنچا۔ نو سو سال حکومت کرنے کے بعد اپنے گھروں کی چابیاں لے کر خالی ہاتھ فاتح لوٹ گئے۔ کچھ امریکہ سدھارے، باقی وطن لوٹ گئے۔ سپین کی اکثریت نے اس مضبوط اقلیت کے مذہب کو نہ اپنایا۔ شاید یہ رنگ کا کرشمہ ہے کہ سفید فام قومیں سیاہ لوگوں کا مسلک نہیں اپنا سکتیں یا پھر اسپین کے لوگ عیسائیت میں اس قدر راسخ العقیدہ تھے کہ انہوں نے سیاہ فام لوگوں کے عقیدے کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ ایسے ہی ذلتیں سہتے ”رفیق رفیق“ کی صداؤں پر بھاگتے جب پاکستانی لوگوں کا سعودی عرب میں دم پھولنے لگتا ہے تو وہ سوچنے لگتے ہیں کیا وطن لوٹ جائیں اور نا داری، مفلسی اور بے راحتی کی زندگی اپنائیں یا پھر مور پنکھ اتار کر دھڑے سے کوے کی زندگی بسر کریں، جسے نہ تو پردیس میں پوری توقیر ملتی ہے نہ اپنوں میں اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ امریکہ میں احساس تنہائی سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوتا۔ اکثریت میں مدغم ہونے کی خوشی اور خواہش اور اپنی شناخت قائم کرنے اور رکھنے کی آرزو مسلسل رسہ کشی کی صورت اختیار کئے رکھتی ہے۔ جب اقلیت کے مور پنکھ کافی نہیں ہوتے تو ایسے بھی کلاس سٹیزن

جنہیں ہیومن رائٹرز تو ملتے ہیں، لیکن وہ مساوات نہیں ملتی جو صرف نبیوں کی میراث ہے۔ ایسے میں اقلیت کبھی کبھی اقلیتی گروہوں کی شکل میں بٹ جاتی ہے۔ ایسے گروہ اپنے مذہب اور کلچرل کی پاسبانی کے لئے اٹھتے ہیں۔ عورتوں کے سروں پر حجاب آجاتے ہیں۔ مرد مسجدوں میں نماز ادا کرنے لگتے ہیں۔ گھروں میں میلاد، مجلسیں، روزہ کھلائی کی محفلیں، آمین اور شادی کی رسومات وطن کی طرف لوٹ جانے کا خواب ہوتی ہے۔ ڈرگز، جنسی بے راہ روی، آزادی سے حاصل کردہ جرائم سے خوفزدہ ہو کر مسلمان تارکین ایسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، جس کی وجہ سے سفید لوگ انہیں فنڈ امنٹلسٹ کہتے ہیں۔ اکثریت اس انداز زیست سے خوفزدہ ہو کر ایسے مسلمان گروہوں کو دہشت گرد گردانتی ہے۔ دریا کے ساتھ ساتھ دھڑے بہاؤ پر بہنے والے خس وخاشاک یکدم زہریلے بریئے نظر آنے لگتے ہیں اور اکثریت یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ یہ اقلیتی گروہ نا احسان فراموش لوگ ہیں جنہیں پناہ، راحت، آرام ملا اور اس کے بدلے انہوں نے اپنی شناخت کی ڈھال پہن لی۔

اقلیت کا اکثریت میں ڈھلنے کی کوشش اور پھر اپنی جداگانہ شناخت کے لئے کوشاں ہو جانا۔ بہر کیف یہ قوموں کے پنڈیولم کا سفر ہے، تضاد کا چلن ہے۔ اقلیت شاید ہی کسی اکثریت کا حصہ بن پاتی ہے۔ عمل اور ردعمل کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ کبھی اقلیت خوفزدہ رہتی ہے، کبھی اکثریت تمامتر طاقت کے باوجود اندر سے ہل جاتی ہے اور متزلزل ہونے کے بعد اس کا رویہ ردعمل کیطور پر انصاف پر مبنی نہیں رہتا۔ یہ نہیں کہ اکثریت انصاف کرنا یا دینا نہیں چاہتی بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ جیسے کسی کمرے میں ایک اچھلتا کودتا بندر آجائے، پھر گھر کے جملہ افراد کبھی بندر کو باہر نکالنے اور کبھی رام کرنے کے پلان بنانے لگیں۔ بندر غیر محفوظ ہو کر کبھی پنکھے پر چڑھے، کبھی خیں خیں کر کے گھر والوں پر لپکے، کبھی پردوں میں چھپ کر اپنی جان چھپائے، کبھی کرسی اٹھا کر آپ کی جان کا لاگو ہو۔ یہی حال اقلیت کا ہوا کرتا ہے۔ وہ یہ اچھل کود دراصل اپنی جان

بچانے کے لئے کیا کرتی ہے۔

جب اکثریت کا بہاؤ تیز ہو تو اقلیت کے خس و خاشاک بڑی تیزی سے بہتے ہیں، لیکن جب کبھی سامنے کوئی روک آجائے۔ درخت کا گرا ہوا تنا، لوہے کا جنگلا، ٹوٹا ہوا پل کوئی بھی رکاوٹ اس تیز بہاؤ کو سست کر دے تو پانی نچلی سطح پر تو رواں رہتیہیں، لیکن روئے دریا پر جھاڑ جھنکار، پلاسٹک کے لفافے، ٹین ڈبے، بیکار اشیاء قعر دریا کی روانی کے ساتھ نہیں بہہ سکتیں اور رکنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ یہی وہ وقت ہے جب اقلیتی گروہ روٹھے بچوں کی طرح احتجاج پر آمادہ ہوتا ہے۔ یہ وہ وقت ہے جب اقلیت کے لئے مستعار مور پنکھوں کے ساتھ اپنی عزت نفس برقرار رکھنا ممکن نہیں رہتا۔ اسے اپنے خام خیالوں کی دنیا سے نکل کر شعوری اور لاشعوری طور پر سوچنا پڑتا ہے کہ جو راستہ اس نے ترقی کی خاطر چنا، اس میں کیا کچھ کھویا اور کس قدر پایا۔ فلاح کا راستہ جو ترقی ہی کی شاہراہ ہے بہر طور پر کچھ اور تھا۔ اس کو چھوڑ کر اس کی زندگی کون سی سیڑھیاں اترتی چلی گئی، اسے آہستہ آہستہ پہ چلتا ہیکہ مذہب ک احکامات ہر صورت میں ہیومن رائٹرز سے بہتر تھے۔ دین الٰہی ہزار بار لبرل ہو اور وہ مہاراج ادھیراج اکبر کے سنگھاسن کو راجپوت اور مرہٹہ طاقت سے بچانے کے لئے اعلیٰ نسخے پر کوئی دین دارتا دیر قائم نہیں رہ سکتا۔ ترقی کے لئے اپنی شناخت چھوڑی نہیں جاسکتی۔ مذہب کا پرچم اٹھانا ہی پڑتا ہے۔ اب ایک بار پھر اقلیت رجعت کا سفر اختیار کرتی ہے۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا کہ سفر یہاں بھی لباس، زبان، رہن سہن، کلچر، وطنیت سے ہی شروع ہوتا ہے۔ ائدا عظم فرانس کے سلے سوٹ اتار کر اچکن شلوار اور جناح کیپ کو اختیار کرتے ہیں۔ افریقہ کا خوش پوش گاندھی دھوتی اور کھادی کی چادر کو اپنی شناخت بنالیتا ہے۔ فرانس میں سکول کی لڑکیاں حجاب پہننے پر اصرار کرنے لگتی ہیں۔ امریکہ جیسے ملکم میں ایران کی عورتیں چادر عرب والیاں عبائیں اور پاکستانی خواتین کے سروں پر دوپٹے آجاتے ہیں۔

لباس کی یہ تبدیلیاں اس بار کسی اکثریت میں ضم ہونے کے بجائے اپنی شناخت کو علیحدہ رکھنے کیلئے کی جاتی ہے۔ایک مدت امریکی ماحول میں رہنے کے باعث اردو سینابلد بچوں کو اپنی زبان بولنے پر اکسایا جاتا ہے۔قرآن پڑھنے پر اصرار اور نماز روزے کی پابندی سکھائی جاتی ہے۔اپنے کلچر کی حفاظت ناگزیر لگتی ہے۔آخر میں اقلیت کو اپنے مسلک، اقدار، کلچر اور دین کیسوائے اپنی شناخت کا اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔جب اقلیتی گروہ اپنے آپ کو بچانے کی خاطر اکثریت سے کٹ کر عزت نفس کی خاطر مدافعت پر آمادہ ہوتا ہے تو یکدم اکثریت اس قدر خائف ہو جاتی ہے کہ پھر مسلمانوں کو خاص طور پر فنڈ امنٹلسٹ اور دہشت گرد کی مہذب گالی دی جاتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ جس قدر حیرت زدہ اقلیت امریکی بہاؤ میں ضم ہونے کی جلدی کرتی ہے۔اسی جذبے کے ساتھ ناراض اقلیت اپنی شناخت کو پانے کے لئے تیز رفتار، مضبوط اور باہمت ہو جاتی ہے اپنے وجود کی علیحد گی کا ثبوت بہم پہنچانے کے لئے کوئی چھوٹی سےچھوٹی یا بڑی سے بڑی تبدیلی کافی نہیں ہوتی۔تحریکیں، احتجاج جلسے، Walks، پتھراؤ، خود کش دستے، ڈنڈے، کلاشنکوف سارے منفی اور مثبت اظہار بروئے کار لائے جاتے ہیں۔نہ تو پانی میں کود جانے کے وقت اقلیت کو انسانی حدود خیال آتا ہے، نہ ہی پانی سے باہر نکلتے وقت اپنی برہنگی کو تولئے میں لپیٹنے کا فن اس کے بس کی بات ہے۔

اقلیتوں کا مسئلہ وہاں شدید تر ہوتا ہے۔جہاں اکثریت امریکنوں کی طرح جسمانی ساخت اور رنگ کی بدولت سیاہ براؤن، چینی، جاپانی لوگوں کو اپنے میں ضم نہیں کر سکتی۔یہ مسئلہ ہندوستان میں بھی تکلیف دہ حد تک ناقابل حل تھا۔یہاں تقسیم مذہب کی بناء پر ہوئی، کیونکہ ساری سوسائٹی مذہبی اعتقادات کی بناء پر ویدوں کے زمانے سے مذہبی طبقوں میں بٹی ہوئی تھی۔برہمن جاتی شودروں کو دھرم کی بنا پر اپنے میں سمو نہیں سکتی تھی۔امریکہ میں رنگت کی تقسیم نے بنیادی مساوات قائم نہ ہونے دی۔

ہندوستانمیں مذہب یکجہتی کی فضاء پیدا کرنے میں مزاحم ہوا۔ نہ رنگت انسان کے بس میں ہے اور نہ ہی کوئی شودر اپنے آپ کو برہمن Declare کرنیکا اہل ہے۔ ہندوستان میں ساری اقلیتیں بالآخر اپنے اپنےگروہوں میں جکڑی گئیں۔ پارسی، اینگلو انڈین، سکھ اور مسلمان اس بات کے شاہد ہیں کہ ہندوستان میں ان کی شناخت بی کلاس سٹیزن کی رہی ہے۔

سکھوں اور مسلمانوں کی حالت ہندوستانمیں دوسری اقلیتوں سے مختلف تھی۔ وہ برصغیر میں بادشاہت کے مزے لوٹ چکے تھے۔ مغل بادشاہوں نے ذمیوں کے حقوق کا اس درجہ خیال رکھا تھا کہ راجپوت اور مرہٹے مغل راج میں بڑی طاقتیں بن گئے۔ مسلمان کسی اقلیت کو جبرًا اپنے میں ضم کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اقلیت کی حفاظت کے لئے ضرور جزیہ کی شکل میں ٹیکس لگایا جاتا رہا، لیکن جذبہ اقلیت کی حفاظت کے لئے اکٹھا کیا جاتا تھا۔ سکھوں نیہندوؤں میں ضم ہونے کی خاطر ہندوؤں میں شادیاں تک کیں۔ توحید پرست ہونے کے باوجود گورونانک جی کی تصویروں، بتوں کو ماتھا ٹیکا اور رسومات میں ہندوؤں کی پیروی کی، لیکن مسئلہ ان کا بھی حل نہ ہوسکا۔ بابری مسجد کا منہدم ہونا اور امرتسر کے گردوارے کی بے حرمتی اس بات کی شاہدذ ہے کہ ابھی تک ہندو جاتی کا غصہ فرو نہیں ہوا۔ حیلہ جوئی یا زبردستی سے کسی فرد یا گروہ کو اپنے میں ضم کرنے کی کوشش اسلام کے لئے ایک مذموم فعل ہے۔ استقامت سے مثالی زندگی پیش کرتے رہنا سب سے زیادہ محیر العقول معجزہ ہے، جس کے سحر سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ یہی راستہصوفیا کا رہا جس سیہندوستان کے اکثریتی لوگ اسلام میں ضم ہوئے۔

افسوس کہ سفید فام امریکی ایسا کوئی حل پیش نہ کرسکا، کیونکہ وہ کسی ایسے اقلیتی گروہ کو اپنے میں ضم کرنا ہی نہ چاہتا تھا جو اس سے مختلف تھا۔ وہاں صرف Human Rights کا نعرہ بلند ہوا جس نے جمہوری نظام کو تو مضبوط کیا، لیکن فرد کے احساس شکست کو کم نہ کرسکا۔ امریکہ میں کرسچن بلٹ میں بسنے والے لوگوں کا خیال ہے کہ

امریکہ کے زوال کی وجہ نیگرو اور ریڈ انڈین کی بد دعا ہے جو نسل در نسل ان کے دلوں سے نکلتی ہے اور جس کے باعث امریکی سوسائٹی سطح پر پرامن، لیکن اندر سے بکھرتی چلی جاتی ہے۔ میں اپنی لہر در لہر بار بار لوٹ آنے والی سوچ میں یہاں تک پہنچا تھا کہ ایک بار پھر ارجمند کی آوازیں شروع ہو گئیں۔ میری زندگی میں بلاوے کم ہیں، اس لئے میں ان پر لبیک کہتا ہوں۔

میں اس نیگرو کا نام سمجھ نہیں پایا۔ کیونکہ اس کے تلفظ میں ڈبلیو اور زیڈ کی بڑی زیادتی ہے اور وہ عجب طرح سے حروف کو مخفف کرنے کا بھی عادی ہے، پھر اس کا لب ولہجہ عام امریکن زبان سے مختلف ہے۔ میں اسے انکل ریمس بلاتا ہوں اور وہ خوش دلی سے اس نام پر جواب دیتا ہے۔ سپر مارکیٹ میں وال مارٹ سے کچھ آگے باڈر بک شاپ ہے، جہاں بار ڈھیروں کتابیں قارئین کے مطالعے کے لئے پڑی رہتی ہیں۔ اسی جگہ ایک پلاسٹک کی کرسی پر کبھی کبھی انکل ریمس مجھے بیٹھا نظر آتا ہے۔ اس کی بیٹی یا بہو گروسریز کرنے جاتی ہے اور وہ یہاں بیٹھ کر کبھی کبھی کاغذی گلاس میں کافی پیتا نظر آتا ہے۔

اس روز وہ سیاہ مجسمہ مجھے دیکھ کر مسکرایا، میں اس کے قریب ہو گیا۔

''گڈ مارننگ'' انکل ریمس بولا۔

''گڈ مارننگ انکل ریمس۔ کیا آپ کافی پینا پسند کریں گے''۔

''آئی ڈونمائنڈ بڈی......ون مور کپ''۔

ہم دونوں کافی شاپ کے سامنے لگی گول میزوں کی طرف چل دیئے۔ جب ہم قریب پہنچے تو ایک لمبی دم والی کالی کوئل ہمارے قریب ہی میز پر بیٹھ گئی۔ انکل ریمس نے کہا۔

''گاڈ ایسے چاہتا تھا......''

''کیا چاہتا تھا؟......''

''کہ انسان کبھی کسی کو خوفزدہ نہ کرے......''

''ہاں لیکن بدقسمتی سے ہم دوسروں سے خوفزدہ ہوتے رہتے ہیں اور دوسروں کو خوفزدہ کرتے رہتے ہیں......''

انکل ریمس عموماً مجھے فوک وزڈم کی کہانیاں سناتا ہے۔وہ کچھ سوچتا گنگناتا مسکراتا ہوا بولا۔

''سنو...... جہاں سے میں آیا ہوں وہاں مجھے احساس نہیں تھا کہ میں نیگرو ہوں...... کیونکہ وہاں سب کالے تھے......''

میں کچھ شرمندہ ہو گیا، حالانکہ میں بھی سفید فام نہ تھا۔

''ہاں کچھ ایسے ہی ہے......''

''تم جانتے ہو...... جب آدمی احساس کمتری میں مبتلا ہو تو وہ چڑچڑا کمینہ اور ناشکرا ہو جاتا ہے''۔

''ہاں شاید تم ٹھیک کہتے ہو......''

''معلوم ہے یہ احساس کمتری کب پیدا ہوتا ہے؟''

''میں نے کبھی سوچا نہیں انکل ریمس''

کالی کوئل ڈبل روٹی کا بھورا منہ میں ڈال کر اڑ گئی، جاتے ہوئے وہ جیسے گا لی گئی۔

کون می پیپا کوئلہ

سرنیا

یونا نا گولا

وائی پی ماری دیتو

سرنیا

ان پی جپا

''سوچا کرو برادر، سوچا کرو تمہارے مذہب میں تو سوچنے کا بڑا حکم ہے۔ یہ کوئل

کیوں وفزدہ نہیں اور ہم کیوں ڈرتے رہتے ہیں۔ جب تک میں کونگو کے طاس میں تھا، مجھے کوئی احساس کمتری نہ تھا۔ جب تک مقابلہ نہ ہو...... تم سے بہتر یا کمتر موجود نہ ہوا، حساس کمتری پیدا نہیں ہوتا...... جب نیگرو اپنے جیسوں میں تھا تو وہ شاکی نہیں تھا۔ غریب آدمی غریبی میں خوش رہتا ہے، جب تک اسے کسی امیر سے پالا نہیں پڑتا۔ میری پوتی ایملیا نے سکول چھوڑ دیا ہے...... وہ ملاٹو...... ہے جانتے ہو مولاٹو کون ہوتے ہیں......؟''

''نہیں''۔

''وہ لوگ جن میں سفید لوگوں کا خون بھی ہوتا ہے۔ جھونا مکمل طور پر نہ سیاہ ہوتے ہیں نہ سفید...... میری پوتی ایملیا اب سکول نہیں جاتی۔ وہ برگر کنگ میں فش اینڈ چپس بیچتی ہے......''

''لیکن اس نیسکول کیوں چھوڑ دیا انکل ریمس''۔

انکل ریمس کے پاس باتوں کا سٹور ہاؤس ہے۔ وہ کبھی کبھی بات کرنے سے پہلے ایک لمبی تان آئی آئی آئی لگاتا ہے پھر ایک آدھ مصرع گا کر مخاطب کرتا ہے۔ کون فی پنیا کونلہ میں نے پہلی بار اسی سے سنا تھا۔ میں اس سے اس کے معنی نہ پوچھ پایا۔

''ایملیا کہتی ہے...... سکول میں بہت سی ذہین لڑکیاں ہیں۔ گرینڈ پا وہ اتنا چمکتی ہیں کہ ان کے سامنے ایملیا چمک نہیں سکتی...... میں تو پہلے ہی اپنی جلد بلیچ کر کر کے تھک گئی ہوں۔ اب میں اور احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہونا چاہتی''۔

''کبھی کبھی سوچتا ہوں اللہ نے یہ اتنی اونچ نیچ کیوں رکھتی ہے......'' میں نے شکستگی سے پوچھا۔

''اس لئے بردر کہ ارتقاء ہو، تبدیلی آئے۔ انسان اپنی کوشش سے بہتر ہوتا چلا جائے...... انسان قیامت تک پہنچ پائے۔ تمہیں پتہ ہے سب سے پہلے انسان کانگو کے طاس میں آیا۔ اس وقت ساری دنیا میں صرف کالے تھے۔ کہیں نفرت نہ تھی، سب مل جل کر

رہتے تھے اور کوئی کسی سے کمتر نہ تھا۔ سب طرف محبت تھی اور تبدیلی کی کوئی صورت نہ تھی۔ پھر ایک دن ایک سیاہ حبشی چلتا چلاتا چلتا چلاتا ایک غار میں جا پہنچا۔ وہاں جھاڑیوں میں چھپا چھوٹا سا چشمہ گیزر کی طرح چل رہا تھا۔ غار میں روشنی کم تھی، لیکن کالا انسان پیاسا تھا۔ اس نے چشمے سے منہ دھویا اور سیر ہو کر پانی پی لیا۔ جب وہ غار سے باہر نکلا تو اس کی نظر اپنے ہاتھوں پر پڑی۔ دیکھتا کیا ہے کہ اس کی رنگ بالکل سفید ہو چکی تھی۔ اب وہ کالے لوگوں میں سے نہیں تھا۔ ایک اور نسل پیدا ہو گئی تھی''۔

یکدم وہ گانے لگا......

''آئی سنورا اینڈوائی؟

میں ہوانا میں پیدا ہوتا ہوا

اسے ڈومنگو کہتے تھے

میں کالا سیاہ تھا

اور بدقسمت بھی تھا

کیونکہ میرے والدین نہیں تھے......

جو مجھے سیاہ ہونے کا مطلب سمجھاتے!

تھوڑی دیر لالا کرتا وہ گاتا رہا پھر خود ہی کہانی کی طرف لوٹ آیا۔

''سنو برور سفید آدمی کو اس کے گھر والوں نے جب دیکھا تو اسے پہچاننے سے انکار کر دیا، اب آہستہ آہستہ سارے گاؤں میں خبر پھیل گئی کہ یاکو کے چشمے کا پانی جسم پر ملنے سے انسان سفید ہو جاتا ہے......ہولے ہولے لوگ کھسکنے لگے......اور اپنا رنگ تبدیل کرنے میں مشغول ہو گئے۔ اللہ کئی طریقوں سے تبدیلی لایا کرتا ہے بڑی...... جونہی کسی کا رنگ بدل جاتا، وہ گاؤں سے کھسک جاتا، کیونکہ اسے کالوں سے خود بخود نفرت پیدا ہو جاتی......''

آئی آئی آئی

یا کایا کا......یا کایا کا

سفید فام لوگوں نے جنگلوں کے اندر کہیں اپنی بستی بسالی اور بوکیف بم...... بوکیٹ ٹم

ایک نیا Ethnic گروپ وجود میں آیا۔ یہاں سے Races پیدا ہوئیں، لیکن پھر چشمہ سوکھ گیا۔ گاڈ لارڈ کی مرضی...... وہ عجیب طریقوں سے تبدیلی لاتا ہے۔ انسان کو پتہ نہیں چلتا، لیکن ہر موڑ پر تبدیلی ہے، لیکن ہماری مرضی سے نہیں گاڈ لارڈ کی مرضی سے...... ہم سمجھ نہیں سکتے۔

میں بھی انکل ریمس کو ٹھیک طور پر سمجھ نہیں سکتا۔ وہ ہنستا ہے تو چھاتی سے آرگن کے سر نکلتے ہیں۔

''سنو ایشیائی انڈر ڈوگ...... اللہ اور عورت کو سمجھنے کی کوشش کبھی نہ کرنا، مار کھا جاؤ گے۔ یہ دونوں سمجھنے کی چیزیں نہیں ہیں...... ان دونوں کا تعلق Superstition سے ہے۔ اگر تم انہیں مان لو تو فائدہ دیں گے نہ مانو...... تو تمہیں توڑ پھوڑ دیں گے۔ یہ شگون ہیں...... فال ہیں۔ مژدہ ہیں ان کے بغیر مرد کبھی راستے تلاش نہیں کر سکتا!

یہ دادی کے مرنے سے پہلے کی بات ہے۔ دادی ٹمپل روڈ والے گھر میں ہم سے بچھڑی۔ اس کے سارے بال سفید، دانت پان زدہ کیسری رنگ ہوئے جسم مڑا تڑا، آواز میں خرخر اور چال میں اب گری کہ اب گری والی کیفیت تھی، لیکن ذہنی طور پر دادی چوکس تھی، اسے ہر وقت علم رہتا کہ کون کدھر ہے اور کیا کرتا ہے؟ کون سی چیز مذہب سے وابستہ ہے اور کون سی رسم و رواج سے۔ وہ الو کی سی دانائی اور بلی کی چوکس نظروں سے سارے گھر کو دیکھا کرتی، خاص کر اسے اماں سے ہمیشہ خدشہ رہتا کہ وہ کہیں پوتے پوتیوں کو خراب نہ کر دے۔ اپنی خاندانی روایات سے علیحدہ کوئی نئی پنیری نہ لگا دے۔

دادی اپنی چارپائی ہمیشہ گیلری میں بچھاتی اور رات بھی وہیں کاٹتی۔ اسے خوب پتہ

تھا کون رات کو کس وقت گھر آتا ہے، لڑکیاں کب سوتی ہیں اور بہو کا دروازہ کس وقت بند ہوتا ہے؟ دن کے وقت وہ چارپائی اٹھا دیتی، پھر گیلری میں چوکی پر بسیرا کرتی۔ اس چوکی پر جائے نماز بچھا رہتا جس کا ایک کونہ تہہ کر کے دادی ابلیس کو جائے نماز پر نماز پڑھنے سے روکتی۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ میں دادی کی چوکی پر بیٹھا ان سے شیخ سعدی کے نوشیران بادشاہ کی کہانی سن رہا تھا۔ ظفر بے سمجھ تھا۔ وہ گیٹ کے پاس کھیل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبی سی چھڑی تھی۔ وہ اچکتا پھر چھڑی زور سے زمین پر مارتا۔ رکتا اور کہتا ......''اب آیا مزہ......آیا مزہ......بھر دیگی مجھے اڑنگی۔''

پھر دو چار قدم جلدی جلدی چلتا ہوا میں زقند لگاتا اور پورے زور سے زمین پر چھڑی مار کر وہی جملہ دوہراتا......''اب آیا مزہ......''

دادی نے کہانی درمیان میں چھوڑ دی اور ظفر کی راہ دیکھنے لگی۔ ظفر چھڑی سمیت گیلری کی طرف لپکا۔ اسے گیٹ سے گیلری تک آتے کچھ دیر لگی، لیکن دادی منتظر رہی۔

''ظفر ادھر آؤ......''

ظفر بادل نخواستہ چلا آیا۔

''ماں کا اثر ہو گیا ہے نالائق نہ دادی کو سلام نہ بھائی کو......''

''السلام علیکم......''منہ تھتھا کر ظفر بولا۔

''ادھر بیٹھو......''

ظفر میں ابھی اتنی جرات نہ تھی کہ وہ بیٹھنے سے انکار کرتا۔ دادی نے اس کے ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے پوچھا......''یہ ہاتھ میں کیا ہے؟''

''چھڑی ہے جی شہتوت کی......''

''اور تو اس چھڑی سے زمین کو کیوں مار رہا ہے......''

’’ظفر چپ رہا......

’’تو نے دھرتی کو کیوں پیٹا نالائق......‘‘

ظفر نے کسمسا کر کہا......’’بس ایسے ہی جی‘‘

’’سن رہا ہے ہمایوں......ایسے ہی ہوا میں بڑک بڑک کر زمین کو پیٹتا ہے کوئی جب تک بات نہ ہو......‘‘

’’ابھی اس نے مجھے گرایا تھا......دادی جی‘‘۔

’’اس نے کیسے گرایا تجھے۔ اچھل کر آ گئی تیرے سامنے بول بتا؟ ہاتھ پاؤں ہیں اس دھرتی کے کہ ٹھوکریں لگاتی پھرے تجھے......‘‘

’’اونچ نیچ تھی جی مجھے نظر نہ آئی ...... یہ دیکھئے میری کہنی چھل گئی ہے ساری ظفر بولا‘‘۔

’’یہ کہہ ناں ...... یہ بتا کہ چہرے پر آنکھیں ہونے کے باوجود تو اندھوں کی طرح چلتا ہے اور پیٹ رہا ہے زمین کو......ساری عمر کیا ایسے ہی بے انصاف رہنے کا ارادہ ہے......قصور اپنا ہوگا اور سزا دوسروں کو دے گا؟......لگا اس کے دو تھپڑ ہمایوں ......لگا ......لگا‘‘۔

میں نے دادی کو جپھی ڈال کر کہا ’’چلئے معاف کر دیجئے دادی ......‘‘ مجھے ظفر کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ نظر آئی۔

’’معاف کر دیجئے! ...... کتنا معاف کروں تم سب کو......تمہارا دادا زندہ ہوتا تو ساروں کو سدھ کر دیتا......وہ رفعت کی بچی مدھوبالا بنی پھرتی ہے......الو کے پٹھے شاہد کو نہ پڑھائی کا فکر نہ روزی کمانے کا، شاعر بن رہا ہے کم بخت......اور یہ شیطان کی ٹولی اور سنو بچو اسی زمین میں دھنسنا ہے آخر کو...... اس پر تو پاؤں بھی پولا پولا دھرنا چاہئے۔ جو یہ پھل فروٹ کھاتے پھرتے ہو ناں......یہ اسی دھرتی ماں نے بھیجے ہیں۔ پر تم کو پروا......ماں سارا دن انارکلی میں گھسی پھرتی ہے، دیکھتی پھرتی ہے نت نئی چیزیں

...... باپ کو سیکرٹریٹ ہو گیا ...... تربیت کون کرے؟ نیک و بد کون سمجھائے ان بلونگڑوں کو......؟ کون بتائے انسان کیوں آیا ہے یہاں، کیا ذمہ داری ہے اس کی''۔

دادی دیر تک بولتی رہی۔ میں اور ظفر گردن جھکائے پاس بیٹھے رہے۔ اٹھ جانے کی ہمت ابھی ہم میں نہیں تھی۔ دادی نے ظفر کا بازو کھینچ کر پوچھا ......''دکھا چوٹ کہاں لگی......''

ظفر نے چھلی ہوئی کہنی اور بازو پیش کر دیا جس سے اب ہولے ہولے لہو رسنے لگا تھا۔

''ہائے ہائے میرے لعل کو تو بڑی چوٹ آ گئی۔ جا ہمایوں روئی لے کر آ......''

''ٹھیک ہے دادی ...... آپی ٹھیک ہو جائے گا'' ظفر منمنایا۔

''ماروں'' گی چپکا بیٹھا رہ''۔

دادی نے زخم پر بوسہ دیا تو اس کے ہونٹوں پر تھوڑا سا لہو لگ گیا۔ پھر پتہ نہیں کیوں اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے ...... چوٹ لگ جائے تو روتے نہیں ظفر بیٹا ...... ابھی تو کشمیر میں جہاد کے لئے جانا ہے ...... مسلمان کا کیا کام رونے دھونے سے ...... ہم تو جہاد والے ہیں۔ ظلم کے خلاف، نفس کے خلاف ...... اللہ رسول ﷺ کے سپاہی ہیں ہم لوگ۔ ہمارا رونے سے کیا کام؟ آنسو بہانے والے کسی کا سہارا نہیں بن سکتے۔ نہ اپنا نہ کسی اور کا ...... مرد ہو کر رویا نہ کر بیٹے''۔

''لیکن آپ بھی تو رو رہی ہیں دادی......''

''میں اب روتی ہوں بچڑا، کمزور پڑ گئی ہوں اندر باہر ...... اب مجھ سے لہو برداشت نہیں ہوتا ...... پہلے ایسے نہیں تھا ...... بڑا بڑا لہو بہتا دیکھا ہے میں نے قافلوں میں ...... جا کر روئی لا ہمایوں کیا آلسی بچے ہیں کہا مانتے ہی نہیں۔ بالکل اپنی ماں پر گئے ہیں'' دادی نے آنسو دوپٹے میں جذب کر لئے۔

دادی کے پاس قدروں کی وراثت تھی۔ وہ اقدار، رسم و رواج، مسلک روزمرہ کی

کامن سنس کا خزانہ تھی۔ وہ اپنی وراثت تیسری پود کو منتقل کرنے کی خواہاں بھی تھی۔ مشرق میں یہ رواج عام رہا کہ ماں باپ بچوں کی پرورش میں مشغول نہیں رہتے تھے۔ ماں کو گھر باورچی خانہ، کپڑا لتا، صفائی ستھرائی مشغول رکھتی، باپ کفالت کی نذر ہو جاتا، لیکن گھر کے بزرگ بچوں پر کڑی نظر رکھتے۔ وہی روایت کو بچوں تک پہنچانے کے ضامن بھی تھے اور بسا اوقات جہالت بھی ان ہی کے وساطت سے پوتے پوتیوں نواسے نواسیوں تک پہنچتی تھی، لیکن ان کا رعب دبدبہ احسان اس قدر تھا کہ کوئی ان کے آگے بول نہ سکتا تھا...... یہ عجیب قسم کا چکر تھا۔ پہلے بیس سال مشرقی بچہ تعصب کو اپنے بزرگوں سے اخذ کرتا رہتا۔ یہ تعصب عموماً رسم و رواج سے مستعار لئے جاتے۔ پھر اگلے بیس سال ان تعصّبات کو تجربات کی روشنی میں دیکھ، چکھ، پرکھ کر چھان پھٹک کر اپنے سے علیحدہ کرنے میں بسر ہوتے۔ ان سے اگلے بیس سال نئے تعصّبات تیسری پود میں منتقل کرنے کا عہد ہوتا۔ ان تعصّبات کے ہمراہ بیشتر وقت وہ اقدار جو رسم و رواج پر مبنی نہ ہوتیں، بلکہ جن کی اثاث مذہب ہوتا، ان پر عملدرآمد ہوتا یا نہ ہوتا ان پر اتنا کڑا ایمان بھی نہ ہوتا، لیکن دادے کی یہ وراثت بھی آسانی سے اگلی نسل تک پہنچ جاتی۔ دادا خود ریڈ لائیٹ کا رسیا، شراب کا عاشق جوئے کا دلدادہ ہوتا، لیکن اپنے پوتے کو ان برائیوں سے روکنے کا خود کو نہ صرف مجاز ہی سمجھتا، بلکہ اصرار بھی کئے جاتا کہ من کنم شما حذر کنید۔ یہی تربیتی ادارہ اس قدر مضبوط تھا کہ کچھ نہ کچھ چھت سے رسنے والا پانی بنیادوں میں ایمان صورت بیٹھ ہی جاتا تھا۔

بیلکونی میں بیٹھ کر دیر تک میں دادی کو یاد کرتا رہا۔ دادی کی یاد کو بھی میں کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرسکتا۔

میری عادت ہے میں نہ تو اپنی خوشی میں کسی کو شامل کرسکتا ہوں، نہ ہی کسی دوسرے کی رسائی میرے غم تک ہوسکتی ہے۔ اندرون صحن دل میں کسی کو تاکنے جھانکنے کی اجازت نہیں دیتا...... اس تنہائی پسندی، پوشیدگی کا میں عاشق ہوں۔ میں لیمن

ڈراپ کی طرح اندر ہی اندر خوشی کو چوستا رہتا ہوں اور غم کی چیونگ گم کو چباتے رہنا بھی میرا محبوب مشغلہ ہے۔ دادی جب تک زندہ رہی، گیلری میں اس وجود بے معنی تھا۔ جس روز اس کی چارپائی گیلری سے اٹھا دی گئی اور وہ میز بھی غائب ہو گیا جس پر ان گنت معجون، چورن، دوائیاں پڑی رہتی تھیں، اسی دن سے دادی سارے گھر میں سرایت کر گئی۔ اماں نے سب سے زیادہ دادی کو ہتھیا لیا اور آہستہ آہستہ ان ہی کا روپ دھارتی گئی، جس دادی سے ماں نے ساری عمر نفرت کی، اسی دادی کی وہ کاربن کاپی بن گئی حتیٰ کہ ان کی شکلوں میں بھی مشابہت پیدا ہو گئی ایسے کیوں ہوتا ہے۔ جس سے نفرت شدید ہو، انسان وہی کچھ بن جاتا ہے۔ دراصل انسان کا کچھ ٹھیک نہیں۔ دماغ تحقیق کی طرف لے جاتا ہے اور قلب وجدان کی طرف اور ایک تیسری سمت ایسی بھی ہے جس کا نہ تحقیق سے تعلق ہے نہ وجدان سے۔

لال بجھکو کی کہانی یونیورسل ہے...... مجھے ایک مرتبہ گرمز فیری ٹیل میں بھی اسے پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ کہانی کچھ اس طور پر تھی۔

کسی گاؤں میں ایک سادہ لوح کسان رہتا تھا۔ اس کی غریبی کا یہ عالم تھا کہ بارہا فاقوں پر گزر بسر ہوتی۔ تھک ہار کر اس نے اپنے درخت کاٹنا شروع کر دیئے۔ انکی لکڑی اپنے ریڑھے پر لاد لیتا اور شہر میں صدائیں لگاتا۔ ایک گلی میں ڈاکٹر ''سب جانوں'' کا کلینک تھا پیسے کی ریل پیل تھی۔ مریضوں کا تانتا بندھا رہتا۔ ایک روز کسان بینڈے کا ادھر سے گزر ہوا۔ آواز لگائی...... ''لکڑی لے لو جی گیلی بھی جلے، سوکھی تو جلے ہی جلے......'' ڈاکٹر کا اصلی نام تو شاید کسی کو معلوم نہ تھا۔ سبھی اسے جانوں پکارتے تھے۔ ڈاکٹر نے صدا سنی تو پکارا...... ''اوئے بینڈے ادھر آ......'' جوتا اتار کر بینڈا اندر پہنچا۔ اتفاق سے یہ وقت مریضوں کا نہ تھا۔ ڈاکٹر سب جانوں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ باتوں کا شوقین تھا۔ بینڈے کو بھی دسترخوان پر دعوت دی اور گاؤں کے حالات پوچھنے لگا۔ بینڈے کو بھی دسترخوان پر دعوت دی اور گاؤں کے حالات پوچھنے

لگا۔ بینڈے نے بھانت بھانت کے اخوان نعمت سجے دیکھے تو سوچنے لگا کیا میں ڈاکٹر نہیں بن سکتا؟

پیٹ بھر ٹھونسنے کے بعد بینڈے نے ڈاکٹر سب جانوں سے پوچھا...... ''کیا میں ڈاکٹر نہیں بن سکتا......''

''لو یہ کیا مشکل ہے......فوراً بن سکتے ہو؟'' سب جانوں بولا۔

''کیسے؟''

''ایسے کرو اپنا ریڑھا ٹٹو بیچ دو۔ اچھے کپڑے سلاؤ میرے جیسے......پھر ایک بورڈ پر ڈاکٹر لال بجھکو لکھواؤ اور یہ تختی گھر کے سامنے لٹا دو......''

ابھی بینڈے کو ڈاکٹر بنے ہوئے تھوڑی دیر ہوئی تھی ہ گاؤں کے زمین دار کے گھر چوری ہوگئی۔ کس نے رائے دی کہ آپ ڈاکٹر لال بجھکو سے مشورہ کرلیں۔ وہ بلا کا سیانا ہے۔ فیڈول لارڈ بگھی میں سوار بینڈے پاس پہنچا اور سوال کیا...... ''کیوں بھئی کیا تم ہی ڈاکٹر لال بجھکو ہو......''

''بالکل'' ڈاکٹر بولا۔

''تو میرے ساتھ چلو اور مخبری کرو کہ اصلی چور کونہ ہے......''

''ضرور چلوں گا، لیکن میری بیوی بھی ساتھ چلے گی۔ میں رحموں کے بغیر کہیں نہیں جاتا۔''

اب یہ تینوں حویلی میں پہنچے۔ اتفاق سے اس وقت دستر خوان بچھا تھا، خدمت گار مامور تھے۔ زمین دار بولا...... ''کھانا لاؤ دیکھتے نہیں مہمان آئے ہیں''۔

جب پہلا خدمت گار بھنے ہوئے بٹیرے لے کر آیا تو ڈاکٹر لال بجھکو نے اپنی بیوی سے کہا...... ''یہ پہلا ہے......''

ملازم خوفزدہ ہوگیا، کیونکہ ہی پہلا چور تھا۔ اب نے اس اندر جانے سے گریز کیا اور دوسرے نوکر کو تکے کباب پکڑا کر اندر روانہ کیا۔

''لو یہ دوسرا ہوا......'' ڈاکٹر نے رحموں سے کہا۔

جب تیسرا تندوری روٹیاں لے کر وارد ہوا تو ڈاکٹر نے رازداری سے کہا......

''یہ تیرا ہوا......'' سردار صاحب کو شبہ ہوا کہ ڈاکٹر جھکو سب جانتا ہے۔

خدمت گار نے اشارے سے ڈاکٹر کو باہر بلایا اور تینوں ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے کھڑے ہو کر بولے...... ''سرکار اب تو آپ جان ہی گئے ہیں کہ ہم تینوں نے مال چرایا ہے۔ بس کچھ ایسا کریں کہ ہماری جان بخشی ہو جائے...... ہم آپ کو خوش کر دیں گے''۔

ڈاکٹر نے کہا...... ''اگر بتا دو کہ مال کہاں ہے تو میں کچھ مدد کر سکتا ہوں۔ انہوں نے وہ تندور دکھایا جس میں سونے کی اشرفیاں چھپا رکھی تھیں۔ واپس آ کر ڈاکٹر لال بجھکو نے اپنا قاعدہ کھولا جسے وہ ابھی پڑھنا سیکھ رہا تھا۔ اسے کھول کر پڑھنے لگا...... ''اب باہر آ جا...... کچھ نہ سوچ باہر آ جا......''

چوتھا چور پردے کے پیچھے تھا۔ ہاتھ باندھ کر ڈاکٹر کے قدموں میں گر گیا...... ''آقا آپ انتریامی ہیں۔ سب جانتے ہیں۔ ہمیں معافی دلوا دیں......''

ڈاکٹر نے اس شرط پر مال واپس کیا کہ خدمت گاروں کو کچھ نہ کہا جائے گا۔ سنا ہے جب زمیندار کو تندور سے اپنی دولت مل گئی تو اس نے خوش ہو کر ڈاکٹر بجھکو کو مالا مال کر دیا۔ ادھر خدمت گاروں نے بھی حسب وعدہ بینڈے کی خدمت کی اور اس طرح جناب بینڈا صاحب گاؤں کے امیر ترین وی آئی پی بن گئے......

اصغری کے ساتھ میں نے لال بجھکو جیسی زندگی بسر کی۔ اس کے ساتھ میری ہر الٹی سیدھی پڑتی رہی۔ وہ مجھے ہر معاملے میں درست ہی سمجھتی تھی۔ میری بیوی اصغری اچھی عورت تھی، اچھائی عورت کا سب سے بڑا وصف ہوا کرتا تھا۔ اس کی عادتیں، سوچ، رہنا سہنا، مذہب سے وابستگی سب مڈل کلاس ہوا کرتی تھیں۔ اس نے کبھی چاچا صمد کی طرح کسی کو شاک کرنے کے متعلق نہ سوچا تھا۔ شادی ہی ایک ایسا خواب تھا، جو اسے

گڑیاں کھیلتے ہوئے ملا اور یہی ایک خواب تھا، جس نے اس کی سائیکی پر کوئی بوجھ نہ ڈالا۔ آپ اسے زندگی سے تہی ایک ہی پگڈنڈی کا بدرنگ مسافر کہہ سکتے ہیں۔ میں اسے ایک آرام دہ ساتھی سمجھتا تھا۔ مجھے خود علم نہیں ہو سکا کہ محبت نہ ہو سکنے کے باوجود ہم دونوں کتنی سہولت سے ساتھ زندگی گزارتے رہے۔ اس نے اپنی فکروں کا بوجھ مجھ پر کبھی نہ ڈالا۔ میں کیا سوچتا رہتا تھا۔ اس کا بار میں نے اس کے جھکے جھکے کندھوں پر نہیں رکھا۔ اصغری میری چچا زاد بہن تھی، پھر وہ میری بیوی بنگئی ...... آخر کو وہ میرے دونوں بچوں کی صرف ماں رہ گئی۔ ہم میں عام میاں بیوی جیسے جھگڑے، چخ چخ نہیں تھی۔ نہ ہی ہم حاسد عاشقوں کی طرح رقیبوں کی تلاش میں رہتے تھے۔ اسے شاید اقبال والے قصے کا علم تھا، لیکن اس نے مجھ سے کبھی اس معاشقے کی تفصیلات نہ پوچھیں۔ میں جانتا تھا کہ مجھ سے پہلے اس کی منگنی شجاع بھائی سے ہوئی تھی اور یہ منگنی پورے چار سال رہ کر سسکتی ٹوٹی تھی۔

میں دل میں اپنے ماموں زاد شجاع بھائی کو پسند کرتا تھا اور جب یہ منگنی ہوئی تھی تو میرا خیال تھا کہ اس خوبصورت گریک دیوتا کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ حسین وجمیل ایکٹر نما شجاع بھائی کے لئے اصغری جیسی لڑکی ناکافی، ناموزوں اور ماں باپ کی نالائقی کا ثبوت تھا ...... بہرکیف شجاع بھائی ہمارے گھر آتے رہے، میں نے کبھی اصغری کو ان میں دلچسپی لیتے نہ دیکھا۔ یہ بھی طرفہ تماشہ ہے کہ شجاع بھائی کو دیکھ کر نہ مجھ میں حسد جاگا، نہ ہی اصغری کے لئے کسی قسم کے شک نے میرے دل میں جگہ پائی۔ اصغری اتنی اہم نہیں تھی کہ میں اس کے ماضی سے بھی حسد کرتا رہتا۔ اصغری سائبان سی عورت تھی۔ ہر وقت سایہ کرنے، دینے، ہونے کے مرحلوں میں رہتی۔ گھر پہنچ کر میں بھی بچوں کی طرح آزاد ہو جاتا، آرام دہ بیوی مجھے اسیری کا محتاج بنا دیتی، میں اسی محتاجی کا عادی ہو گیا جو اچھی عورت پیدا کر دیا کرتی ہے۔ جب کبھی لمبی پارٹنر شپ چلانی ہو تو خود انحصاری کام نہیں آتی، بلکہ آپ کا انحصار ساتھی پر ہوا کرتا ہے۔ وہی

ایسے رشتے کو آگے چلاتا ہے۔ جب بھی آپ کسی شخص پر مالی، جذباتی، ذہنی رفاقت جیسی چیزوں کے لئے دست نگر ہوتے ہیں ایک اچھے رابطے میں ضرور بھر پختگی آ جاتی ہے۔ مغرب میں خود انحصاری کے حصول نیا آزادی کی طلب نے شادی جیسے مضبوط نظام کو درہم برہم کر دیا ہے۔ اب جنس، روزی، تفریح، رفاقت ذاتی مسئلہ ہے۔ کسی ایک کنوئیں سے پانی پینے کا عمل نہیں اور اتنی خود مختاری حاصل ہونے کے بعد کسی ایک شخص سے بندھے رہنا دست نگر ہونا بہت بڑا وبال بن جاتا ہے...... اصغری اور مجھ میں کئی ضرورتیں سانجھی تھیں۔ میں بری طرح اس سایہ دار درخت کی چھاؤں کا عادی تھا۔ وہ اور اس کے بچے میری کفالت کے بغیر بہت ساری مشکلوں کا شکار ہو جاتے ہیں ...... اسی لئے زیادہ اڑچنوں کے بغیر ہماری پارٹنر شپ نبھ گئی ہم ایک دوسرے کی ضرورت بنے رہے۔

ایک رات اس نے عشاء کی نماز پڑھی۔ دو تین مرتبہ غسل خانے آئی گئی پھر گویا وہ اپنے کوچ کے متعلق یقین کی حد کو پہنچ گئی۔ میں حیران رہ گیا۔

"کیا کہہ رہی ہو...... طبیعت بہت خراب ہے تو ہسپتال چلتے ہیں"۔

"نہیں اس کا وقت نہیں ہے۔ آپ اگر پڑھنا چاہیں تو سورہ یٰسین پڑھیں بیٹھ کر ......"

میں نے ہسپتال جانے کی تیاری شروع کر دی۔

"وقت نہیں ہے جی۔ آپ مہربانی کر کے سورہ یٰسین پڑھیں......"

اس کے بعد اس نے جہانگیر کی پرورش کے متعلق وصیت کی، ارجمند کے متعلق شاید اسے یقین تھا کہ اس کی تربیت وہ کر چکی ہے اور اب باپ اس کے کام نہیں آ سکتا۔

میں نے اصغری کا سوگ کم اور اپنی آرام دہ روٹین کے ٹوٹ جانے کا غم زیادہ کیا۔ مجھ پر جلد ہی یہ بات کھلی کہ اصغری زندگی تھی، اس کا بہاؤ مسلسل تھا اور اقبال تازہ موسموں کی مانند تھی کہ بدلتے رہے، آتے جاتے رہے، لیکن کبھی بھولے نہیں...... ان

کے سحر سے میں کبھی آزاد نہ ہو سکا...... میں نے اپنی سوچ پر اصغری کا کوئی بوجھ نہیں ڈالا۔ وہ اللہ کی نعمتوں میں سے تھی جیسے میں نے اللہ کی اور کسی نعمت کا بھی شکریہ ادا نہیں کیا، ایسے ہی اصغری کا شکریہ ادا کئے بغیر اسے بھی دفنا دیا۔ اس بیلکونی میں پلاسٹک کی کرسی پر بیٹھ کر سامنے گریک بڈھے کو سگریٹ پیتے دیکھتا ہوا سوچتا ہوں۔ میں اس دنیا میں کسی کام کے لئے آیا تھا؟ کیا میں اپنی معنویت سے بے خبر ہی چلا جاؤں گا؟

کیا میں نا کردہ حسرتوں اور گناہوں پر آنسو بہانے کے لئے اتنے سال یہاں رکا رہا؟ کیا واقعی بابا آدم کے اولین گناہ کی پاداش میں میری زندگی پرائسچت میں گزرنی چاہئے؟ کیا کہیں...... اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود میں ادھورا ہوں اور اقبال کی تلاش اصل میں اسی ادھورے پن کو مکمل کرنے کی کوشش ہے...... حقیقت کے ہوئے خیال کی تلاش؟

کیا انسان اس ادھورے پن کے احساس سے کیوں اور کیسے میں بدل جاتا ہے؟

کیا یہ ادھورا پن بیرونی ہے یا اندر سے انسان خالی محسوس کرتا ہے، تڑپتا ہے، مضطرب ہوتا ہے، پھر بھی مکمل نہیں ہو پاتا۔ جس طرح چھپکلی کی دم کٹ کر تڑپتی رہتی ہے اور اسے معلوم نہیں ہوتا کہ یہ بے قراری کیوں ہے؟

کیا خوشی کی تلاش سراب کا سفر تو نہیں؟ اصلی خوشی انسان کے لئے عنقا ہی نہ ہو؟ سوچتا ہوں جب تک انسان غریب ہوتا ہے، اسے جسمانی دکھ چمٹے رہتے ہیں۔ ناداری کا حملہ جسم پر ہوتا ہے، لیکن جونہی وہ دولت مند ہو کر عام ماحولیاتی سہولتیں حاصل کر لیتا ہے، جسم آسودگی کے ایسے لیول پر آجاتا ہے جہاں اسے اس کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے کسی قسم کی کوشش نہیں کرنی پڑتی۔ ایسے میں جب جسم کی تمام ضرورتیں پوری ہو چکتی ہیں، روح انگڑائی لے کر بیدار ہوتی ہے اور اپنے مطالبات پیش کر دیتی ہے، اب غیر مرئی ضرورتیں، نظریات، ذہنی نفسیاتی اڑچنیں، سوال در سوال،

خیال درخیال، سوچ کا سلسلہ دراز ہو جاتا ہے، یہ وہ وقت ہوا کرتا ہے جب جسم اور اس کی ضروریات عموماً شانت ہوا کرتی ہیں، لیکن روح کی بیزاریاں بڑھنے لگتی ایسے میں اصلی مشکلیں کم اور خیالی مسائل زیادہ ہو جاتے ہیں۔ اب ٹینشن، فرسٹریشن ، Anxiety کا دور شروع ہوتا ہے۔ انسان کی روح، نفسیات، ذہن بے تاب رہنے لگتا ہے۔ اب پراگندگی کا حملہ باہر سے نہیں ہوتا، اندر سیغم نصیب انسان آرام دہ زندگی بسر کرتا ہوا مثل آنسو سدا گرنے پر آمادہ رہتا ہے۔

جب قیام پاکستان کے بعد ہم لاہور پہنچے تو ہمارے جیتے جاگتے مسائل تھے۔ روٹی پانی رہائش کا جھگڑا تھا۔ بچوں کی تعلیم، شادی، روزمرہ کے اخراجات ہر کمرے میں مسئلے ڈگڈگی بجاتے پھرتے تھے...... لیکن اماں، ابا، دادی، دادا اندر سے شانت تھے۔ ان کے بھیتر ٹھنڈے فوارے چلتے تھے...... وہ خوش تھے کہ انہوں نے پاکستان پالیا۔

پھر آہستہ آہستہ وہ مسائل ختم ہوتے چلے گئے...... لکشمی دیوی نے میں اپنا پجاری بنالیا...... اس کی سینا نے باہر کے تمام محاصرہ داروں کو مار بھگایا، لیکن پھر اندر کہیں سے ٹروجن ہارس آموجود ہوا۔ اس میں سے ایک اور طرح کی فوج نے سر نکالا اور ہم سب کو آہوں، سسکیوں، یادوں اور نا کردہ حسرتوں کے حوالے کر دیا...... اب ہم ناداری کے ہاتھوں نہیں پڑ رہے تھے، بلکہ سب کچھ پا چکنے کے بعد کھوکھلے پن کا شکار تھے۔ ہولے ہولے منفی جذبوں کی گرفت میں آ کر ہم غم آشنا ہو گئے۔ حسد، نفرت، حرص، نمائش، مقابلہ، ان گنت مشکلات کا اندر ہی سے سامنا تھا۔ قعر دریا میں طوفان موجزن تھا۔ روئے دریا بالکل ساکن تھا۔ میں نے بھی ذاتی اذیت کے لئے اقبال کے خواب کو بڑے رنگ دیئے تھے۔ اسی خود ساختہ مسئلے نے مجھے خوب نچوڑا تھا، حالانکہ حقیقت میں مسئلہ موجود تک نہ تھا۔

سوچتا رہتا ہوں کہ اس دارالمحن سے نکل کر ہمیں کہاں جانا ہے اور غم کی کون سی نئی شکل سے نبرد آزما ہونا ہے؟ کیا خوشی کے لئے سرگرداں رہنا ہی بنی نوع انسان کی اصل

جدو جہد ہے؟

بیچارہ دنیا میں قدم دھرتا ہے تو روتا ہے، جب وہ رخصت چاہتا ہے تو لوگ روتے ہیں ان دو وقفوں کے درمیان اسی رونے سے گریزاں وہ عرصہ حیات کو لغو اور بے معنی خوشی کی تلاش میں گزار دیتا ہے۔ کیا غم سے لڑنے بھڑنے، نبرد آزمائی کرنے یا غم سے خوشی اور خوشی سے غم کی جانب شٹل کاک کی طرح مارے جانے کا نام زندگی ہے؟ کبھی غم اس قدر ردید ہوتا ہے کہ انسان لرزے کے بخار میں جکڑا جاتا ہے۔ کبھی حزن و ملال شدید نہیں ہوتا، بلکہ ننانوے ڈگری کی حرارت بن کر انسان اس میں پھنکتا رہتا ہے۔ اسے لگتا ہے زندگی کا علاج سوائے مرگِ ناگہانی کے اور کچھ نہیں۔ غم آنسو میں ڈوبا ہو کہ سسکی صورت لبوں پر رہے، کپڑے پھاڑ کر نکل جانے کو جی چاہے یا جائے نماز پر سجدے سے اٹھتے نہ بنے۔ غم کو بہر صورت جس زاویئے، رخ، سمت سے دیکھو، انسان کی مجبوری کا نام ہے۔ حقیقی غریبی اسے جنم دے یا تمول کید باؤ سے لرزہ پیدا ہو۔ انسان غم کی گرفت سے کبھی نہیں نکلتا...... خوشی محض تکان اتارنے کا وقفہ ہے اور ماندگی کے اس وقفے سے تازہ دم ہو کر انسان پھر غم کی تلاش میں بگولا بن کر کہیں گرتا کہیں گھومتا کہیں سرپٹ بھاگتا زندگی گزارتا رہتا ہے۔

آج کے انسان نے دفاعِ غم کے لئے ان گنت خوشیاں بنالی ہیں۔ جس طرح وہ صحت کے لئے ادویات ایجاد کرتا چلا جاتا ہے، ایسے ہی وہ غم سے نپٹنے کے لئے میڈیا، بازار، ہوٹل، سفر کو استعمال کر رہا ہے۔ خوشیوں کا بازار پھیلا ہے، وہ ان میں اپنے مطلب کی خوشی تلاش کرتا رہتا ہے، لیکن پھر بھی خوشی دیرپا نہیں ہوتی...... اسے بھی رنگ برنگی ایلوپیتھک گولیوں کی طرح بار بار استعمال کرنا پڑتا ہے۔ آنسوؤں کا رنگ کبھی تبدیل نہیں ہوتا۔ حادثہ، واقعہ، حالات بدل جائیں، لیکن اندر عموماً برسات یک رنگ ہوتی ہے۔ غریبی کے دکھ، محرومی اور عزتِ نفس کی کمی کے باعث بے دم کرتے ہیں۔ امیری کے اپنے پر سوز مراحل ہیں۔ ہجر کا غم اور طور کا ہے اور وصل میں موج محیط

آب والا معاملہ پیش آتا ہے۔ کچھ خواب پریشان بن کر اقبال کی طرح ستاتے ہیں۔ کچھ اصغری کی طرح جالے بن کر جا بجا لٹک جاتے ہیں۔ شاید مشیت چاہتی ہے کہ انسان چوٹی سے گرے اور کونے دار پتھر کی طرح رگڑ کھاتا ہوا نیچے پہنچے لڑھکتا جائے۔ اس کے سارے کونے چوٹیاں گھس جائیں اور وہ ایک خوبصورت، چمکدار مدور پتھر میں بدل جائے جو ساحلوں پر چمکتی دھوپ میں پرسکون ابدی لہروں کا گیت سنا کرتے ہیں۔

زندگی تو دروپدی کی ساڑھی ہے۔

دروپدی پانچ پانڈو راجاؤں کی واحد پتنی تھی۔ یدھشٹر، ارجن بھیم سین نکل سہدیو کی پیاری راج دلاری...... جب مہاراج ادھیراج یدھشٹر نے جوئے میں دوشاشن کے ساتھ بازی لگائی اور دروپدی کو ہار دیا، تو سارا دربار چپ ہو گیا کہ جانے اب کیا ماجرا ہو۔ دیکھئے دوشاشن کی جیت کیا رنگ لائے؟ دوشاشن سنگھاسن سے اترا۔ درپدی مارے شرم کے سر جھکائے بازوؤں کے ساتھ سینہ ڈھانپے تصویر ندامت بیچ دربار کھڑی تھی۔ دوشاشن میں سو ہاتھیوں کا کس بل تھا۔ تکبر سے اینٹھ کر آگے بڑھا اور چاہا کر سر دربار درپدی کی ساڑھی اتار دے......

اب تو دروپدی چلائی ...... "کہاں ہو یدھشٹر، ارجن، بھیم، نکل سہدیو۔ میں لاج کی ماری پکارتی ہوں تم سن کر جواب نہیں دیتے؟"

ادھر دوشاشن نے پلو کھینچا تو دروپدی چیخی ...... "اے بھگوان میں ان دشٹ لوگوں کی اتیا چاری سے پریشان نہیں۔ دکھ تو اس بات پر ہے کہ میرے تو پانچ پتی ایسے ہیں کہ جن سے موت بھی بھاگتی ہے۔ وہ میری لاج جاتے دیکھ رہے ہیں اور چپ ہیں...... بھیشم تپامہ سمیت سارے بزرگ راجہ دھرتراشٹ جیسے سسر نے بھی مون سادھ لی ......اب مہاراج کرشن مرلی دھر آپ ہی لاج بچائیے......"

سنتے ہیں اسی وقت دروپدی کے تن سے رنگ برنگی ساڑھی کا کپڑا نکلتا چلا آیا۔ لال،

نیلا، پیلا...... سرکاسنی...... سارا دربار ساڑھی کے کپڑے سے بھر گیا۔ دوشاشن کے ہاتھ شکل ہو گئے، لیکن مہاراج کرشن نے دروپدی کی بنتی سن لی...... اور اسے بے حیائی کے حوالے نہ کیا...... ایسے ہی سچے پکارنے والے کبھی خالی ہاتھ نہیں لوٹے۔ ابدی سکون کو چاہنے والے یہاں وہاں ہر، مقام پر اسے حاصل کر ہی لیتے ہیں۔ انہیں زندگی میں ہی نروان، سکون، فلاح حاصل ہو جاتی ہے، لیکن دنیا میں ایسے لوگ کم ہی ہوا کرتے ہیں۔

ہم دونوں ناشتہ کرنے ڈائینگ ٹیبل پر بیٹھے ہیں۔ ابھی ابھی ڈش واشر بند ہوا ہے اور یکدم کمرے میں خاموشی چھا گئی ہے۔ سامنےوالے بلاک میں پھر سے آگ کے خطرے کی گھنٹی بج رہی ہے۔ شاید باورچی خانے میں پراٹھے پک رہے ہوں یا کوئی ہانڈی جل گئی ہو۔ کبھی کبھی خطرے کی گھنٹی اسی طرح لوگوں کو محتاط کرتی رہتی ہے۔ اس لئے بھی لوگ گھر سے باہر ہی سگریٹ نوشی کرتے ہیں، کیونکہ زیادہ تر گھر لکڑی سے بنے ہیں۔

ارجمند نے سیاہ جینز اور نیلے رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی ہے۔ جب بھی گردن موڑتی یا کچھ اٹھاتی ہے اس کی پونی ٹیل ہلتی رہتی ہے۔ اس کے سامنے بغیر دودھ والی Expresso کافی کی پیالی اور بیگل ہے۔ امریکن عام طور پر اس سخت بند کا ناشتہ پسند کرتے ہیں یہ لوگ دن میں کئی مرتب بیگل اور Cereals کھاتے ہیں۔ ان دونوں کی تیاری میں وقت نہیں لگتا۔ بچے بھی کارن فلیکس ہنی فلیکس اور قسم قسم کے Cereals کو چباتے پھرتیہیں۔ فاسٹ فوڈز پر امریکی زندہ رہتے ہیں۔ میکڈونلڈ، کے ایف سی، کنگ برگر اور ایسی ہی کئی فوڈ Chains آپ کو جگہ جگہ نظر آئیں گی۔ جو ہر لمحہ ورک اوہولک کو رجھانے اور موٹا بنانے کا کام کرتی ہیں۔ کام کرنے والے کے پاس پکانے کا وقت نہیں ہوتا۔ اسی لئے وہ فاسٹ کھانے ہی کھا سکتا ہے۔

امریکہ بھی ہر ملک کی طرح ہر انسان کی مانند تضادات کا گھر ہے۔ ہاں آرام بھی بہت اور کلفتیں بھی ان گنت۔ موٹاپا بھی ہاتھی جیسا اور دبلے پن کی خواہش میں بھٹکنے والے بھی ان گنت۔ جوگنگ کرنے والے Eating Disorders کے کلینکوں پر جانے والے، سلمنگ پارلرز میں دھکے کھانے والے بھی بے شمار۔ ادھر سگریٹ کو سرجن جنرل منع کرنے میں شیر، ادھر سگریٹ انڈسٹری کے اشتہار بے شمار، ہر موڑ پر تضاد...... اندر باہر تا دات اور تضاد میں گھرا ہوا لمحہ گھلتا گھلاتا انسان۔

''ابو آج میں نے آپ کے لئے شامی کباب بنا کر فریز کر دیئے ہیں بالکل امی کی طرح سبز مرچ اور پیار سے بھر کر''...... امی کا نام لے کر وہ خاموش ہو جاتی ہے۔ کچھ ناموں پر موت نے خاموشی کا حجاب ڈال دیا ہے۔ سوچتا ہوں ماضی کے لوگ، واقعات، یادیں، ماضی کی پراسرار گلیاں ہیں۔ ہم انہیں بھولنا بھی چاہیں۔ سرد آہیں، مندی آنکھیں، رکی رندھی آواز، روکے ہوئے آنسوؤں سے بندھ بھی باندھیں، لیکن یہ یادیں ہمیشہ ہمارے تعاقب میں ہو لیتی ہیں۔ جیسے اندھیرے میں چور کے پیچھے کوئی پولیسیا چل رہا ہو۔ مجھے ایک اور ارجمند ماضی میں مجبور کھڑی نظر آتی ہے۔ خود امریکہ کے ہاتھوں فیصلے کرنے والی اور مجھ پر اپنی مجبوری سے دباؤ ڈالنے والی۔

شاید میں کسی کو سمجھا نہیں سکتا کہ باپ کے لئے بیٹی کیا چیز ہے۔ وہ اس رشتے میں کس درجہ مجبور ہوتا ہے۔ بیٹی کی تمام مشکلات باپ کے لئے کسی محدب شیشہ سے گزر کر اتنی بڑی ہو جاتی ہیں کہ پھر باپ ان سے مقابلہ تو کرتا رہتا ہے، لیکن ہمیشہ بیٹی کے لئے خوفزدہ ہی رہتا ہے۔ بیٹی گھر سے وداع کر کے ماں باپ کبھی اس کے وجود سے خالی نہیں ہوتے۔ بیٹا ساتھ بھی رہے، ایک گھر میں ایک ہی دروازے سے آتا جاتا رہے، شادی کے بعد ماں باپ سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جاتا ہے۔ جب ارجمند نے سر جھکا کر کہا تھا...... ''آپ کو معلوم نہیں ابا۔ میری زندگی امریکہ میں کتنی مشکل ہے۔ میرا شوہر مجھے نہیں سمجھتا۔ میں پوری کوشش کرتی ہوں، لیکن وہ مجھ میں...... میرے وجود

میں......میری ذات میں رتی بھر دلچسپی نہیں رکھتا۔ ہمارے گھروں میں مرد کو گھریلو کاموں میں دلچسپی لینا سکھایا ہی نہیں جاتا......وہاں......بڑی مشکل ہے ابا جی۔ بلال کو میری مدد کرنی چاہیئے، لیکن نہیں کرتا......میں کماؤں بھی اور گھر بھی رکھوں......بچے بھی پالوں......ارجمند کیا کیا کرے ابا جی......کیا کچھ کرے؟''

میں آپ کو کسی تسلسل یا تواتر سے کوئی کہانی سنانا نہیں چاہتا......بلکہ یہ چھوٹی چھوٹی جھلکیاں ہیں جو وقت بے وقت مجھے ستایا کرتی ہیں۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ جہانگیر کے ساتھ میں امریکہ نہیں گیا۔ ہوسکتا ہے اس میں ساری فلاسفی کے باوجود کہیں اندر ہی اندر خوف بھی ہو۔ شاہدہ Feminist تھی۔ وہ عورتوں کی آزادی کی اس حد تک متمنی تھی کہ اس کے دل سے وائے اپنے ہر کس و ناکس کی زندگی، عزت اور خوشی محو ہو چکی تھی۔

میری بیٹی ارجمند بھی آزادیٔ نسواں کی ویسی ہی علمبردار تھی......وہ بھی جب مجھے گھر سے اکھاڑنے اور امریکہ میری پیوند لگانے کے درپے ہوئی تو اس کی ساری منطق شاہدہ جیسی تھی۔ وہ اپنے ڈاکٹر شوہر کے خلاف ویسے ہی پٹ سیاپا میں مبتلا تھی جیسا شاہدہ نے اپنے گھر والوں میں جہانگیر کے خلاف کیا ہوگا، لیکن بیٹی کے لئے باپ کا دل مختلف ہوتا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ فرد اور قوم جب کچھ مان لیتی ہے تو پھر اس کے ردعمل انصاف پر مبنی نہیں رہتے۔ وہ اپنے نظریے اور عمل کے لئے ایسے ایسے جواز ایجاد کرتی ہے جو سرے سے بے انصافی پر مبنی ہوتے ہیں۔ ارجمند کے معاملے میں میری ہمدردی، محبت اور مدد کی خواہش سرسطحی تھی۔ تلچھٹ میں کیا تھا، اس کی مجھے خبر نہ تھی۔

''آپ کو معلوم نہیں ابا جی! ڈاکٹر صاحب کتنے پتھر دل ہیں۔ ان کے پاس تو میرے لئے کوئی وقت ہی نہیں ہوتا۔ ہسپتال سے آ کر سیدھا ٹیلی ویژن فٹ بال، فٹ بال، فٹ بال......پھر کھانا پینا اور کھٹ بسرا......صبح شام وہی روٹین......میرا تو وہ

نوٹس ہی نہیں لیتے سرے سے''۔

''ٹیلی ویژن پر کیا دیکھتا ہے......''

''فٹ بال میچ، پہلوانی کے دنگل اور سائنس فکشن''

''تم بھی پاس بیٹھ کر ٹیلی ویژن دیکھ لیا کرو......''

''مجھے ایسے پروگراموں میں کوئی دلچسپی نہیں ابا...... مجھے کشتی دیکھ کر تے آتی ہے''

''اور فٹ بال میچ......؟''

''اس میں کیا پڑا ہے، پھر میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا ابا کچھ ہاؤس ورک کرنا ہوتا ہے۔بچوں کو ہوم ورک کرانا پڑتا ہے۔ہڈیاں ٹوٹ جاتی ہیں کام کر کر کر کے''۔

''تمہارے شوہر کی معقول آمدنی ہے، نوکری چھوڑ دو اور گھر بیٹھو آرام سے''

''اور سارا دن کیا کروں مکھیاں ماروں...... انتظار کروں شوہر کا...... بچوں کا''

میں نے کہنا چاہا کہ یہ دونوں مشغلے ہڈیاں تڑوانے سے بہتر ہیں۔پھر کام کا رڈی رونا بھی ختم ہو جائے گا ہاؤس ورک سے دل لگا رہے ہوگا، لیکن بیٹی کے معاملے میں باپ انصاف کی طرف نہیں بیٹی کی محبت کا طرف دار رہتا ہے۔اس نے دو چار بار اپنے شوہر کے خلاف محاذ آرائی کی۔ میں نے ٹکٹ بنوایا اور امریکہ چلا آیا۔

اس کے بہت بعد مجھے علم ہوا کہ ڈاکٹر کی داستان بھی جہانگیر سے کچھ کم نا خوش گوار نہیں تھی اور ارجمند بھی اپنی طرز کی شاہدہ ہی تھی، لیکن اس آگاہی کے باوجود میرا دل ارجمند ہی کے لئے پریشان رہتا۔ مجھے شاہدہ پر کبھی ترس نہ آیا۔میرے دل میں ڈاکٹر بیٹے کے لئے کئی ہمدردی نہ جاگی......

شاید اسی لئے تفکر کا حکم آیا، جذبات کی رو میں بہہ کر قومیں اور افراد کبھی انصاف نہیں کر پاتیں، ان کی سوچ ہمیشہ ٹیڑھ اور تعصب سے بھری ہوتی ہے۔

فون کی گھنٹی بجتی ہے۔وہ بیگل رکھ کر فون سنتی ہے۔پھر لوٹ کر کہتی ہے......

''یہ تو حال ہے بلال کا''۔

میں ناشتہ کر رہا ہوں۔ میرے ہاتھ میں چائے کی پیالی ہے۔ میرے نواسے جمشید اور قیصر بڑے شوق سے بیگل کھاتے ہیں۔ وہ حلوہ پوری، پراٹھا انڈہ کھانے کی لذت سے نا آشنا ہیں۔

''کیوں کیا ہوا بلال کو......''

''جہاں کار پارک کی تھی۔ وہاں سے ہسپتال تک جاتے جاتے سارے بھیگ گئے''۔

''بیچارہ......''

''بیچارہ نہیں ایڈیٹ...... انسان کو اتنا تو پتہ ہونا چاہئے کہ صبح کام پر جاتے وقت چھتری ساتھ رکھنی ہے...... بے دھیانے اس قدر ہیں کچھ پتہ ہی نہیں ہوتا۔ امریکہ کا موسم کدھر جا رہا ہے۔ اتنے سال یہاں رہنے کے باوجود ابھی تک نہیں جانتا کہ Valentine Day کس طرح منایا جاتا ہے۔ گروسریز لینے جائے گا تو ایسی ایسی چیزیں اٹھا لائے گا جن کی کوئی ضرورت نہیں اور وہ سب کچھ بھول جائے گا جن کی فہرست بنا کر دی تھی۔ کبھی ہماری شادی کی Anniversary یاد نہیں رہتی۔ پاگل پرانے مریضوں کو ہیپی کرسمس کے کارڈ بھیجنا کبھی نہیں بھولا اور گھر والوں کا پتہ ہی نہیں کہ ان کی برتھ ڈے کب ہوتی ہے...... پوچھیں ابو۔ پوچھیں کبھی بلال سے جمشید پریپ میں ہے کہ کلاس ون میں۔ بتا نہیں سکیں گے آپ کو...... میری سالگرہ کو تو چولہے میں پھینکیں کبھی یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ بچوں کا جنم دن کون سا ہے......''

ارجمند بولتی چلی گئی اور میں بیگل پر مکھن جیم لگاتا رہا۔

ارجمند جس طرح بول رہی تھی لگتا تھا کہ وہ اور بلال ازلی دشمن ہیں۔

میں نے توے پر ٹھنڈے چھینٹے چھینکنے کے انداز میں پوچھا...... ''کیوں بھئی بلال اچھا ڈاکٹر ہے...... ہے ناں''

کچھ دیر وہ سوچتی رہی۔ پھر بولی...... ''ہاں ہے شاید...... ہسپتال والے تعریف

کرتے ہیں“

”پھر تمہارے لئے کیا یہ کافی نہیں؟...... وہ تمہاری کفالت میں پورا اترتا ہے...... ہے ناں؟“

”نہیں...... وقت بدل چکا ہے ابو۔ ابو مرد کو اور جہتوں پر بھی لڑنا پڑتا ہے۔ اسے گھر پر بھی پوری مدد کرنی چاہئے“

”وہ کیوں؟...... کیا وہ کافی پیسے نہیں دیتا......“

”پیسے کی بات نہیں ہے ابو۔ پیسے تو کافی ہیں، لیکن میں سارا دن کیا کروں۔ مجھے بھی تو اپنی شناخت چاہئے۔ بلال ابھی بھی آپ کے زمانے میں رہ رہا ہے، بلکہ دادا جی کے وقتوں میں زندہ ہے۔ اب عورت پاؤں کی جوتی نہیں، مرد نہاتا دھوتا گھوڑا نہیں ہوا کرتا آج کل۔ عورت کا اب سسرال سے جنازہ ہی نہیں اٹھتا۔ وہ اپنی مرضی سے واک آؤٹ بھی کر سکتی ہے...... وہ بڑبڑاتی چلی جاتی ہے۔ گھر پر کوئی موجود نہیں۔ میں ناشتہ کرنا چھوڑ دیتا ہوں۔

شاید دادی اگر زندہ ہوتی تو مختلف قسم کا نظریہ رکھتی، اس کے نزدیک اگر مرد کمانے جوگا ہو تو پھر اس سے کچھ بھی اور مانگ نہیں سکتے۔ اس کی کفالت ہی اس کی سب سے بڑی خوبی ٹھہرتی ہے۔

ہمارے زمانے تک عورت اپنے خداداد Goal سے بندھی تھی۔ بچہ عورت کا مستقبل تھا۔ اس کی پرورش اس کا نیچرل فنکشن اور بچہ اس کی زندگی تھا۔ اگر چہ بوجوہ زندگی میں فیل ہو جاتا تو پھر عورت کے لئے کوئی بھی کامیابی باقی نہ رہتی، لیکن اب عورت نے بچے کو پس پشت ڈال کر اپنا مستقبل بنانے، اپنی شناخت تلاش کرنے کا عزم کرلیا ہے۔ قدرتی فطرتی حیاتیاتی گول ختم ہو جانے کے بعد عورت اب مرد کی طرح کھوکھلی ہو رہی تھی۔ مرد کو ہمیشہ اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لئے کوئی نہ کوئی منزل تلاش کرنا پڑتی ہے۔ کبھی وہ عورتوں کے پیچھے بھاگتا ہے۔ کبھی شراب جوئے

کے لئے دیوانہ ہو جاتا ہے۔ شاعر، ادیب، مصور، فنکار اس بات کے شاہد ہیں کہ مرد کو اپنی شناخت کے لئے تخلیق میں شناوری کی بھی ضرورت رہتی ہے، وہ اپنے آپ کو منوانے کے لئے بڑے جتن کرتا اور پاپڑ بیلتا ہے۔ جب ایک بار انا کا کوبرا آپ کے پیچھے لگ جاتا ہے تو پھر اس سے جان بچانا مشکل ہے، لیکن عورت بچے کے سہارے اس کی پرورش کی پتوار پکڑ کر اس کے مسائل میں کھوئی اپنی ذات سے نجات پا لیتی ہے، چونکہ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ عورت کو بھی وہ ساری Depression, Frustration تنہائی، ٹوٹ پھوٹ کی ضرورت ہے جو پہلے صرف مرد کا مقدر تھا۔ پہلے عورت یک لئے دردزہ کافی تھا۔ اب اس نے دردِ دل اور غمِ روزگار بھی پا لیا ہے اور غزل کے شعر کی طرح اپنی چھوٹی سی کائنات میں طوفان اٹھائے پھرتی ہے۔ میں نے ارجمند کو سمجھانے کی کوشش نہ کی۔ بھلا کوئی باپ بیٹی کو سمجھا پایا ہے کبھی؟ وہ تو صرف بیٹی کا ساتھ دیتا چلا جاتا ہے۔

ارجمند کے چلے جانے کے بعد سوچتا ہوں کہ مرد اور عورت ہمیشہ محبت کے حصول کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ دولت بھی کئی بار اسی توجہ کو حاصل کرنے کے لئے جمع کی جاتی ہے۔ عزت نفس، توقیر ذات، خودی کا تصور بھی اسی محبت کے شاخسانے ہیں۔ محبت کی تلاش میں مرد اور عورت کا طریقہ واردات ان کی جسمانی ساخت کی مانند مختلف ہوتا ہے۔ عورت نئی محبت کے ساتھ ساتھ پرانی تصویر بھی دل میں ٹنگی رہنے دیتی ہے۔ پرانی محبت نو یافت محبت سے مزاحم نہیں ہوتی۔

لیکن مرد کے لئے مکان خالی کرنے کی شرط ہے۔ وہ اللہ کی محبت پالنا چاہے کسی عورت کا مفتون ہو، اسے قلب خالی کرنا پڑے گا۔ مرد کی یہ بدنصیبی ہے کہ اس کا محبوب اس کے دل پر نمبروں والا تالا لگا کر صبر کرتا ہے۔ شادی کے بعد ماں کی محبت کو دل میں جگہ نہیں دی جا سکتی۔ نئی نویلی دلہن ماں کی تصویر کو دیوار پر بھی برداشت نہیں کر سکتی، چہ جائیکہ اس کی جگہ دولہا کے دل میں ہو۔ مرد عورت کے دل سے اس کے مائیکہ گھر کی

یا دیں محو نہیں کرتا ...... کبھی بیوی کی ماں کو اپنا رقیب نہیں سمجھتا، لیکن عورت سے دوئی برداشت نہیں ہوتی۔

اگر عورت بچہ جنے تو اس سے مرد یہ امید نہیں رکھتا کہ وہ صرف پہلوٹھی کے بچے کی ماں ہو۔ ہر بچہ پچھلے بچے سمیت اپنی ماں کا حق دار ہوتا ہے اور مرد تو یہاں تک فراخ دل ہے کہ سوتیلی ماں لانے کے بعد اس خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ کم از کم میری بیوی سب سے محبت کر سکتی ہے اس لئے سوتیلے کو بھی گود میں لے کر پال دے گی۔ بچے کے معاملے میں مرد عموماً بدنصیب ہوا کرتا ہے۔ وہ کسی بچے کا مالک نہیں ہو سکتا۔ اس کا کفیل بن سکتا ہے، لیکن دروازے پر کھڑا صرف اندر آنے کی اجازت مانگتا رہتا ہے۔ اجازت کبھی نہیں ملتی۔

عورت شادی سے پہلے یا بعد میں محبوب رکھنا چاہے تو چپ چاپ اس کی مورتی پوجا کر سکتی۔ مرد ایک وقت میں دو محبوب رکھنا چاہے تو طوفاں آجاتا ہے۔ دوئی سے نکلے بغیر اسے محبت مل نہیں سکتی ...... عورت اللہ میں ڈوبنا چاہے تو سارے پیاروں سمیت اس میں غرق ہو سکتی ہے، لیکن مرد کے لئے حکم دوسرا ہے ...... اللہ کے لئے مکان خالی کرنے کی شرط ہے، سارے رشتے، بت نکال کر پھینکنا پڑتے ہیں۔ حتیٰ کہ مرشد کی شبیہ بھی خارج از خیال کر کے ایکسائی سے رجوع کرنا ہوتا ہے ...... مرد کا سفر تنہائی کا سفر ہے۔ عورت کا سفر میلے میں گھومنے پھرنے، سیر کا علم ہے۔ دونوں اپنے اپنے ظرف بھر قیمت ادا کرتے ملے جاتے ہیں۔

میں ارجمند سے گزر کر اپنے ماضی میں ڈبکیاں لگانے لگتا ہوں۔ بوڑھا آدمی آسانی سے یہی بائی سیکوپ دیکھ سکتا ہے۔ بچے اور ارجمند قریبی بازار سے گروسریز خریدنے چلے جاتے ہیں۔ میں دوسری منزل کی بیلکونی سے ہاتھ ملا کر انہیں اللہ حافظ کرتا ہوں۔ جمشید اور قیصر امریکن زندگی میں اوپرے نہیں۔ انہوں نے تیرنا ہی ان پانیوں میں سیکھا، لیکن بلال اور ارجمند جب بھی بولتے ہیں، ان کے لہجے میں پاکستانی

پن ہوتا ہے۔جمشید اور قیصر کی آوازیں، الفاظ ان کی ادائیگی میں امریکن لب ولہجہ کا دبدبہ اور کھنک ہے۔وہ ابھی احساس کمتری سے آشنا نہیں۔انہیں معلوم نہیں کہ امریکہ میں وہ ہمیشہ سکینڈ ریٹ سٹیزن رہیں گے۔خیال میں ہال روڈ کی دوکان ابھرتی ہے۔

تب آپا کی دوستی اقبال سے زور شور پر تھی، نہ ملنے کی صورت میں خط آتے۔کبھی کبھی میں ان خطوں کی ٹوہ میں آپا کے کمرے میں چلا جاتا۔پتہ نہیں کسی انسان کو جاننے کی خواہش میں اس کی خوشبو، تحریر، لباس عادات کا کیوں تعاقب کرنا پڑتا ہے، ابھی محبت ٹیلی فون سے محفوظ تھی۔آواز کے سہارے جلد قریب آ کر بہت دور چلے جانے کی رسم عام نہ ہوئی تھی، ہمارے عہد میں محبت دیر تک گونگی رہتی، پھر آنکھ مچولی میں بدلتی، کبھی سپاہی چور کو پکڑ نہ پاتا اور کبھی کبھی چور خود تھانے میں حاضر ہو جاتا، لیکن اے ایس آئی موجود نہ ہوتا اور ایف آئی آر نہ لکھی جاسکتی۔کچھ معاشرے کے عطا کردہ حجاب تھے، کچھ اقدار کی تربیت کا حاصل تھا۔مرد اور عورت ایک دوسرے کی پہلی کو برسوں تک حل نہ کر پاتے اور محبت اندر ہی اندر شہد کا چھتہ تیار کرتی رہتی، کبھی کبھی اسی پھیر والا پھرولی میں ساری عمر بیت جاتی اور دھاگے کا سرا تک نہ ملتا، گنجلیں تو کیا کھلتیں۔

میں اقبال کی تلاش میں آپا کے کمرے میں پہنچا۔آپا پلنگ کے نیچے بیٹھی تھی اور اقبال اس کے لمبے بالوں میں کنگھی پھیر رہی تھی۔ابھی ہیر ڈریسر، بیوٹی پارلر، سملنگ سیلون لڑکیوں کی زندگی میں در نہیں آئے تھے اور سہیلیاں ایک دوسرے کے بالوں میں کنگھی پھیر کر خط اٹھاتی تھیں۔کبھی جھوڑا، کبھی دو چوٹیاں اور کبھی کھجوری چٹیا بنا کر خوش ہوا کرتیں۔

"میں آجاؤں آپا......"

شادی کی تیاریوں نے آپا کو بھرپور دھونس والی بہن بنا دیا تھا۔

"آ کر پوچھتے ہیں؟"

اقبال نے اپنا گھٹنا آپا کی کمر میں ٹھوک کر کہا۔"کیسے بولتی ہیں۔اتنے بڑے شاعر

ہے......‘‘

میری انا کو تھپکی ملی۔ میں مسکرا کر اندر داخل ہو گیا، بید کی کرسی پر ایسے بیٹھا کہ میرا سینہ کرسی کی پشت سے لگا تھا اور دونوں ٹانگیں سیٹ کے ادھر ادھر تھیں۔ ایسے عموماً سرکس کے جوکر بیٹھا کرتے تھے۔ میں کسی طرح اقبال کو ہنسانے کے موڈ میں تھا۔ نہ جانے کیوں مردوں میں یہ خواہش عام ہوتی ہے کہ عورتیں ان کی بات سن کر ہنس دیں۔ ہنسی کی گرین لائٹ انہیں آگے بڑھنے کا سگنل دیتی ہے۔ کافی دیر خاموشی رہی آپا کو جیسے میرا آنا ناگوار گزرا۔ وہ نظریں جھکا کر کنگھی کرواتی رہی۔ اقبال کے ہاتھ بڑی شفقت سے بالوں کی گرہیں کھولتے رہے۔ پتہ نہیں کیوں اور کیسے یہ شفیق لمس مجھ تک پہنچ رہا تھا۔ بڑی دیر کے بعد اقبال بولی۔ ’’تمہارے بال بہت نرم ہیں رفعت آپا۔‘‘

’’ساری آنولہ ریٹھا کی مہربانی ہے۔ میں نے کبھی شیمپو استعمال نہیں کیا‘‘

پلکوں کی بھاری چلمن اٹھا کر لحظہ بھر کر اقبال نے میری جانب دیکھا۔ میں آج تک اس نظر کے معنی نہیں سمجھ پایا۔ کیا یہ سوال نظر تھی؟ کیا اس نظر میں توصیف و محبت تھی۔ کیا یہ نظر تنبیہ کرنا چاہتی تھی اور مجھے کانٹے دار جھاڑیوں میں گھسنے سے منع کر رہی تھی؟ کیا اس نظر میں اعتراف شکست تھا یا وہ فتح مندی کے احساس کے ساتھ جھنڈا لہرانے آئی تھی۔ اس چھوٹی سی نظر کے سہارے میں نے کئی دن گزارے، سونے سے پہلے، صبح جاگنے کے بعد میرا سارا وجود ہمک کر اس نظر سے لپٹ جاتا اور اسی نگاہ کو سیڑھی بنا کر اس کی روح میں اتر جانے پر بضد رہتا۔ مجھے ڈائری لکھنے کی عادت تو نہ تھی، لیکن میں سونے سے پہلے اقبال سے ہونے والی ساری ملاقاتوں کو ذہن میں الٹتا پلٹتا، دیکھتا پرکھتا۔ ہم دونوں جب بھی ملتے گھر کا کوئی دوسرا فرد عموماً موجود ہوتا، لیکن جو البم میں نے اپنے اندر بنا رکھی تھی، اس میں صرف اقبال کی تصویریں تھیں۔ میں سونے سے پہلے بڑی دیر تک ان تصویروں کو دیکھتا رہتا۔ ایسے میں مجھے ان گنت ایسے جملے بھی

سنائی دیتے جو اقبال کی زبان سے ادا نہ ہوئے تھے۔ میں خود کئی ایسی باتیں کہتا جن کے کہہ دینے کا کوئی جواز موجود نہ تھا اور جو ہرگز ہرگز کہی نہ جا سکتی تھیں۔ ہمارے عہد میں محبت عمل میں کم اور خیال میں زیادہ ہوتی تھی۔

ایسے ہی گونگی بہری انجان سی محبت نے میرے اندر ایک پوری کائنات پھیلا رکھی تھی جس کے واقعات فرضی ڈائیلاگ من گھڑت، لمس اچھوتے، اظہار منہ بند اور واقفیت کے لمحے قریب قریب مفقود تھے۔ اس کے باوجود سرکس میں رسی پر چلنے والے شعبدہ باز کی طرح اس محبت کا کرشمہ کبھی دل سے محو نہ ہوا۔ آج کے عہد میں جب ایک ہی شام میں ریسٹورنٹ میں سینڈوچ کھانے اور کافی پینے سے لے کر بیڈ روم تک کے سارے معاملات بھی طے پا جاتے ہیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ اقبال اور میرے درمیان زیادہ سے زیادہ کچھ نہ تھا اور پھر بھی ایک روز میں نے اس کے دوپٹے کو ذرا سا گرفت میں لے کر کھینچا تھا۔ میری آرزو تھی کہ وہ ذرا پیچھے ہو جائے اور میرے گھر کے باقی ہجوم سے ہٹ کر ہم دونوں میں کوئی بات سب سے علیحدہ ان کہی ان بوجھی بھی طے پا جائے۔

اس روز ہم سب شالامار میں پکنک منانے گئے تھے۔ شاہد بھائی بھی ہال روڈ کی دکان بند کر کے ساتھ چلے آئے تھے۔ امی ابو، ہم پانچوں بہن بھائی کے علاوہ چاچا صمد بھی ہمراہ تھے۔ آپا ہمیشہ کی طرح سہیلیوں کے جھرمٹ میں تھی۔ چاچا صمد اقبال سے ایسی بے تکلفی سے پیش آتے گویا ایک زمانے سے اسے جانتے ہوں۔ اس روز ہم سب نے بڑے مزے دار قیمے کے پراٹھے باغ میں کھائے۔ پہلے دو پیٹیاں آم کی اوپر تلے رکھی تھیں۔ پھر وہ دو ڈھیر چھلکوں کے بن گئے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ اس روز بارش ہوئی تھی اور ہوائیں باغ میں دوپٹہ بدل سہیلیوں کی طرح جھول جھول کر چل رہی تھی۔ اندرون شہر کے گھبرائے ہوئے متوسط طبقہ کے لوگ ہماری طرح پکنک منانے آئے تھے۔ ایئر کنڈیشنر کا کرشمہ ابھی عام نہ ہوا تھا۔

پھر ہم سب نے کوٹلہ چھپا کی کھیلنا شروع کر دیا۔ یہ شرارت چاچا صمد کی تھی۔ امی ابو تو بزرگی جتانے کے بہانے کھیل سے باہر رہنا چاہتے تھے، لیکن چاچا صمد میں بڑی قوت تھی۔ وہ جب کچھ ٹھان لیتا تو پھر کسی روک کو نہ مانتا۔ کچھ چوں چڑ اقبال نے بھی کی۔ وہ غالباً سب کے سامنے بھاگنے سے شرماتی تھی اور کالج میں پڑھنے کے باوجود شرمیلی تھی۔

اس کھیل کے دوران جب چاچا صمد کوڑا گھماتے دائرے میں بھاگتی اقبال کے پیچھے پھنکارتے بھاگے تو اس کا پاؤں رپٹ گیا اور وہ مجھ پر گری...... اسی وقت بجلی چمکی اور کڑاکے کا شور ہوا۔ یہی ایک لمس میرے اندر یادگار پاکستان بن گیا۔ مجھے اقبال کے ساتھ اصلی محبت کا کوئی تجربہ نہ ہوا۔ میرے پاس نہ خطوط تھے نہ گل بیوں کی یادیں تھیں۔ نہ شکوے شکایت کے رجسٹر تھے، نہ ہی انتظار کی کوئی داستان تھی۔ ہم دونوں ہم قدم، ہم زبان، ہم مکتب بھی نہ تھے۔ وہ جب بھی میری جانب دیکھتی، میں یہی سمجھتا یہ نظر آب حیات برسا رہی ہے۔ اتنی کم آمیز اظہار سے تہی محبت کا اتنے برسوں میرے تعاقب میں چلے آنا میرے لئے اب بھی عجیب سی بات ہے۔

مجھے یاد ہے جس روز شاہد بھائی کی شادی تھی، وہ اس صبح دیر تک میرے کمرے میں بیٹھے رہے۔ پہلے انہوں نے دو تین بار چائے پی، پھر ماسی جی کی لائی ہوئی اندرون شہر کی بالوشاہیاں کھائیں۔ نروس ہو کر دو تین پان چبا گئے۔ شاہد بھائی کا کچھ عجیب سا موڈ تھا۔ وہ ہاتھوں اور پیروں کی مہندی کے باعث اوپرے سے لگ رہے تھے۔ شاہد بھائی نے بڑے ہونے کے ناطے کئی ادھوری پوری قربانیاں دی تھیں۔ انہیں پڑھائی کا شوق تھا، لیکن ابو کی آمدنی کم تھی اور ہم لوگ فضول خرچ نہ ہوتے ہوئے بھی کئی بنیادی ضرورتوں سے محروم رہ جاتے تھے۔ فورتھ ایئر کے امتحان سے کچھ پہلے ہی شاہد بھائی نے اورینٹل کالج جانا چھوڑ دیا۔ انہوں نے ہال روڈ میں ایک چھوٹی سی دکان الاٹ کرالی تھی یا شاید تالا توڑ کر دکان کو ہتھیا لیا تھا۔ اب وہ اپنی دکان پر بجلی کا سامان

مرمت کرتے تھے اور دکان پر چھوڑے ہوئے سامان کو اونے پونے بیچ کر ابو کی مدد بھی کرتے تھے۔ شام کو عموماً وہ کافی ہاؤس چلے جاتے، جہاں انہیں اپنی شاعری سنانے کا موقع تو کم ملتا، لیکن جھہاں شاعر ادیبوں سے بہت سستے داموں ملاقاتیں ہوتی رہتیں ساندھے سے ٹمپل روڈ تک کا فاصلہ چند سالوں میں طے ہو گیا اور شاہد بھائی نہ جانے کیوں کافی ہاؤس بھی جانا چھوڑ گئے۔ وہ اب میری غزلیں نظمیں سن کر بڑے کھلے دل سے داد دیتے۔ ان کی بڑی آرزو تھی کہ میں مشاعروں میں حصہ لوں، خاص کر ریڈیو پاکستان کا کوئی مشاعرہ ایسا ہو جس میں میری شرکت لازمی سمجھی جائے۔

''یار تم شاعری کی طرف سے غفلت برت رہے ہو۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ ایسا ذہن رسا عام نہیں ہوتا......''

''آپ نے شاعری کیوں چھوڑ دی شاہد بھائی؟''

وہ دیر تک سوچتے رہے جیسے درست جواب تلاش کر رہے ہوں۔

''میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں ہمایوں کہ میں مستری ہوں شاعر نہیں ہوں......''

''یہ آپ نے کیسے اندازہ لگایا؟......''

''اندازہ نہیں یقین ہے میرا...... میں قافیے سامنے رکھ کر جوڑ توڑ کیا کرتا تھا۔ مجھے آمد نہیں ہوتی...... آمد اور طرح کی اصلی شاعری ہوتی ہے''

مجھے یقین نہ آیا، کیونکہ میں نے کبھی انہیں ڈکشنری دیکھتے یا قافیہ جمع کرتے نہ پایا، لیکن شاید اصلی وجہ وہ مجھے بتانا نہ چاہتے تھے۔ ان کی خواہش کو میں بھانپ چکا تھا۔

''کیا محبت میں قربانی ضروری چیز ہے؟......'' اچانک میرے منہ سے نکلا۔

''تم کیوں پوچھتے ہو ہمایوں؟''

''کیونکہ میں جانتا ہوں، آپ نے شاعری میری وجہ سے چھوڑی...... آپ چاہتے ہیں کہ میرے نام کا ڈنکا بجے...... آپ بادشاہ گر ہیں۔ آپ بادشاہ بننے سے کتراتے ہیں، آپ کا مزاج چھوڑنے کا ہے، پکڑنے کا نہیں۔''

''شاید......''

''بادشاہ کی ذمہ داری سے وزیر گھبراتا ہے۔ وزیر کی تدبیر بادشاہ کے لئے مشکل ہے۔ آپ شاعر ہونے کی ذمہ داری سے بدک گئے ہیں شاہد بھائی''

''شاید......شاید......میں سمجھتا ہوں وہ تمہیں زیادہ پسند کرتی ہے......''

اچانک شاہد بھائی کے منہ سے بہت بڑی بات نکل گئی۔ اب وہ پرندہ واپس پنجرے میں قید نہیں کر سکتے تھے۔

''میرا تو خیال تھا کہ وہ آپ کی طرف مائل ہے......''

''اب کیا فرق پڑتا ہے، میرا پتہ تو کٹ گیا۔ تمہیں اب اس کی توجہ مبارک ہو۔''

شاہد بھائی اٹھ کھڑے ہوئے پھر انہوں نے اپنا مستریوں والا مضبوط ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیا۔ اس ہاتھ میں گرمائی، پذیرائی، حوصلہ افزائی اتنا بہت کچھ تھا۔

''یار جتنا وقت انسان خیال کو اصل جانکر ضائع کرتا ہے کاش اتنا وقت حقیقت کے تعاقب میں بسر کیا کرے تو بہتر نتائج نکل سکتے ہیں۔ انسان کو خیال نے ہمیشہ ریگستان میں اکیلا چھوڑا ہے''

وہ ایک ٹھنڈی آہ بن کر کمرے سے نکل گیا۔

میں سوچتا رہا کہ انسان کو وقت گزارنے کے لئے اصل ضرورت خیال کی ہوتی ہے یا حقیقت کی؟ وہ وقت کے بوجھ تلے اسی خیال کی مدد سے فرار ہوتا ہے؟ کہ حقیقت اسے باہر نکالتی ہے۔ ایک چھوٹی سی کرکٹ کی گیند کے پیچھے ایک دنیا دیوانی ہوئی۔ کرکٹ گیند حقیقت نہیں ہے، اس سے وابستہ ہار جیت ایک تصور ہے، دیکھ لیجئے کتنی خلقت اس گیند کے لئے دیوانہ وار ناظرین کا انبوہ بن جاتی ہے۔ جوا ء یہ گیند کھلاتی ہے، ملکوں کی دشمنی اور دوستی تک اسی ایک ننھی سی گیند سے وابستہ ہو جاتی ہے۔ اصل کچھ نہیں، ساری دیوانگی اس خیال کی پیدا کردہ ہوتی ہے جو اس کرکٹ کی گیند سے وابستہ کئے جاتے ہیں۔

اقبال بھی ایسے ہی ایک تصور تھا جس نے میری زندگی کے سارے مہ وسال ایک خیال سفر میں بدل دیئے ...... میں بھی اس تصور کی گیند کے پیچھے بھاگتا بھاگتا نہ جانے کتنی مدتوں اندر ہی اندر آوارہ رہا۔ شاہد بھائی ٹھیک کہتے تھے۔ خیال ریگستاں کا سفر ہے۔

جب سے ترقی نے انسان کو حقیقت کا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور کیا ہے، شعور کو لاشعور سے زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی۔ انسان اب لاشعور میں بسنے والے خیال کے بجائے شعوری حقیقت کے درپے ہیں۔ وہ اندر کے امکانات، ممکنات کو پس پشت ڈال کر ایسی اشیاء کے تعاقب میں بھاگا پھرتا ہے، جن کو ہم اپنے حواس خمسہ سے پہچان سکیں۔ خیال، سوچ، وسوسہ، وہم، مسلک سب لاشعور کے ابال ہیں۔ اب تخلیق عمل بھی لاشعور کی کرامت نہیں رہا، بلکہ شعور اسے لیبارٹری میں اغوا کر کے لے گیا ہے۔

امریکہ کی ترقی کا راز اس کے مسئلوں میں ہے۔ وہ پہلے شعوری طور پر مسئلہ اختراع کرتا ہے، پھر اس کی ساری جدوجہد، سعی، کوششیں ان ہی ماحولیاتی غموں کے ریچھ کو گھر کی دہلیز سے بھگانے میں صرف ہوتی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ لاشعور کی توڑ پھوڑ کسی لیبارٹری میں لے جانے کا نہ تو امریکہ نے ابھی پکا عزم کیا ہے اور نہ ہی اندر کے خیال کے لئے کوئی بھرپور پلاننگ ہوسکی ہے۔

امریکہ مسئلے پر جیتا ہے۔ وہ شعوری کوشش سے مسئلے پیدا کرتا چلا جاتا ہے اور اسی مسئلے سے جینے کی طاقت حاصل کرتا ہے۔ اگر ایک مسئلے کا سلجھاؤ ہو تو کوئی دوسرا مسئلہ اس کی جگہ لے گا۔ اس موذی مسئلہ کی پنیری کبھی ختم نہیں ہوتی۔

امریکہ نے اس حقیقت کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ اگر غم کو مسئلے کی شکل میں تبدیل کر لیا جائے تو اس کا علاج ممکن ہے، اگر مسئلہ موجود نہ ہو تو انہیں زندگی روکھی پھیکی لگتی ہے۔ وہ خود مسئلہ ایجاد کرتے ہیں۔ ساری ریسرچ اس بات کی مرہون منت ہے، وہ غم کو مسئلہ بنا کر، سلجھاؤ کی طرف قدم اٹھانے کو زندگی سمجھتے ہیں۔ جونہی آنسو جنم

لے وہ مسئلے کو سمجھ کر اس کے حل کی طرف چل نکلتے ہیں۔ انہوں نے ان گنت مسائل کو لیبارٹری کی طرف دھکیل دیا ہے۔ آج کی ریسرچ کا سچ کل کے تجربات سے جھوٹ ثابت ہو سکتا ہے۔ جب نیوٹن کی تھیوری بنتی ہے، تو وہی تھیوری آئین سٹائن کے لئے دردِ سر بن جاتی ہے اور وہ اسے چیلنج بھی کر سکتا ہے۔ ساری انڈسٹری، ٹیکنالوجی غموں کا مداوا ہیں۔ مختلف قسم کے مسائل کو سلجھانے کے لئے اتنا بڑا مارکیٹ تیار ہو چکا ہے کہ اب سمجھ نہیں آسکتی کہ یہ سارا بازاری نظام علاج ہے کہ مسئلہ کا ایجاد کرنا؟ لوگوں کے دکھوں کو رفع کرنے کے لئے بازار بھرے چلے جا رہے ہیں۔ ایک چکر ہے، شے پہلے ہے کہ حصول زر؟ مسئلہ ضروری ہے کہ اس کا حل؟

عورتوں کی آزادی کا مسئلہ ہو، بوڑھے لوگوں کو دربدری اور بے عزتی سے بچانے کی مہم ہو، ملازمت میں مشغول ماؤں کے بچوں کی نگہداشت کا مسئلہ ہو، غریب ملکوں کو قرضے اور عطیات پہنچانے کا سوال ہو۔ سفید فام لوگ مسئلے کو شطرنج کا کھیل بنا کر کھیلتے ہیں اور نڈھال نہیں ہوتے۔ سائنس کے گرویدہ انسانی دکھوں کے خلاف پلاننگ میں مشغول رہتے ہیں، لیکن کسی فرد یا معاشرے سے غم کا سیاہ پرندہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت نہیں ہوتا۔ ملازمت کرنے والی عورتوں کو احساس جرم ستانے لگتا ہے۔ جب ملیریا اور ٹائیفائڈ کا علاج نکل آئے تو ایڈز، کینسر، الزائمر مسئلہ بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب گھروں سے بچے، بوڑھے دوست رشتہ دار رخصت کر دیئے جاتے ہیں تو تنہائی کا ریچھ گھر میں بسیرا کر لیتا ہے۔ جب ادویات اور وٹامنز کے استعمال سے عمر لمبی ہو جاتی ہے تو بوڑھوں کی ایسی کھیپ معاشرے کا بوجھ بن جاتی ہے، جن کے لئے نہ مرنے کی دعا کی جا سکتی ہے نہ جینے کی ...... لیکن امریکی معاشرہ مسائل کو ختم نہیں کرنا چاہتا۔ وہاں زندگی اور ترقی کا راز ان ہی شعوری کوششوں کا نتیجہ ہے۔ مشرق میں اندر کی فلاح کے لئے جو ڈیرے، مٹھ، سن ڈے سکول، زاویے، گرو، مرشد تھے ان کے علم کو ظنی سمجھ کر مشرقی اکثریت انہیں چھوڑتی چلی جا رہی ہے۔

فلاح کی راہ پر چلنے والے غم سے نپٹنے کے لئے صبر کی ڈھال استعمال کرتے ہیں۔ جہاد بالنفس کے معاملے میں اور کوئی منتر ٹونا کام میں نہیں لاتے۔ صبر کا دارو پینے والے شرم وحیا کے ساتھ اپنی تکلیفوں کو راز رکھنے کا طریقہ سیکھ کر غم کے دہکتے کوئلوں کو دم پخت کرنے کا فن سیکھ جاتے ہیں۔ یہاں غم کی بوٹی کو گھاس سے چننے کا رواج نہیں، بلکہ بغیر آکسیجن دیئے غم کو مار ڈالنے کا ہنر سکھایا جاتا ہے۔

یہ بات اہم ہے کہ ان گنت تلواریں، ڈھالیں جو ترقی کی دیوی نے ایجاد کی ہیں اور جہاں جہاں یہ فیل ہو جاتی ہے، وہاں فلاح کا دیوتا ایک صبر کی ڈھال آپ کو پکڑا کر الٹے کو سیدھا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

عموماً دیکھا گیا ہے کہ صابرین کا کہیں نہ کہیں سچا تعلق پیدا ہو جاتا ہے، پھر اسی تعلق کی برکت سے بات سننے والے، مدد کرنے والے آپ کے غم میں جھلنے والے کی موجودگی میں غم کی کاٹ نہیں رہتی۔ یہ تعلق کسی سائیکالوجسٹ، سائیکی ایٹ رسٹ سے اس لئے بھی بڑا ہوتا ہے کہ یہ ہر وقت شہ رگ کے ساتھ رہتا ہے اور انسان آہستہ آہستہ اپنا سارا بوجھ اس پر ڈالنے کا عزم کرنے کے بعد نسچت ہو جاتا ہے...... مسائل پیدا ہوتے ہیں ہوتے رہتے ہیں، لیکن علاج عموماً ایک ہی رہتا ہے...... تعلق!

میں اپنی شہ رگ والے سے کبھی تعلق پیدا نہ کر سکی۔ نہ ہی میں اقبال کے تعلق کا ذکر کسی سے کر سکا، لیکن مجھے لگتا ہے کہ اقبال نے وہی نہ تو مجھے صبر کی ڈھال ہمیشہ پہننے دی اور نہ ہی کسی بڑے آفاقی شہ رگ والے دوست کی تلاش کے لئے فارغ کیا۔

تھری چیرز فار خیال غم......

تھری چیرز فار صبر کی ڈھال......

تھری چیرز فار شہ رگ......

تھری چیرز فار شاہ رگ میں بسنے والا......

تھری چیرز فار اقبال......

خیال ہی خیال......

میں دروازہ کھولتا ہوں۔

یہ دروازہ چوروں کے ڈر سے دو تین الٹ پھیروں سے کھلتا ہے۔ آخر میں دروازے کی زنجیر اتار کر لٹکانی پڑتی ہے۔اس دوران گھنٹی دو ایک مرتبہ مزید بجتی ہے۔ ریڈووڈ کا خوبصورت دروازہ کھل کر دھوپ کا ایک لمبا تختہ اندر سفید قالین پر بچھا جاتا ہے۔ میں کمرے سے نکل کر دو سیڑھیاں نیچے اتر کر دیکھتا ہوں۔ سامنے دو انگریز صورت امریکن کھڑے ہیں۔لگتا ہے کہ ان کے آباؤاجداد بوسٹن ٹی پارٹی میں شریک ہوئے ہوں گے۔عورت اور مرد دونوں خوبصورت دراز قد تھوڑے سے جھکے جھکے بڑے خوشگوار چہروں سے مجھے صبح بخیر کہتے ہیں۔میں جواباً خوشگوار مسکراہٹ کے ساتھ انہیں خوش آمدید کہتا ہوں۔

''جی ہم اندر نہیں آنا چاہتے ......صرف کھڑے کھڑے آپ سے چند باتیں کرنا تھیں''۔

وہ عام امریکنوں کی طرح کالے آدمی سے تھوڑے سے خائف بھی ہیں اور اسی لئے اندر آنا نہیں چاہئے۔ مڈل کلاس امریکن تارکین کی مشکلات تو سمجھتا ہے اور انسانی حقوق کے پیش نظر ان تارکین کے لئے سہولتوں کا بھی خواہش مند ہے،لیکنہ وہ ایشیائی اور افریقی لوگوں سے خوفزدہ بھی ہے، کیونکہ وہ نہیں سمجھ پاتا کہ مشرقی لوگ جلد کے میلے ہونے کے ساتھ ساتھ دل کے اجلے بھی ہیں یا نہیں۔ جب انسان فرق کو سمجھ نہیں پاتا تو خوفزدہ ہو جاتا ہے۔یہی حال اس اجنبی مرد اور عورت کا بھی تھا۔

''ہم لوگ واچ ٹاور کی طرف سے آئے ہیں اور آپ کی توجہ چاہتے ہیں''۔

مجھے تھوڑی سی معلومات واچ ٹاور کی ہیں، جن کی بناء پر میں ان کو پہچانتا ہوں۔ یہ لوگ عیسائی مشنری ہیں اور عیسائیت کا پرچار کرنے کی خاطر گھر گھر پھرتے ہیں۔

''آپ اندر آجائیں ......'' میں اصرار سے کہتا ہوں۔میرے نزدیک یہ مہمان

نوازی کے منافی ہے کہ میں ان سے گھر کے باہر شارع عام پر باتیں کروں۔

''جی نہیں شکریہ۔ ہم اندر نہیں آسکتے۔ ہمارے پاس تھوڑا وقت ہے۔ کیا آپ قیامت پر یقین رکھتے ہیں؟''عورت پوچھتی ہے۔

''جی ہم مسلمان کا ایمانہے کہ روز جزا ہے۔ہم ایمان بالغیب پر پورا یقین رکھتے ہیں۔''

''آپ جانتے ہیں کہ اللہ کی بادشاہت آنے والی ہے......''

''جی ضرور......''

لڑکی نما عورت کے دانت سگریٹ کی وجہ سے دھواں سے ہیں، لیکن اس کی نیلی آنکھیں بہت شفاف ہیں۔

''ہم اپنے اعتقادات کو پھیلانے کی خاطر کچھ لٹریچر لائے ہیں۔''

میں ایسے شکنجوں میں اپنے آپ کو پھنسانا نہیں چاہتا۔ میں بقول مولانا اشرف علی تھانوی اس بات کا قائل ہوں کہ اپنا مسلک چھوڑو نہیں کسی اور کا مسلک چھیڑو نہیں۔ میں ایک اور طرح سے Secular آدمی ہوں۔میری ہچکچاہٹ دیکھ کر لمبا مرد اپنی مسکراہٹ کے ساتھ کچھ تبلیغی لٹریچر میری جانب بڑھاتا ہے۔

''یہ بالکل مفت ہیہ۔ہم واچ ٹاور والے اسے لوگوں کی فلاح کے لئے بانٹتے ہیں۔ دیکھئے آج کا انسان ایمانکی کمی کے باعث بربادی کے دہانے پر کھڑا ہے۔میں چند سال پہلے Gay تھا۔شاید آپ کو علم ہو کہ اس سال Gays کی ایک بہت بڑی ریلی ......ٹورنٹو میں ہوئی ہے۔ میں قوم لوط کا بندہ تھا، لیکن ھر ایک دن میرے ہاتھ یہ واچ ٹاور کا رسالہ آگیا اور جیسے مجھے اللہ کے بیٹے یسوع مسیح نے خود آواز دے کر لاسٹ سپر میں شامل کرلیا......میرا بپتسمہ کیا اور مجھے ایسے کر دیا جیسے نوزائیدہ بچہ......آپ؟......''

وہ ہچکچا گیا اور نہ پوچھ سکا کہ میرا مذہب کیا ہے؟

''میں مسلمانہوں اور میرا اعتقاد ہے کہ روح اللہ ایسے معجزے کرسکتے ہیں۔میرا یہ

بھی اعتقاد ہے کہ حضرت مسیح کو صلیب پر نہیں چڑھایا گیا، بلکہ انہیں زندہ اٹھایا گیا اور وہی مسیح موعود بن کر دوبارہ آئیں گے اور شریعت محمدی ﷺ کو نافذ کریں گے۔ وہ معجزے سے پیدا ہوئے اور معجزے میں ہی ان کی تکمیل ہوگی، لیکن آپ کے اعتقاد کے مطابق میں انہیں اللہ کا بیٹا نہیں سمجھ سکتا، کیونکہ میرا ایمان ہے اللہ واحد ہے۔ نہ وہ کسی سے پیدا ہو نہ اس سے کوئی جنا...... باقی میرے نزدیک روح اللہ کی قدر منزلت میں بطور نبی نہ کسی قسم کی کمی ہے نہ شک کی گنجائش......"

وہ دونوں معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور نتیجہ نکالتے ہیں کہ میں چونکہ بنیاد پرست ہوں، اس لئے عین ممکن ہے کہ میں دہشت گرد بھی ہوں۔

"میں آپ کو حضرت مسیح کی طرف دعوت دینے آئی ہوں...... میں کئی سال شلٹر میں رہی ہوں۔ میرا شوہر شراب پی کر مجھے پیٹتا تھا۔ مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دیتا تھا میں گھر سے بھاگ کر شلٹر میں چلی گئی۔ جہاں ایک روز میری کھڑکی میں اتنا اجالا ہو گیا کہ کمرہ روشنی سے بھر گیا۔ میں گھٹنوں کے بل ہو گئی۔ میرا سارا جسم پسینے میں نہا گیا...... آواز آئی تم میری بھیڑ ہو، گلے میں واپس آجاؤ...... میں نے...... صبح ہی اپنے شوہر کو فون کیا کہ میں نے اسے معاف کر دیا ہے، کیونکہ یسوع مسیح نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ پھر مجھے رابرٹ مل گیا" اس نے لمبے مرد کی طرف محبت سے دیکھا۔

میں نے مسکرا کر دونوں کا شکریہ ادا کیا اور لٹریچر کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے پمفلٹ پکڑ لئے۔

"یہ ایک کاپی رسالے کی بھی میں آپ کو دے رہی ہوں۔ اگر آپ اسے مفید سمجھیں تو آپ ہمیں فون کر دیں۔ ہم باقاعدگی سے اسے بھی آپ کو بھجوا سکتے ہیں۔"

میں نے رسالہ پکڑ کر پوچھنا چاہا کہ ان دونوں کا اب باہم کیا رشتہ ہے، لیکن میں چپ رہا۔ دیہی اور شہری آبادی میں ایک بڑا واضح فرق یہ بھی ہے کہ دیہی علاقوں کے لوگ رابطے کی زبان جانتے ہیں۔ راہ چلتے وہ ایک دوسرے کے متعلق ساری انفرمیشن

حاصل کر لیتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ لوک ریت کے سہارے قریب آ جاتے ہیں، لیکن شہری آدمی کو تخلیئے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ وقت کو درست استعمال میں لانا چاہتا ہے۔ اس کے لئے کام اہم ہے، رابطہ اہم نہیں۔ جس عہد میں انگریز کی حکومت اتنی پھیلی ہوئی تھی کہ اس کی مملکت پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا تھا، اس زمانے میں انگریز کی قوت اس بات میں مضمر تھی کہ وہ بغیر تعارف کے کسی سے گفتگو نہ کرتا۔ ٹرین، بس، پارک ایسی جگہوں میں جہاں لوگ ہوتے وہ اخبار یا کتاب کی سکرین کے پیچھے چلے جانے کا فن جانتا تھا اور فاصلوں کو قائم رکھ کر ڈسپلن کا ہوا قائم کر لیتا ہے۔

میں نے ان سے نہ پوچھا کہ کیا انکے بچے تھے۔ پیچھے سے وہ اطالوی تھے کہ آئرش ...... کیا ان کا تعلق ناروے کے Vikings کے ساتھ تھا کہ وہ فرانس کے تہذیب یافتہ لوگوں میں سے تھے۔ بغیر کسی قسم کی انفرمیشن حاصل کئے ہم ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔ میں سوچتا رہ گیا کہ کیا معلومات کے بغیر رابطے قائم کئے جا سکتے ہیں؟ میرے دل کے شیطان نے میرے کان میں کہا، شاید انکی شادی نہیں ہوئی۔ اس معاشرے میں شادی کے بغیر اکٹھے رہنے میں کوئی قباحت نہیں۔ پھر میرے نفس نے سوال کیا، کیا بغیر شادی کئے اکٹھے رہنے کے ساتھ ساتھ انسان مشنری بھی ہو سکتا ہے؟ انسان کب تک نیکی کے اندر بدی اور بدی کے بھتر نیکی کا بیج اٹھائے پھرے گا۔ اسے اپنے اندر چھپے ہوئے تضادات سے کب چھٹی ہو گی؟ انسان کیا اپنی دوئی سے رہائی پا سکتا ہے؟

تضادات میں سب سے اہم اور صدیوں پرانا انسانی پنڈولیم کو متاثر کرنے والا تضاد مذہب اور جنس ہے ...... یہاں سفر تیزی سے بھی ہوتا ہے یکلخت بھی، Matamorphosis بھی ہو سکتا ہے اور کبھی کبھی مذہب سے جنس تک انسان ایک عمر میں پہنچتا ہے۔ جب کبھی اللہ والا اندر سے پوری آگاہی، ارادے اور شعوری

کوشش سے اپنے آپ پر جنس کا دروازہ بند کرتا ہے، چوری چھپے کی آشنائی کو اپنے لئے کسی معقول یا نامعقول وجہ سے حرام سمجھ لیتا ہے تو پنڈولم مذہب کی جانب سفر کرنے لگتا ہے۔ جب عیسائی دنیا میں مذہب کا دور دورہ تھا اور جنس پر واضح اور غیر واضح پابندیاں تھیں۔ مذہب کی لطافتیں آرٹ، لٹریچر، رسم و رواج غرضیک زندگی کے تمام Ritual میں لہو رنگ بھرتی تھیں۔ جونہی مغربی دنیا نے معاشی ضروریات کے تحت، ترقی کی خاطر، پنڈولم پوری آزادی، رفتار اور پہچانکے ساتھ جنس کی طرف موڑا۔ سبھی آرٹ، لٹریچر غرضیکہ تمام فنون لطیفہ اس بات کے عینی شاہد ہیں کہ آرٹ کی روح رواں بھی اچانک جنس بن گئی۔ پوری آزادی اور بھگدڑ کے ہمراہ جنس کو پوجنے اور آخری مسیحا سمجھنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا گیا، لیکن آج کا مغربی انسان یہ بھولتا ہے کہ انسانی تضادات کے درمیان دونوں Poles کبھی بھی غیر اہم نہیں ہوسکتے۔ سفر جاری رہتا ہے۔ ایک قطب سے دوسرے قطب کی جانب کشش لازمی ہے بہت کم لوگ ایسے ہوا کرتے ہیں جو اپنے پنڈولیم کو وسط میں روک سکیں یا روکے رکھیں۔ یہ سفر ازلی ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ مذہب سے جنکی جانب ...... اور جنس سے مذہب کی طرف۔

کبھی میں گھوڑے کی نعل جیسے سپر مارکیٹ میں چلا جاتا ہوں۔ پہلے پہلے یہاں کے سپر سٹور میری دلچسپی کا باعث تھے۔ میں ضروری اور غیر روری اشیاء کی چھان پھٹک میں لگا رہتا تھا۔ مفت کوپن جمع کرتا رہا۔ ان لوگوں کے مارکیٹنگ Tactics کا شکار ہو جاتا، لیکن اب مجھے علم ہو چکا ہے کہ بازار ایسی چیزوں کی اشتہا بڑھا دیتے ہیں، جن کی نہ گھر پر جگہ ہوتی ہے نہ ضرورت، تھوڑے دن گھر پر مہمان رہ کر ان چیزوں کو یا تو جنک یارڈ میں پھینکنا پڑتا ہے یا کسی کو تحفہ دے کر جان چھڑانا پڑتی ہے۔ لوگ ٹرولیاں لے کر ایک ڈیپارٹمنٹ سے دوسرے تک چکر پر چکر لگاتے ہیں۔ عام طور پر انہیں معمولی سودا سلف خریدنا ہوتا ہے، لیکن جلد ہی ان کی ٹوکری اتنی بھر جاتی ہے کہ سامان

لڑھکنے لگتا ہے۔ امریکی لوگ تو پھر بھی ضرورت بھر خرید کر رخصت ہو جاتے ہیں، لیکن ایشیائی، مڈل ایسٹ اور چینی جاپانی کے لوگ بڑے تجسس سے سامان دیکھتے، بٹوہ پھرولتے اور لدے پھندے جاتے ہیں۔

میں عموماً دو چار معمولی چیزیں خریدنے کے بعد بازار کے باہر بنے برآمدے میں ایک کافی شاپ میں جا بیٹھتا ہوں۔ کافی شاپ والوں نے برآمدے میں بھی گول میزوں کے گرد کرسیاں لگا رکھی ہیں، جہاں بیٹھ کر کافی شناس گاہک کافی بھی پیتے ہیں اور بازارز کا جائزہ بھی لیتے رہتے ہیں۔

میں کافی کے ساتھ چیز برگر کھانے میں مشغول تھا۔ جب میری نظر کا پارک سے آگے چھوٹے سے لان پر پڑی، وہ پھر سر کو سینے میں پیوست کیے بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ چاچا صمد سے مشابہ تھا، لیکن چہرے پر ویسی بشاشت نہ تھی۔ نہ جانے کیوں نے کافی ختم کرنے کے بعد اس کی طرف رخ کیا۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں......"

ابرو اٹھا کر اس نے میرا جائزہ لیا، جیسے میں اس کی آزادی میں مخل ہوا۔

"بیٹھے......" وہ خشکی سے بولا۔

پیلی Sweat Shirt اور نیلی جینز کے اوپر اس نے ڈھیلی ڈھالی جیکٹ پہن رکھی تھی، جس کی جیب پر میراڈونا فٹ بال پلیئر کی تصویر تھی۔ بال ان دھوے، دانت میلے اور شیو بڑھی ہوئی، ہاتھوں کے ناخنوں میں چکٹ تھی۔ میں سوچ میں پڑ گیا نہ جانے یہ نوجوان کون سا نشہ کرتا ہے۔ ایل ایس ڈی کہ مری جوانا......شراب کہ ہیروئن ......اس کے بھرے چہرے پر نشئی آدمی کی مایوسی تھی۔ کچھ دیر ہم خاموش رہے۔ میں اس کی سوچ میں مخل نہ ہونا چاہتا تھا، لیکن جونہی وہ اٹھا، میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی جیکٹ پکڑ لی۔

"میں تمہارا ہم وطن ہوں، کیا مجھ سے بات نہیں کرو گے؟"

''اب باتیں ختم ہوگئی ہیں چاچا جی...... باتوں کا ای وقت ہوتا ہے۔''

جب امید ختم ہو جائے تو پھر باتوں کی ضرورت نہیں رہتی۔ انسان اپنے اندر جوگا رہ جاتا ہے''۔

میں اس کے حالات سے ناواقف تھا۔ اسی بازار میں لان پر چلتا چلاتا جوگرز جینز اور بنیان میں ملبوس وہ کبھی کبھی مجھے ملتا اور سلام کرکے آگے نکل جاتا۔ شاید وہ کسی پرانے گیراج میں کسی Basement میں غیر قانونی طور پر رہتا ہوں۔ ہوسکتا ہے غریبی کا ستایا ہوا اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر یہاں پہنچا ہو۔ شاید جوان بہنوں کی شادی، بیکار باپ کی مدد، بیمار ماں کے علاج نے اسے دیس نکالا دیا۔ جوائنٹ فیملی سسٹم کے ضبط و نظم اور ذمہ داریوں نے اسے فرار کی یہ راہ سجھائی ہو۔ اب یہاں وہ برسوں سے کسی چینی، ہندی، پاکستانی ترکی سٹور پر سامان ڈھوتے ڈھوتے تنہائی کاٹتے کاٹتے اس اداسی تک آپہنچا تھا جو اس کے چہرے پر کھنڈی تھی۔

شاید وہ بھی سوچتا رہتا ہو کہ وہ امریکہ میں کیوں ہے۔ اس سوال کے جواب میں اس کے سر میں سٹارٹ نہ ہونے والی کار کی طرح گھیں گھیں بھاں بھاں کی آوازیں اٹھتی رہتی ہیں۔ کئی یادیں غلیل کا پتھر بن کر اس کے ماتھے سے ٹکراتی ہوں اور اس میں اتنی ہمت بھی باقی نہ رہی ہو کہ وہ اپنا بچاؤ کرلے۔ شاید وہ شوق کی بلندی اور ہمتوں کی پستی کا شکار ہو۔

میں نے اس کے کندھے پر پولا سا ہاتھ رکھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ مجھے قبول کر لے گا......

''چلو میں باتیں نہیں کروں گا۔ صرف تمہارے پاس بیٹھا رہوں گا جیسے پلیٹ فارم پر دو سواریاں دیر تک ایک بنچ پر بیٹھتی رہتی ہیں''۔

اس کے چہرے پر اداس کے ساتھ ساتھ بڑی شرافت، بردباری اور حیا پھیلی ہوئی تھی۔

''اگر کوئی کام ہو تو مجھے بتادیں میں کردوں گا چاچا جی......''

''بلکہ اگر تمہیں کوئی چیز درکار ہو تو بلا تکلف مجھے بتاؤ۔ میں کوشش کروں گا تمہاری مدد کی......''میں نے خوف کے باوجود اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے مدافعت نہیں کی۔

اسے نیند کا جھونکا آیا اور وہ کسی نشئی کی طرح جھول کھا گیا۔ پھر اپنے آپ کو قابو کرتے ہوئے بولا ''آپ سمجھتے ہوں گے کہ میں نشہ کرتا ہوں......؟''

''میں نے تو ایسے نہیں سوچا''میں نے جھوٹ کہا۔

''میں ڈیپریشن کا شکار ہوں...... یہ بیماری نہیں ہے اللہ کا ایک عذاب ہے......کبھی وقتی ہوتا ہے، کبھی بار بار لوٹتا ہے، کبھی ہمہ وقتی ساتھی بن جاتا ہے۔ لوگوں پر تو اداسی کبھی کبھی نازل ہوتی ہے۔ اداسی اچھی چیز ہے چاچا جی...... اداس انسان کی شخصیت میں مٹھاس بھرتی ہے، لیکن ڈیپریشن انسان کو اپنی بے مائیگی، ناکارہ پن اور غیر اہم ہونے کا ایسا یقین دلاتا ہے کہ پھر اس کے لئے زندگی میں دلچسپی لینا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اداس آدمی احساس کمتری نہیں جاگتا اور ڈیپریشن میں سوائے احساس کمتری کے اور کوئی بات ہی نہیں ہوتی۔ یہ فرق ہے ...... میں سوچتا ہوں جب''میں اس قدر Worth Less ہوں تو جینے کا فائدہ...... میں مرنا چاہتا ہوں، لیکن ابھی تک زندہ ہوں۔ غصہ اور نفرت میرے اندر مسلسل کھولتے رہتے ہیں......''

''حوصلہ کرو......حوصلہ کرو بھائی میرے۔ یہ ان پردیس کی تنہائیوں کا اثر ہے......''

''نہیں چاچا جی! ایسے نہیں ہے۔ میں اپنے دیس کے حالات سے بھاگ کر یہاں نہیں آیا...... بلکہ اس ڈیپریشن سے بچنے کے لئے میں نے یہ راستہ اختیار کیا تھا۔ بچپن میں اپنے گھر میں جزیرے کی طرح رہتا تھا۔ ہمارے گھر میں سب کچھ تھا، لیکن جذباتی ہم آہنگی نہیں تھی...... بچپن میں ہر وقت نقصان کا احساس رہتا تھا، لیکن جذباتی ہم آہنگی نہیں تھی...... بچپن میں ہر وقت نقصان کا احساس رہتا تھا، لیکن میں اس خسارے کے احساس کو کبھی زبان نہ دے سکا۔ ایک دن ہنسنا دوسرے دن رونا...... میرے موڈ

پنڈولیم کی طرح تھے...... لیکن جوانی کے آغاز میں یہ ہنسنا بھی رونے کا ہی روپ دھار گیا''۔

''میں جانتا ہوں۔ ڈیپریشن کیا ہے۔ Hippocrates نے سب سے پہلے Melancholia کا نام لے کر ڈیپریشن کی تشریح کی تھی۔ کبھی نیند نہ آنا، کبھی نشئی کی طرح سوئے ہی رہنا۔ کبھی بہت کھانا بالکل چھوڑ دینا'' میں انسان کی بدترین عادت سے نہ بچ سکا اور اس پر یہ ظاہر کرنے لگا کہ میں اس سے بہتر جانتا ہوں۔

شکر ہے اس نے میری بات کا نوٹس نہ لیا۔ ''چاچا جی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ میں کسی چیز میں زیادہ عرصے تک دلچسپی نہیں لے سکتا۔ یہاں آ کر میں نے کوئی دس بارہ Odd Jobs کیے ہیں۔ پہلے چند دن تو میں بڑا جوش روخش ظاہر کرتا ہوں۔ پھر متنفر ہو جانا میری عادت ہے...... چلو جی کام تک تو ٹھیک ہے، لیکن میں زیادہ دیر تک کسی سے محبت بھی نہیں کر سکتا۔ میرے اندر محبت اور نفرت کا عمل چکر میں چلتا ہے۔ میں جس قدر احساس کمتری کے تحت اپنے سے نفرت کرتا ہوں، اتنا ہی میں اپنے محبوب سے بھی اپنی ذات کی نفرت کے تحت ظلم کرتا ہوں...... میں نے اپنے ماں باپ کو بڑے دکھ دیئے ہیں۔ چاچا جی سوچتا ہوں تو کانپ جاتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ ان ہی کی بدولت میری تعلیم ادھوری رہی۔ وہی مجھے ڈسپلن نہ کر سکے۔ ان کی بدولت مجھے فوکس ہونے کا موقع نہ ملا۔ میں اپنی عادات میں منظم نہ ہو سکا۔ میں ذہنی طور پر اتنا ڈیپریشن کا شکار ہو گیا۔ چاچا جی ...... کہ مجھے اپنے سوائے نہ کسی کا خیال رہا، نہ میں اپنے احساس کمتری کے باعث کسی اور کا خیال رکھ سکا......''

''ڈیپریشن بیماری نہیں ہے حالت ہے ...... یہ کبھی کبھی راتوں رات غائب جاتی ہے۔ کبھی سائیکلو تھیراپی Bsychoanalysis اور ڈرگز سے بھی کچھ فائدہ نہیں ......''

''اس لئے کہ یہ بیماری نہیں چاچا عذاب ہے...... عذاب الٰہی، آپ کو معلوم ہے کہ

یہ بیماری کیوں ہوتی ہے۔''

''کہتے ہیں کہ بچپن میں سن بلوغت میں اگر جذباتی ہم آہنگی میسر نہ آئے تو ڈیپریشن ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی اس عمر میں احساس نہیں ہوتا، لیکن بیماری کا بیج بویا جا چکا ہوتا ہے ......''

''یہ وجہ ڈاکٹر لوگ بیان کرتے ہیں، لیکن ایک وجہ مجھے اور بھی معلوم ہو گئی ہے چاچا جی وقت کے ساتھ...... تجربے کے ساتھ ...... ڈیپریشن ناشکر گزاری کی قلبی بیماری ہے...... کچھ لوگ غم سے سمجھوتہ کہتے ہیں۔ ڈیپریشن والا اپنے آپ کو غم کے سیاہ گھوڑے پر سوار نہیں ہونے دیتا۔ اس کا پاؤں رکاب میں پھنسا رہتا ہے اور وہ گھسٹتا چلا جاتا ہے، رگیدا جاتا ہے...... اور سوار اس لئے نہیں ہو پاتا کہ وہ غم کے سیاہ گھوڑے کا کبھی شکر گزار نہیں ہو پاتا۔ اسے کبھی علم ہی نہیں ہو سکتا کہ غم اس کے امکانات کو ابھارنے، اسے بہتر انسان بنانے کے لئے آیا تھا...... میری ماں تو جلد فوت ہو گئی تھی، لیکن میں نے اپنے باپ کو بڑے دکھ دیئے چاچا جی...... اولاد کو جو آزمائش کہا گیا ہے تو اس کی ایک ہی وجہ ہے۔ وہ والدین کی شکر گزاری نہیں ہوتی ...... وہ والدین کی ساری محنتوں، قربانیوں، انتظاروں کا صلہ ناشکر گزار ہو کر دیتی ہے......''

''چلو چل کر کافی پیتے ہیں آؤ چلو...... یوں اپنے دل پر بوجھ ڈالنے سے حاصل؟ کبھی ماضی کو پھرولتے رہنے سے بھی کچھ ملا......''

''شاید مل جائے کوئی سبق...... کوئی راستہ...... چاچا جی میرے باپ نے بڑی محنت کر کے فیروز پور روڈ پر ایک پلازہ بنایا تھا۔ ہم لوگ اچھرہ میں رہتے تھے۔ میرے باپ کا اتنا بڑا دل تھا کہ ہمارا گھر شہد کے چھتے کی طرح بھنبھناتا رہتا۔ گاؤں سے مقدمے لڑنے والے دیہاتی رشتہ دار...... بیوہ غریب عورتیں ...... تعلیم کے سلسلے میں ٹھہرے ہوئے نوجوان، شادی کی تیاری کرنیوالی شاپنگ شاپنگ پکارنے والی لڑکیاں ...... اقرباء کا ایک ہجوم پلتا تھا ہمارے تین منزلہ مکان میں...... جب دوسری

بار بی اے میں میری کمپارٹ آئی تو میں ڈیپریشن کے شدید دورے سے گزرا۔ کئی مرتبہ تو میں اپنے مستقبل، اپنی ذات، اپنے حالات سے اس درجہ مایوس ہو جاتا کہ مجھے اپنی زندگی مکمل طور پر بیکار لگتی۔ میں سنجیدگی کے ساتھ خودکشی کے متعلق سوچتا رہتا۔ کبھی ٹرین کے نیچے آنے کا منصوبہ، کبھی زہر کھا لینے کا تصور...... کبھی مینار پاکستان سے چھلانگ لگانے کی خواہش سوچتے جاگتے میرا تعاقب کرتی...... چاچا جی جانتے ہیں روز ازل اللہ اور ابلیس کے درمیانکیا معاہدہ ہوا تھا...... اللہ نے ابلیس کو قیامت تک کس چیز کی مہلت دی تھی......''

مجھے اس نوجوان میں بڑی کشش محسوس ہوئی۔ وہ بڑا ذہین، جان دار اور سوچنے والا جوان تھا جو اپنے متعدد سوالوں کے بدلے صرف ایک شافی جواب کی تلاش میں تھا۔

''میں وہاں موجود نہیں تھا۔ میرے بیٹے...... بائی دی وے تمہارا نام کیا ہے......''

''میرے جیسے روندے ہوئے پامال لوگوں کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ ہم عمارتوں کا ملبہ ہوتے ہیں۔ نہروں میں نیچے بیٹھ رہنے والا گارا ہوتے ہیں۔ ہم سڑکوں پر اڑنے والے پلاسٹک کے وہ لفافے ہوتے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور جو کوئی چیز سنبھالنے کے کام نہیں آتے...... آپ مجھے مسٹر جنک پکار لیا کریں چاچا جی......''

''تم تو کارنیشن کا پھول ہو بھائی میاں...... خوبصورت اور خوشبودار۔ میں تمہیں مسٹر جنک کیسے پکار سکتا ہوں؟''

''جو شخص اللہ کی رحمت سے مایوس ہو وہ بیکار نہیں تو اور کیا ہے؟ آپ جانتے ہیں انسان کو مایوس کون کرتا ہے اور کیسے کرتا ہے......''

''ناں بھائی میرے ایسی گہری باتیں نہیں سوچا کرتا میں......''

مسٹر جنک نے کہا...... ''سنیے چاچا جی! جب ابلیس نے حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تو ابلیس نے دعویٰ کیا کہ وہ انسان کو بہکائے گا اور اسے اللہ کی رحمت سے مایوس کرے گا۔ باری تعالیٰ نے ابلیس کو روز قیامت تک مہلت دی...... ابلیس نے

دعویٰ کیا کہ وہ انسان کو اغواء کرنے میں کامیاب ہو گا......''

میں نے ہنس کر کہا...... ''بھائی میرے اللہ کے سامنے کیسا دعویٰ۔ یہ تو بھول تھی ابلیس کی۔

''آپ جانتے ہیں چاچا جی! ابلیس کا دعویٰ بے بنیاد نہیں تھا۔ وہ اماں حوا کو بہکانے میں کامیاب رہا...... پتہ ہے ابلیس کیا کرتا ہے...... اس کی کارروائی کا کیا طریقہ ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

''چاچا جی! ابلیس انسانکے نفس سے ساز باز کرتا ہے۔ نفس میں امنگ، خواہش، ضرورت کو جگاتا ہے۔ جس قدر خواہش ناممکن ہو گی، اسی قدر ابلیس اسے عین ممکن کر کے دکھائے گا۔ نفس اس قدر غالب آ جائے گا کہ وہ پورے انسان کو بڑے کنویں جھنکوائے گا۔ کبھی پیروں، فقیروں کے پیچھے، کبھی مزاروں کے طواف، کبھی اللہ کی حضوری میں انسان اپنی خواہش کی عرضی ڈالے گا، جوں جوں خواہش کے پورا ہونے کے امکانات کم ہوتے ہیں، انسان اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتا جائے گا...... دولت کی ہوس، نام و نمود کی خواہش، عورت کا آزاد، ایک کارخانہ کھلا ہے نفس کے اندر...... وہ امید دلا دلا کر...... کوشش پر آمادہ کر کے خواہش کے جال میں جکڑ کر انسان کو اللہ کی رحمت سے مایوس کرتا ہے...... اور جونہی انسان اللہ سے مایوس ہونے لگتا ہے۔ ابلیس اغواء کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پتہ نہیں انسان کے قلب پر کیا گزرتی ہے ایسے میں''۔

''بھائی تو مجھ سے بڑی پڑھی لکھی باتیں کر رہا ہے...... میں ٹوٹا پھوٹا شاعر ضرور ہوں، لیکن میں نے کبھی ایسی باتیں نہیں سوچیں...... میں تو ساری عمر میں بزنس کی ایک معمولی ریپئر شاپ سے چل کر امپورٹ ایکسپورٹ کے کام تک پہنچا ہوں۔ فریج، ایئر کنڈیشنر، الیکٹرک سامان امپورٹ کیا کرتا تھا میں...... جب سے میرے

دونوں بچے امریکہ آ گئے، اس کام کی بھی چنداں ضرورت نہیں رہی تھی......''

وہ عام ڈیپریشن کے مریض کی طرح میری بات نہیں سن رہا تھا۔ یقیناً وہ اپنے ہی اندر کہیں گھمن گھیریاں کھا رہا تھا۔

''جب انسان اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتا ہے، امید مرجھانے لگتی ہے تو چاچا جی انسان کے اندر پہلے تو کھلبلی مچتی ہے، پھر وہ حدیث نفس کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسے میں وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ اس کا نفس اور وہ خود مکالمہ کرتے رہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ان لوگوں کے خلاف باتیں دل میں ابلنے لگتی ہیں۔ جن سے وہ محبت کا اعتراف کیا کرتا ہے، ہولے ہولے جب حدیث نفس پختہ ہو جاتی ہے، تلاوت الوجود کی عادت پڑ جاتی ہے تو اللہ کے برگزیدہ لوگوں کے خلاف بھی نعوذ باللہ منفی باتیں سوچنے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر زیادہ وقت گزر جائے تو اندر سے طعنے، گالیاں، منفی سوچ کی بوچھاڑ اللہ پر ہونے لگتی ہے۔ جس نے اس کی خواہش پوری نہ کی اور اسے مایوسی کے حوالے کر دیا۔ عام انسان کے دل میں بھی محبت اور نفرت کا جذبہ بیک وقت کسی شخص کے لئے موجزن ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ وہ نارمل ہونے کی وجہ سے نفرت پر قابو پا لیتا ہے، لیکن ڈیپریشن والے کی مایوسی اسے محبت کرنے ہی نہیں دیتی۔ میرے باپ نے میرے لئے اتنا کیا...... اتنا کیا میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں انجینئر بنوں...... پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ میں ذہین تھا، لیکن میں نے باپ سے نفرت کی وجہ سے پڑھائی کی طرف توجہ نہ دی۔ میرا نفس مجھے اس بات پر آمادہ رکھتا کہ میں بغیر پڑھے فسٹ ڈویژن حاصل کر سکتا ہوں۔ میں معجزے کا منتظر تھا...... دوبار جب میری انگریزی میں کمپارٹ آئی تو میں نے اس شکست کا سارا بوجھ الزام کی شکل میں اپنے باپ پر ڈال دیا...... مجھے جو احساس جرم ستاتا، میں اس کی وجہ اپنے باپ کو سمجھتا۔ میں اسے طعنے اور کچوکے لگاتا کہ اس نے ہرایرے غیرے نتھو خیرے کی مدد کی اور میری جانب سے بے توجہی برتی...... اماں تو خیر بہت پہلے فوت ہو گئی تھیں، ورنہ

میں انہیں خود اپنے ہاتھوں قتل کرڈالتا۔ میں ناکامی، منفی سوچ، احساس جرم اور محرومی کو اپنے والدین کے سر تھوپتا رہتا...... میرا خیال تھا کہ ان دونوں نے گھر کو ہوٹل میں تبدیل کر کے اپنی ذمہ داری نہ نبھائی تھی۔ ان پر سارا الزام ڈالنے کی وجہ سے Catharsis تو ہو جاتا لیکن حدیث نفس کم نہ ہوتی۔"

"ہو جاتا ہے...... ہو جاتا ہے انسان کی زندگی ہو جانے کی ہی تو منتظر رہتی ہے......"

"چاچا جی...... پھر ایک واقعہ ہو گیا۔ میرا ایک دوست امریکہ چلا آیا۔ اس کا نام لاٹری میں نکل آیا تھا۔ جونہی وحید امریکہ پہنچا، اس نے مجھے اکسانا شروع کر دیا کہ یہ مواقع کا ملک ہے۔ کسی ایجنسی سے امیگریشن کا چکر چلا کر فوراً پہنچو...... میں نے بڑی تگ و دو کی۔ میرے باپ نے چار پانچ لاکھ روپیہ مجھے دیا۔ میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس کا شکر گزار نہ ہوا...... امریکہ پہنچا تو کچھ دیر تو وحید نے اعانت کی، لیکن یہاں کسی کی بیساکھی بننے کا رواج نہیں۔ میں نے لاہور میں کبھی غریبی کا مزہ نہ چکھا تھا، آرام دہ زندگی کا عادی تھا...... یہاں آکر پتہ چلا کہ جو میری Face Value ہے وہی چلے گی، دس کا نوٹ ہزار کی کرنسی شمار نہیں ہوتا...... یہاں آکر حدیث نفس پہلے سے زیادہ ہو گئی...... سٹوروں پر کام کیا، پٹرول پمپ پر گاڑیوں میں پٹرول بھرے...... دو تین ہوٹلوں میں بیرا گیری کی...... ٹیکسی چلائی، لیکن کبھی باپ سے رابطہ نہ کیا...... میں نے اپنے متعلق جس احساس کمتری کو اندر پال رکھا تھا۔ ہر پرانے کام کو چھوتے وقت نئے کام کو حاصل کرتے ہوئے اس کی تصدیق ہوتی رہی۔ میں اپنے آپ سے کہتا یہی تیری اوقات ہے۔ وحید اس دوران سوفٹ ویئر کی دکان بنا چکا ہے، میں اس کے دائرہ احباب میں نہیں ہوں۔ اس بات کا بھی دل کو رنج رہتا ہے، کیونکہ لاہور میں وہ ہمارے کوٹھے پر مجھ سے مانگ مانگ کر پتنگیں اڑایا کرتا تھا۔ اب میری بس ہو گئی ہے۔ چاچا جی اب میں اور زیادہ نہیں لے سکتا...... وطن کی مٹی مجھے راس نہیں آئی اور امریکہ کی ہواؤں میں اڑنا میرے لئے ممکن نہیں...... آپ نے پوچھا تو بتا دیا ورنہ...... اب تو

مجھے کسی سے بات کیے بھی ہفتے گزر جاتے ہیں۔''

''پیارے بیٹے جہاں تک تمہاری باتوں سے میں اندازہ لگا سکا ہوں...... یہ تمہاری بیماری نہیں، صرف قلب کی حالت کا بیان ہے اور قلب کچھ بیماریوں کا شکار ہوا کرتا ہے۔ شرک، ناشکر گزاری اور تکبیر، بلکہ یوں سمجھو تکبر ہی ناشکر گزاری کو جنم دیتا ہے۔ اگر ترقی والوں کی مدد سے اس کا علاج کرو گیتو گولیاں پھانکو گے۔ کبھی سائیکو Psychoalysis کراؤ گے، کبھی سائیکو تھریسٹ کے پاس جاؤ گے۔''

''جاتا رہتا ہوں جی......''

''ایک علاج فلاح والوں کا بھی آزما دیکھو...... اپنے قلب کو ذکر اللہ کے حوالے کرو...... اللہ کے ذکر کے علاوہ اطمینان قلب ممکن نہیں......''

''حدیث نفس ختم ہو جائے گی۔ میرے اندر کی منفی سوچیں جنہوں نے مجھے پاگل کر دیا، ہے کیا کیا کیا۔ یہ میرا پیچھا چھوڑ دیں گی؟'' مسٹر جنک نے سوال کیا۔

یہاں اسلامک سنٹر میں نائیجریا کے ایک صوفی جمعرات کی شام کو ذکر کی محفل گرم کراتے ہیں۔ پاس انفاس سکھاتے ...... وہاں پہنچ جانا......

''آپ وہاں جاتے ہیں چاچا جی۔''

''ہاں کبھی کبھار...... لیکن تم ضرور جانا...... تمہیں فلاحی ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔''

وہ اٹھ کھڑا ہوا...... میں نیاس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبایا اور آہستہ سے پوچھا ''اپنے چاچا جی کو نام نہیں بتاؤ گے اپنا......''

اس کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لئے امید کی چمک آئی۔

''احمد...... پتہ نہیں یہ نام میرے گدھے باپ نے کیوں رکھ دیا؟''

گز بو کی جانب چلتے ہوئے مجھے اس آدمی کی کہانی یاد آئی جو ہمیشہ نفع کا عادی رہا اور کبھی نقصان کے راستے پر نہ چلا۔ ایک دنیا دار ہمہ وقت پریشان رہا کرتا تھا۔ طمانیت قلب اس سے کوسوں دور تھی۔ راحت اور عافیت کو ترستا رہتا۔ ایک روز صبح دم اٹھا تو

دل میں خیال گزرا کہ اگر میرے مسائل طے ہو جائیں اور میں اطمینان قلب کو پہنچوں تو میں اپنا محل نما گھر بیچ دوں گا اور اس سے جو حاصل ہوگا وہ راہ مولیٰ خیرات کر دوں گا...... کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ اس کے مسائل ختم ہو گئے اور وہ چین سے سونے لگا۔ اب قسم یاد آئی، لیکن دل میں معاً حرص جاگی۔ اس نے سوچا محل بیچ کر جو خطیر رقم حاصل ہوگی، وہ تو غربا میں تقسیم کرنا حماقت ہوگی۔ معاً اس نے اپنے بچاؤ کے لئے ترکیب سوچی۔ گھر کے آگے سیل کا جو بورڈ لگایا۔ اس پر رقم کیا کہ یہ گھر ایک روپے میں قابل فروخت ہے، لیکن اس کے ساتھ ایک بلی بھی خریدنا ہوگی جو اس گھر کی مکین ہے۔ بلی کی قیمت علیحدہ بتائی جائے گی۔

ایک گاہک نے مکان اور بلی کو اس طرح خریدا کہ حویلی کا دام تو ایک روپیہ تھا، لیکن اس میں بسنے والی بلی کی قیمت ایک لاکھ روپیہ تھی۔ مکان سے حاصل ہونے والا روپیہ تو مالک مکان نے خیرات کر دیا اور بلی سے حاصل شدہ رقم چونکہ وعدے میں شامل نہ تھی، اس لئے اسے اپنے لئے مختص کر لیا...... سنا ہے کچھ دیر بعد وہ پھر راتوں کو جاگنے لگا اور راحت، عافیت، اطمینان اس سے کوسوں دور ہو گئے...... ہمیشہ اپنے فائدے کے متعلق سوچتے رہنے والوں کا انجام ان کے فیصلوں میں چھپا رہتا ہے...... وہ نفع کے عادی ہونے کے باعث فلاح کو پا نہیں سکتے۔

میں پھر اپنی پرانی سوچ کی طرف لوٹتا ہوں۔

اگر آپ غور سے امریکی معاشرے کا جائزہ لیں تو آپ بھی غالباً اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ امریکی معاشرہ اینٹی کرائسٹ نہیں ہے۔ جہاں تک مذہبی رسوم پرستی کا تعلق ہے، وہ ابھی بھی پورے زور و شور سے کرسمس اور ایسٹر مناتے ہیں۔ اربوں ڈالروں کی تجارت کرسمس کے تہوار سے وابستہ ہے، لیکن وہ اندر سے حضرت عیسیٰ کو نہیں ان کی تعلیم کو رد کر چکے ہیں۔ ان کے لئے محبت کا مفہوم ڈالر کی آندھی میں خس و خاشاک کی طرح کھو ہو گیا ہے۔ اب امریکی معاشرہ اینٹی کرائسٹ نہیں، اینٹی لو معاشرہ ہے۔ جس

طرح مسلمانوں نیا پنے معاشروں سے اسلام کے بنیادی تصور عدل کو نکال پھینکا ہے۔کسی بھی اسلامی ملک میں کہیں بھی مساوات پریکٹس نہیں کی جاتی۔ایسے ہی امریکی اب پرسنل محبت کی جگہ یونیورسل ہمدردی کے گاہک ہے۔عیسائیت کی یہ روح تھی کہ کوئی تمہارے ایک گال پرتھپڑ مارے تو اسے دوسری گال پیش کر دو۔اپنے ہمسائے سے ایسی محبت کروجیسی تم اپنے آپ سے کرتے ہوا پنے نیگرو ہمسائے پر Peoples Court میں یہ مقدمہ دائر نہ کرو کہ وہ گھاس نہیں کاٹتا اور آپ کے گھر کی قیمت نہیں بڑھ سکتی۔بس وہ آپ کا ہمسایہ ہے اور ہمسائے سے محبت عیسائیت کا جوہر ہے۔

یہاں ایک مغالطہ پیدا ہوسکتا ہے کہ شاید امریکی معاشرہ کسی چالاکی سے براؤن، سیاہ، چپٹی ناک والے اور دوسرے نسلی اختلافات رکھنے والوں سے فاصلہ قائم رکھتا ہے۔اس مغالطے سے بھی نکلنے کی ضرورت ہے۔یہاں آپ کو اللہ ترس، ہمدرد لوگوں کی بھی ایسی کھیپ ملے گی جو بے شمار رفاہی کاموں میں مشغول ہیں اور اپنی آمنی کا معتد بہ حصہ خیراتی کاموں میں لگاتے ہیں،لیکن یہ ہمدردی کا جذبہ محبت نوع کی چیز سے ذرامختلف ہے۔سفید فام لوگوں کا امریکی معاشرہ Impersonal ہمدردی کرتا ہے۔وہ جذباتی طور پر ایسے کاموں میں مبتلا نہیں ہوتا جو اس کے دل پر دستک دیں اور اسے غم آشنا زندگی کے حوالے کردیں۔سفید فام لوگ فیصلہ کر چکے ہیں کہ غیر شخصی ہمدردی تو مصروف زندگی کے ساتھ،متعصب خیالات کے ساتھ ساتھ ممکن ہے، لیکن پڑوسی سے ویسی ہی محبت کرنا جیسی اپنی ذات سے ہوترقی کے راستے پر ممکن نہیں، کیونکہ ترقی کام کی پجاری ہے،انسان کی متلاشی نہیں۔

کام کے لئے سب سے بڑی اہمیت وقت کی ہ۔کام کرآدمی وقت ضائع نہیں کرسکتا اورانسان کی کھوج کسی نئے برصغیر کوتلاش کرنے کے برابر ہے۔تلاش میں وقت ضائع ہواہی کرتا ہے،چونکہ کوئی انسان بھی وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔اس لئے اپنے سے کم

تر لوگوں کو Human Rights تو دیئے جا سکتے ہیں، ان سے محبت نہیں کی جاسکتی۔ اپنے سے احقر محبت کے قابل نہیں ٹھہرتا ...... اسی مشکل نے امریکی معاشرے میں ایک خاص قسم کی ٹیڑھ پیدا کر دی ہے۔ پرائیویسی، فاصلے اور رشتوں کی زبوں حالی کو جنم دیا ہے۔

سانده سے نکل کر ہم نے ٹمپل روڈ پر ایک مکان ذرا سا اندر کی جانب الاٹ کرا لیا تھا۔ یہاں ہی پہنچ کر دادی کو شوگر کا عارضہ ہوا اور اباجی ہم سے رخصت ہو گئے۔ شاہد بھائی نے ہال روڈ پر بہت پہلے ایک دکان میں ریپئر کا کام شروع کر دیا۔ شاہد بھائی جز وقتی شاعر تو تھے، لیکنشادی کے بعد ہمہ وقت سیدھے سادے مستری بن گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی پتہ نہیں کیسے اور کیوں میں بھی شاعری کرنے لگا۔ شاہد بھائی کا اصرار تھا کہ میں بی اے کرنے کے بعد ان کے ساتھ دوکان پر بیٹھوں اور ٹانکے لگانے اور مرمت کرنے کا علم سیکھوں۔

ان دنوں آپا کی شادی تھی اور اس کی تیاریوں میں ان کی من چاہی سہیلی اقبال ہمارے گھر آیا کرتی تھی۔ اقبال جیل روڈ پر رہتی تھی اور اس کی سفید مورس کا ہم پر بہت رعب تھا۔

اقبال کا رنگ بھی ایسا تھا کہ کبھی امریکن لگتی کبھی ہسپانوی......کبھی اس کے گال سرخا سرخ ہوتے، کبھی زرد خوبانی جیسے۔ اس کے جسم میں لہروں والے ہلکورے پنہاں تھے جب بھی چلتی یوں لگتا انسان نہیں پانی کی لہر ہے...... میں اپنے ساحل کو اس لہر کے ٹکراؤ سے بچانا چاہتا تھا، لیکن آپا کی شادی ایک مرحلہ وار عمل تھا۔ اقبال اور آپا قریباً روز سفید مارس پر انارکلی جاتیں۔ پھر کسیرے بازار سے برتن آتے۔ زیورات کی جانچ پڑتال کے لئے ڈبی بازار بھی جانا پڑتا۔ اقبال عمر میں آپا سے بہت چھوٹی تھی۔ پھر بھی دوستی جاری تھی اور اس کی لپیٹ میں شاہد بھائی اور میں دونوں آئے ہوئے تھے۔ اس روز وہ کھڑکی میں بیٹھی ٹانگیں جھلا رہی تھیں۔ آپا غسل خانے میں تھیں۔ باہر

املتاس کے درخت پر کوئل کوک رہی تھی۔ میں اپنی غزل سنانے کے لئے آپیا کے پاس پہنچا۔ ان دنوں میں شاہد بھائی کا نقل چو تھا۔ جو کچھ میرے اس رورل ماڈل کو کرنا ہوتا مجھ پر حکم ہو جاتا تھا۔

آپیا کہاں ہیں۔ میں نے سوال کیا۔

ابھی نہانے گئی ہیں۔ اقبال نے جواب دیا۔

اچھا...... میں چلتا ہوں۔

بیٹھ جائیے۔ نکلنے والی ہیں۔

میں انہیں اپنی غزل سنانے آیا تھا۔

وہ کھڑکی کی سل سے اتر آئی۔ بلی کی سی سبک پائی کے ساتھ

مجھے سنانا پسند کریں گے اپنی غزل......

اس زمانے میں ایکٹرس راگنی کی آنکھوں کا بڑا چرچا تھا۔ اقبال کی بڑی بڑی غزالی آنکھوں کے پپوٹے بھی ویسے ہی بھاری تھے اور ان میں جھلکنے والی روح ہزار پردے میں رہتی تھی۔

وہ میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اب مجھے غزل سنانا مشکل ہو گیا۔ قافیے سامنے لکھ کر غزل بنانے کا عمل آورد ی تھا۔ ایسی جوڑ توڑ والی غزل اس غزال کو سناتے ہوئے شرم سی محسوس ہوئی۔

سنائیے ناں۔

کیا سناؤں جی معمولی سی کوشش ہے۔

کیوں کسر نفسی سے کام لے رہے ہیں؟ مجھے آپیا نے پہلے آپ کی نظم سنائی تھی۔

کون سی نظم۔

جلترنگ...... اقبال نے مسکرا کر کہا۔ اچھی نظم تھی۔ غزل سنائیے ناں۔

میں نے مطلع پڑھا تو غسل خانے کا دروازہ کھلا۔ آپیا بالوں کو تولیے میں لپیٹے ننھی

بوندوں کو چہرے پر سجائے برآمد ہوئی۔

ہاں ہمایوں؟

رفعت آپیا یہ آپ کو اپنی غزل سنانے آئے ہیں۔

ہاں تو سناؤ ناں ہمایوں۔

میں نے پھر مطلع پڑھا تو دونوں نے بڑی دادی دی۔ میں اقبال کو فاصلے سے دیکھتا رہا۔ وہ مالی طور پر ہم سے بہتر تھی اور اس کا چلنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا ظاہر کرتا تھا کہ وہ افسر کلاس میں بڑھی پلی تھی۔ دوکانداروں، چھوٹے تاجروں، کلرکوں، کارندوں سے اسے دور کا بھی واسطہ تھا۔ وہ سرکاری افسروں کے کلچر کی آئینہ دار تھی۔

میں نے ساری غزل لہک کر ترنم کے ساتھ سنائی اور بعد میں اس بات پر خود حیران رہگیا کہ اتنی بڑی شہزادی کے حضور میں نے اتنی جرات کیسے کی؟

جتنی دیر میں غزل سناتا رہا، وہ دونوں چپ چاپ بیٹھی سنتی رہیں۔ پھر اپنی باتوں میں مشغول ہوگئیں۔ کچھ دیر میں سمجھ نہ پایا کہ مجھے بیٹھے رہنا چاہئے کہ چلے جانے میں بہتری ہے۔ کپڑے لتے گوٹے کناری میک اپ کے سامان میں وہ اس قدر کھوچکی تھیں کہ انہیں بھول گیا، کوئی ان کی تعریفی بارش کا منتظر ہے۔

گرمیاں کچھ تیزی دکھا رہی تھیں۔ رات کے قوت ہم بہن بھائی گھر کے دالان میں چارپائیاں بچھا کر پیڈسٹل فین کی ہوا میں سوتے تھے۔ ہر ایک کی کوشش ہوتی کہ اس کی چارپائی عین پنکھے کے سامنے ہو۔ امی ابو اندر ہی سوتے تھے۔ اندر والے پنکھے کے بیرنگ خراب تھے۔ ساری رات اس سیلنگ فین کی گھر رگھر رگھپ......گھر رگھر رگھپ سنائی دیتی، چونکہ آپیا کی شادی قریب تھی۔ اس لئے اس نے ہر معاملے میں اپنے خصوصی حقوق کو منوانا شروع کر دیا تھا۔ ایسے ہی جگے ٹیکس میں اس کی چارپائی پڈسٹل فین کے سامنے پہلی ہوتی۔ دن بھر یہ چارپائیاں اور فین آنگن میں پڑے رہتے۔

سہ پہر کا وقت تھا۔

میں چارپائیوں کی لمبی قطار میں آپیا کی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ نہ جانے باقی سب کہاں تھے کہ اپنی سفید مورس میں اقبال آگئی۔ اس کے آنے سے پہلے میں نے اس کی اونچی ایڑی کی ٹک ٹک سن لی تھی۔ اس آواز نے میرے دل میں خلل امن پیدا کر دیا۔ شاید اسی لئے ایڑیوں کو یوں ٹھونک ٹھانک کر چلنا منع تھا۔

وہ میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ میں نے خوفزدہ کبوتر کی طرح آنکھیں چرانے میں عافیت سمجھی اور پیڈسٹل فین پر نظریں جمادیں۔

السلام علیکم جی

اس جی میں پورے سات سر تھے۔

وعلیکم السلام

میں نے جواب دیتے وقت اس کی جانب دیکھا۔ اس نے فٹ قمیص پہن رکھی تھی، جس کے بازو جالی سے بنے تھے اور سڈول بازو سفید سنگ مرمر سے تراشیدہ نظر آتے تھے۔ کندھوں پر چنٹ کیا ہوا دوپٹہ موٹے رسے کی طرح لاپرواہی سے پڑا تھا۔ سینڈل سفید پلاسٹک کی تھی جو شیشے کی طرح شفاف تھی۔ کبوتری کے پاؤں اس موتی جڑے سینڈل میں اور بھی سڈول ہوگئے تھے۔

تمہیں پتہ ہے بغیر لائسنس کے اسلحہ لے کر شہر میں پھرنا ممنوع ہے۔

موٹی موٹی آنکھوں پر بار بار پپوٹے پھڑ کا کر اس نے پوچھا۔

جی...... میں سمجھی نہیں۔

تھری ناٹ تھری کا لائسنس لینا پڑتا ہے، ورنہ خلل امن کے تحت گرفتار کیا جاسکتا ہے۔

آپ اتنی مشکل باتیں اور ایسے ثقیل الفاظ کیوں استعمال کرتے ہیں۔

اس لئے مس اقبال میرا دادا مدرس تھا۔ وہاں گاؤں میں ہمارے گھر میں دادا جی کی پوری لائبریری تھی۔ ہم سارے بہن بھائی ان کتابوں کی ورق گردانی کرتے رہتے

تھے۔ کچھ حصہ کتابوں کا تو ابا ساتھ بھی لے آئے تھے۔

شاید وہ میرا اشارہ سمجھ چکی تھی، پر تجاہل عارفانہ کی کٹاری استعمال کرتے ہوئے اقبال بولی۔ وہ ابھی آپ ہتھیاروں کی بات کر رہے تھے۔ میں سمجھی نہیں۔

آپ کو اپنی تلوار نیام میں رکھنی چاہئے۔ کچھ پبلک نہتی اور خوفزدہ ہوتی ہے۔ ایویں فساد پھیلتا ہے۔

میں کیا کروں؟

یا تو آپ کھدر کا کھلا چولا پہنیں یا پھر برقعے سلوائیں اور کچھ نہیں تو چادر میں لپٹی لپٹائی آیا کریں ورنہ تو معصوم لوگوں کا بہت نقصان ہوگا...... ویسے تو آپ کو ہاتھوں پر بھی دستانے اور پیروں میں بھی جرابیں پہننی چاہیں۔ میں نے شرارت سے کہا۔

میں آپ کو بتاؤں ...... کہ معصوم لوگوں کو چاہئے کہ وہ نگاہیں نیچی رکھیں اور ایک نظر غلط کے بعد گھورنے پر مائل نہ ہوں۔

واہ واہ...... اب تو آپ بھی اردو میڈیم کی پڑھی ہوئی لگتی ہیں۔ ذرا بھی مشنری سکول کی پڑھی ہوئی معلوم نہیں پڑتیں۔

صحبت کا اثر ہے۔

کس کی؟

وہ مسکرائی اور خوش دلی سے بولی آپیا کی اور کس کی۔

جب آپیا کی شادی ہوگی تو پھر آپ آیا کریں گی۔ ادھر ٹمپل روڈ۔

لیں خواہ مخواہ...... پھر یہاں آ کر کیا کرنا ہے۔

کرنا تو کچھ نہیں پر آتے جاتے رہنا ہے۔

وہ ہنس دی۔

اس کی ہنسی میں کچھ چھوت کے جراثیم تھے۔ میں بھی ہنسنے لگا۔ ہماری ہنسی کے جلترنگ کو سن کر میرے دونوں چھوٹے بہنبھائی آ گئے۔ نہ جانے وہ اس سے پہلے کہاں

تھے۔فریدہ اور ظفر کی آمد مجھے ناگوار گزری، لیکن ان کا آنا ہی اقبال کے قیام کا باعث بنا۔

آپیا کہاں ہے۔

آپیا تو امی کے ساتھ ڈبی بازار گئی ہیں۔

اقبال نے ہاتھ اٹھا کر ماتھے کو چھوا۔آپیا سے کہا بھی تھا کہ مجھے ذرا دیر ہو جائے گی ذرا رک جاتیں تو کار پر چلے جاتے......اس کی آواز میں عجیب سا تاسف تھا۔

ان دنوں ہمارے پاس کار نہیں تھی اور سفید مورس ہم سب کے نزدیک امیری کی انتہا تھی۔ڈرائیور والی کار تو ویسے بھی لاہور کی سڑکوں پر کم کم دکھائی دیتی تھیں۔

الھڑ فریدہ کو ان دنوں لوڈو کھیلنے کا خبط تھا۔وہ دو چوٹیاں کر کے اپنے آپ کو مرلین منرو سمجھتی تھی۔

آپ لوڈو کھیلیں گی باجی اقبال۔

کیرم کھیلیں باجی؟ دسویں کے نوجوان ظفر نے سوال کیا۔

تب کلچرڈ ظاہر کرنے کے لئے ان ڈور گیمز بھی وصف شمار ہوتی تھیں۔ابھی ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ نے ٹیک اوور نہیں کیا تھا۔وقت کو گزارنے کے تفریحی مشاغل سادہ تھے۔

نہیں بھئی مجھے دیر ہوتی ہے۔

میں یکدم جھلس گیا۔

اور وہ جو آپ ڈبی بازار میں آپیا کے ساتھ گھنٹوں صرف کرتیں ہیں تب دیر نہیں ہوتی ......میں چڑ کر بولا۔

چلو لوڈو ہی۔

فریدہ اور مجھے پارٹنر بنا کر ظفر کے ساتھ اقبال لوڈو کی بازی پر بازی جیتتی چلی گئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب بہنوں کی سہیلیوں کے ساتھ کیرم، لوڈو یا تاش کھیلنے پر اعتراض تو

تھا، لیکن والدین چپ رہا کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد ایک عجیب رنگ سوسائٹی تشکیل پا رہی تھی۔ لوگ باگ اپنے خاندانوں سے کٹ کر اجنبی لوگوں سے ملنے پر مجبور تھے۔ اکادکان شادیاں خاندان سے باہر ہونے لگیں تھیں۔ اونچی جاتی کے لوگ جیسے خطرہ محسوس کر رہے تھے اور ان کی ٹولیاں آپس میں بیٹھ کر شیخیاں بگھارنے، ماضی کو یاد کرنے اور اپنے آپ کو افضل سمجھنے میں وقت گزارا کرتے تھے۔ شیخی اور پدرم سلطان بود دراصل خوف کے باعث پیدا ہوا تھا۔ کہیں اندر ہی اندر یہ اونچی ذات والے اپنی سالمیت کو Threatened سمجھنے لگے تھے۔ انہیں احساس تھا کہ مختلف النوع قسم کی آبادی ان کی قلعے بند روایات کو توڑنے کی طاقت رکھتی ہے۔ ایسے لوگوں کی اولاد تعلیم کی خاطر نئے میل جول اختیار کرنے پر مجبور تھی۔ لمبا ٹوپی والا برقعہ دولخت ہو چکا تھا اور کوئی کوئی گھرانہ صرف چادر کے سہارے چلنے لگا تھا۔ ہمارے ٹمپل روڈ پر Nuns والے کالے برقعے عام طور پر نظر آتے تھے۔ محلے میں عورتوں کا میل جول کم کم تھا، چونکہ عورت ہی عموماً رشتے ناطے مستحکم کیا کرتی تھی۔ اس لئے جہاں تک میل ملاقات کا تعلق تھا یہ عہد بڑوں کے لئے نئے خوف اور سوچ لیکر آیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ہمارے والدین اور دادی دادی ہمیں زیادہ منع کرنے کے عادی نہ تھے۔ ان کی محبت میں چشم پوشی کی روایت گہری تھی۔ وہ مثال سے سکھانے کے عادی تھے۔ بچوں کو مذہبی درس اور اخلاقیات زبانی کلامی سکھانے کا رواج تھا۔ نوجوان عموماً گھروں کو دیر سے لوٹتے، لیکن ان کے لئے کنڈیاں کھول دی جاتیں۔ کھانا رکھ دیا جاتا اور ان کی آوارہ گردی پر نہ تو تبصرہ ہوتا نہ ہی پوچھ گچھ۔ بس لڑکا خود بخود ہی کہیں پہنچ کر سمجھ جاتا، سارے میں خبر ہو جاتی، اگر اس کی بے راہ روی کی داستان پھیل جاتی تو شادی کا ٹوٹکا آزما لیا جاتا۔ اللہ اللہ خیر صلاح ......لڑکیاں میٹنی شو رد یکھنے تک آوارہ تھیں۔ کبھی کبھی انہیں عشقیہ خط بھی مل جاتے، گھرانے کا لڑکا ہوتا تو چوری چھپے کی ملاقاتیں بھی چل نکلتیں، لیکن یہاں بھی بڑے بزرگ جان بوجھ کر انجان بنے رہتے۔ نہ

تو ہم عمروں میں زیادہ مباحث ہوتے، نہ ہی بڑے اونچی آواز میں نوجوانوں کو گفتگو میں گھسیٹتے۔ یہ چشم پوشی کا عہد تھا صابرین اور شاکرین کا زمانہ تھا۔ خوف میں اندر اندر پکتے رہنے کا عہد تھا۔ خوف میں تو ہر زمانے کے والدین لرزتے ہی ہیں، لیکن اب خوف ترقی کا ہے۔ اب والدین، بڑے بزرگ اولاد کی مالی حیثیت اس کے سٹیٹس کے لئے متفکر ہوتے ہیں، کردار کے لئے نہیں۔

اسی لئے جب ہم چاروں گھر پر بڑوں کو نہ پا کر لوڈو کھیلنے لگے تو ہمیں چوری کی سی لذت محسوس ہوئی۔ ہمیں لگا جیسے ہم بڑوں کا منہ چڑا رہے ہوں۔ اقبال گو میری پارٹنر نہ تھی، لیکن مجھ سے اتنی قریب تھی کہ جب کبھی میں اپنا پاؤں یا گھٹنا ہلاتا، اس کی ریشمی ٹانگ سے ضرور ٹکرا جاتا۔ ہم دونوں سوری کہہ کر گوٹی پر چھ لانے میں مصروف ہو جاتے۔ اقبال کے چہرے پر ہلکی سرخی دوڑ جاتی اور مجھے بھی احساس ہوتا کہ لمحوں میں کچھ ہونے والا ہے۔ ظفر نے اٹھ کر گراموفون لگا دیا۔ کندن لعل سہگل کی آواز سے کمرہ لہک اٹھا۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا جیسے میں ہی دیوداس ہوں اور میں ہی لگا رہا ہوں۔ دکھ کے اب دن بیت نا ہیں۔

شاہد بھائی دو تین بار اندر آئے۔ انہوں نے ہمیں کھیلتے دیکھا۔ کوئی کمنٹری نہ کی۔ وال کلاک کا وقت ٹھیک کیا۔ سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کھولی باہر جھانکا اور چپ چاپ باہر چلے گئے۔ وقت سست رفتار تھا۔ تب دو بھائیوں کے درمیان ایک لڑکی بہت بڑا رخنہ پیدا نہ کر سکتی تھی۔ بھائیوں کی محبت اپنی جگہ قائم رہا کرتی۔

بوڑھا آدمی ہمیشہ دائرے کا سفر کیا کرتے ہیں۔ انہیں بار بار ایک ہی بات دہراتے رہنے کی عادت بھی اسی لئے پڑ جاتی ہے اور وہ ماضی کی سوچوں کا سفر اسی لئے چھوڑ نہیں پاتا۔

ایجادات ہمیشہ سے ماحول پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔ ان کو مشہور کرنے والے سلوگن بھی کچھ کم اہم نہیں ہوتے۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار میں لندن کی نیشنل گیلری میں

ٹرافالگر سکویئر گیا تو مجھے ہنر ماسٹر زوائس کی اصلی تصویر دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ گو اتنے برس گزر جانے کے بعد جب گراموفون ہی ایک عجوبہ روزگار بن چکا ہے۔ اس پر چھپی ہوئی کتے کی تصویر کس کو یاد ہو گی؟

لیکن ایڈیسن کا نام ابھی لوگوں کو بھولا نہیں۔ جو تصویر گراموفون پر بنی ہے، اس کی ایک لمبی ہسٹری ہے۔ فرانس براڈ کے پاس ایڈیسن کی اولین ساختہ مشین تھی۔ اصل میں براڈ کا کتا Nipper جب بھی فونوگراف پر براڈ کی اصلی آواز سنتا۔ حیران سا رہ جاتا کہ مشین سے کیسے اس کی مالک کی آواز آ رہی ہے۔ اسی کتے کی وجہ سے ہنر ماسٹر ز وائس کا مشہور عالم ٹریڈ مارک وجود میں آیا۔

براڈ اپنی تصویر بنا کر مختلف پبلشروں کے پاس گیا، لیکن کسی نے بھی اسے گھاس نہ ڈالی۔ دل شکستہ آرٹسٹ نے یہ ایڈورٹائزنگ پوسٹر اپنے سٹوڈیو کے کسی کونے میں ڈھیر کر دیا۔ کچھ سال گزر گئے۔ اب ایک گراموفون کمپنی نے ایڈیسن کے گراموفون کا تازہ ماڈل بنایا جس پر ڈسک ریکارڈ بجتے تھے۔ جس وقت براڈ نے پیتل کا ہارن دیکھا، اسے اپنی تصویر کو دوبارہ بنانے کا خیال آیا۔ وہ گراموفون کمپنی میں پہنچا اور آرزو ظاہر کی کہ ایک دو دن کے لئے اسے ہارن مستعار دے دیا جائے، تاکہ وہ تصویر میں کچھ تبدیلیاں لا سکے...... کمپنی مینجر کو اس وقت خیال سوجھا۔ اس نے براڈ کی تصویر دیکھ کر اندازہ لگایا کہ اگر فونوگراف کی جگہ ڈسک مشین بنا دی جائے تو پھر وہ اسے اپنے ٹریڈ مارک کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ 1899ء میں اس ہنر ماسٹر ز ٹریڈ مارک کو گراموفون کمپنی نے سو پونڈ معاوضے کے عوض خرید لیا۔ جب گراموفون کمپنی امیر ہو گئی تو انہوں نے براڈ کو سالانہ ڈھائی سو پونڈ ادا کرنا شروع کر دیا اور اس طرح بڑھاپے میں براڈ جیسا آرٹسٹ غریبی، بیماری اور بے روزگاری سے بچا رہا۔

حالیہ ترقی کے دور میں ایسے سلوگن اور ٹریڈ مارک کم ہوتے جاتے ہیں، جن میں کتا اپنے مالک کی آواز سن رہا ہو۔ اب اشتہار کے لئے موماً عورت کی جنسی کشش کا سہارا

لیا جاتا ہے۔ بکاؤ مال بندوق ہو یا برگر، عورت کا ماڈل عام طور پر استعمال میں آتا ہے۔ جس قدر ماڈل جنسی کشش کی مالک ہوگی، اسی قدر اشتہار سریع الاثر بھی ہوگا......

ماڈرن، ترقی یافتہ معاشرے میں عورت چھپانے، سر دھڑ کی بازی لگانے، حیران کرنے کے کام کی نہیں آتی۔ وہ رجھانے، لبھانے اور ستانے کا سمبل بن گئی ہے......

مرد اب اس کی نو یافت حیثیت کو سمجھنے کی کوشش میں سرگرداں ہے، لیکن خود عورت کو معلوم نہیں کہ وہ برف کی چٹان پر کھڑی ہے یا گرم پانی کے نیچے ڈبکیاں لگا رہی ہے۔ ترقی کی دوڑ میں حاصل آزادی اور ذاتی شناخت کی تلاش اس کی شخصیت کو سیراب بھی کر رہی ہے اور ساتھ ساتھ بنجر بھی کئے جاتی ہے، کیونکہ یہاں پھر عورت کو تضاد کا سفر درپیش ہے۔

ارجمند کے گھر میں میری زندگی اس کے ان ڈور پودوں کی طرح میرے لئے مصنوعی اور جدید ہے، اسی لئے میں سڑک سے رابطہ قائم کرنے پر مجبور ہوں۔ میرے دماغ درزی میں دردی کی ان گنت رنگ برنگی کترنیں پھیلی ہیں۔ میں ان رنگین چھوٹے چھوٹے تقابلی فلسفے سوچنے پر مجبور ہوں۔ گرک بڈھے کے گھر سے چار گھر چھوڑ کر ایک ہندو گھرانہ رہتا ہے۔ ان کے گیراج میں بچوں کا چھوٹا سا پلاسٹکی سوئمنگ پول، سڑکوں پر شور مچانے والے Skates بچوں کی سائیکلیں، پش چیئرز، باربیکیو کی انگیٹھی، ان گنت جوتیاں، کئی وافر ٹرنک، کوڑے کا بڑا ڈرم اور فالتو سامان جمع ہے۔ ہم مشرقی لوگ جوڑنے جمع کرنے کے عادی ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے پاس پرانا سامان، جائیداد، استعمال میں نہ آنے والا پیسہ، پرانے خط، خالی ڈبے، بوتلیں، تصویریں سب کچھ پشت در پشت جڑتا چلا جاتا ہے۔ پھر خاندان میں کوئی شرابی، زانی، تماش بین اس جائیداد یا دولت کا ٹھکانے لگا دیتا ہے۔ کوڑے کباڑ کو کباڑیا لے جاتا ہے۔ اس طرح صفائی کا عمل بھی جاری رہتا ہے اور Scvanger بن کر نیچر کی مدد کرتا ہے۔

ہندو خاتون نے ماتھے کی بندی، مانگ کا سیندور، اپنا ساڑھی بلاؤز چھوڑ دیا ہے۔ وہ

اپنے بچوں کے ساتھ اور کبھی کبھی اکیلی نہایت بوسیدہ سی جینز، جوگر ز اور بغیر آستینوں کی بلاوز میں گیراج کی صفائیاں کرتی، گروسریز اٹھاتی، چھوٹے بچے کو پش چیئر میں لاتی لے جاتی نظر آتی ہے۔اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی تھکن ہے جو حالات سے سمجھوتہ کرنے والے چہروں کا محاصرہ کر لیا کرتی ہے۔ وہ سڑک پر آنے جانے والوں کو وش کرنے میں پہل کرتی ہے اور گڈ مارننگ یا گڈ ایوننگ کہتے ہوئے نمستے کے انداز میں ہاتھ جوڑ لیتی ہے۔اس کے چہرے کی تھکاوٹ پر ایک مصنوعی مسکراہٹ کی بدلی چھا جاتی ہے۔وہ پردیس میں اپنا امیج درست رکھنا چاہتی ہے۔لاطینی امریکہ، گوئٹے مالا اور کیوبا سے آنے والے، چینی، جاپانی، پاکستانی، مشرقِ وسطیٰ کے باشندے، بلیک امریکنوں کی طرح بھی وہ زیادہ شائستہ، مددگار، اچھے آداب ظاہر کرنے والی خاتون ہے۔وہ چاہتی ہے کہ لوگ اس کی جلد، مذہب اور وطنیت کے فرق کو بھلا کر اسے اکثریت میں ضم کر لیں۔

نہ جانے کیوں میں سیکنڈ کلاس سٹیزن بن کر اتنا تلملاتا ہوں۔انہی سوچ کے چکروں نے مجھے اندر سے نڈھال کر دیا ہے۔امریکہ میں آ کر مجھے اقلیت اکثریت کا مسئلہ شدت سے ستاتا ہے۔

اگر کبھی آپ کو سائنس پڑھنے کا اتفاق ہوا ہو یہ بات میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور آپ کو چینی کا Salurated Solution بنانے کا موقع ملا ہو تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ محلول ایک حد تک چینی جذب کرنے کا اہل ہوتا ہے۔اس کے بعد محلول میں مزید چینی ملائی نہیں جا سکتی۔اگر اس محلول کو چھوڑ دیا جائے تو یہ سوکھ کر ایک بار پھر دانے دار Crystals کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔کوزہ مصری اسی طریق سے بنائی جاتی ہے۔محلول سوکھ کر ڈنڈی اور دھاگوں سے چمٹ جاتا ہے اور چینی کے محلول کی ایک نئی شکل تشکیل پا جاتی ہے۔

بعینہ وہ ممالک جہاں بہت سی قومیں، مذاہب، رنگ و نسل کی رنگا رنگی موجود ہو،

جب یہی قومیں ایک جگہ بس جائیں تو محلول تیار ہونے لگتا ہے۔ اکثریت کی مثال مچھلی جیسی ہے وہ فطرتاً، وراثتاً، عادتاً، روایتاً اپنے ماحول کے پانیوں سے بے نیاز تیرتی پھرتی ہے۔ اسے کوئی شعوری کوشش نہیں کرنا پڑتی اور وہ ماحول کا حصہ رہتی ہے۔ یوں سمجھئے اکثریت بھرے پانیوں والا دریا ہے۔ اس کا بہاؤ اس قدر تیز ہے کہ کوئی چیز اس کی رفتار کے آگے ٹھہر نہیں سکتی۔

جمہوریت میں اکثریت من حیث القوم جو کچھ بھی کرتی ہے، اصول ٹھہرتا ہے۔ لباس اتار دے، برہنہ پن اصول۔ لباس پہن لے، یہی پہناوا دل پسند ...... ایک شادی رائج کر دے مونوگیمی اصول شادیوں کو رائج کر دے یہی معیار...... سب کی رائے سے حکومت چلائے درست ...... اکثریت کسی کی نہ سنے اور آمریت کا ہی سونٹا کھڑکائے تو آمریت ہی من چاہا طریقہ۔ اکثریت کے رسم و رواج، کلچر حکومت، سیاست ہی سب کو پسند آئے۔ معیشت کی بانٹ میں منطق ہو یا نہ ہو اکثریت کا بہاؤ ضرور شامل ہوتا ہے۔ اکثریت اپنے دیس میں لوہا منوا لینے کی حیثیت میں ہوتی ہے اور دھڑلے کی زندگی بسر کرتی ہے۔ رائے عامہ کا بل ڈوزر سب کچھ ہموار کئے جاتا ہے۔

اکثریت کے مقابلے میں اقلیت کا رول چور کا ہوا کرتا ہے۔ اقلیت نکڑ کے ستون کے پیچھے چھپ کر سڑک کو دیکھتی ہے اور موقع پا کر سڑک پر نکلتی ہے۔ پھر ادھر ادھر دیکھتی ہوئی محتاط انداز میں سڑک کراس کر جاتی ہے۔ کچھ تارکین اللہ کا فضل تلاش کرنے نئے ملک میں وارد ہوتے ہیں۔ امیروں کو اپنا وطن چھوڑنے کی ضرورت تو نہیں ہوتی، لیکن اپنی دولت چھپانے، ضائع کرنے اور وطن کے جاہلوں پر رعب گانٹھنے کے لئے نئے ملک کی بود و باش اختیار کرنا پڑتی ہے۔ کچھ اپنے وطن کی رسہ گیریوں سے پریشان ہو کر سیاسی پناہ گزین بنتے ہیں۔ اپنے ملک میں عزت نفس کی کمی کے باعث انہیں پردیس کی مشقتوں کو اپنانا پڑتا ہے۔ کچھ اپنے وطن میں اپنے کو محبوس جان کر آزادی کے شوق میں اڑ جاتے ہیں۔ کچھ آزادی کی بے آسرا زندگی کے ہاتھوں بے زار ہو کر نئے

نظاموں میں بندھنا چاہتے ہیں۔ کچھ پرفیشنل سکوریٹی کے پنجرے کو قبول کر لیتے ہیں۔ بعض رہائش، آسائش، زیبائش کی خاطر نئے دیس کو اختیار کرتے ہیں۔ کچھ رانجھے کان پھڑوا، کانوں میں مندریاں ڈال پردیس کے جنگلوں میں بسرام کر لیتے ہیں۔ کچھ تبدیلی کو انسانی زندگی کی روح سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو نئے Exposure کے حوالے کر دیتے ہیں۔ کچھ ہجرت سے ناواقف وطن سے خوفزدہ ہو کر صرف بھیڑ چال کے زنغے میں آ کر امریکہ میں منہ اٹھائے پھرتے ہیں۔ بعض خودرائی کے شوقین روک ٹوک سے گھبرا کر امریکی جنت میں پناہ لیتے ہیں۔ کچھ سمجھتے ہیں کہ تعلیم ہی فلاح کا واحد راستہ ہے اور اس کے بغیر ترقی ممکن نہیں۔ وہ یونیورسٹیوں میں برتن مانجھنے، جھاڑو پھیرنے، گھاس کاٹنے کی مشقتوں کو اپنانے میں اپنا ضرر نہیں سمجھتے۔ تعلیم کے پیچھے سرگردان لوگوں کی تعداد امریکہ میں زیادہ ہے۔ انہیں علم کی تلاش کم اور اس سے حاصل ہونے والے تفخر اور ذات کو مور پنکھوں سے سجانے کی ضرورت زیادہ ہے۔ وہ علم کے حصول کے لئے چین کا سفر اختیار کرتے، لیکن ترقی کی دیوی کو زیرِ دام لانے کے لئے امریکہ ضرور پہنچ جاتے ہیں۔ امی نبی ﷺ کو مانتے ہوئے تعلیم کو خدا سمجھتے ہیں۔ یہ تضاد کا ایک اور سفر ہے۔

کوئی کس وجہ سے ہجرت اختیار کرتا ہے۔ میں اس کی تفصّل میں جا کر آپ کا وقت ضائع نہیں کرتا۔ اس امریکہ نگری میں بھانت بھانت کے پنچھی اڑ کر آئے ہیں اور دانتوں میں انگلیاں داب دریا کنارے کھڑے اکثریت کے دریا کا بہاؤ دیکھتے ہیں، لیکن اکثریت کے دریا کا بہاؤ کسی کے لئے نہیں بہتا۔ اس کی طغیانی، روانی، سیلانی، سب قدرتی، فطرتی حقیقی ہوا کرتی ہے۔ ہولے ہولے حوصلہ پا کر خوف کا لبادہ اتار کر اپنی پیٹھ ٹھونک ہلاشری دے کر اقلیت اکثریت کے بہاؤ میں غوطہ زن ہو جاتی ہے۔ جو کچھ بھی داؤ پر لگ سکتا ہے لگا دیا جاتا ہے، لیکن یہ بات میں تو بار بار آپ سے کرتا رہا ہوں اور پھر بھی کروں گا۔ ابھی گھنٹی بجی ہے اور گھر پر کوئی نہیں۔ مجھے ہی نیچے جا کر دیکھنا

پڑے گا کہ باہر کون ہے۔

دروازے کے سامنے بڈھا پھونس ایک امریکی جوڑا کھڑا ہے۔ پتہ نہیں پیچھے سے یہ اطالوی ہیں کہ نیدرلینڈ سے آئے ہیں۔ پتہ نہیں ان کے باپ دادا اس وقت یہاں آئے جب انگریزوں اور آئرش لوگوں میں کشیدگی نے جنم لیا...... یہ بھی تارکین ہیں۔ ایک وقت تھا جب ان کے آباء غیر قانونی طور پر بغیر تحفظ کے یہاں پناہ گزیں ہوئے، لیکن اب ان دونوں کے پاس نیلا پاسپورٹ ہے۔ عجب ہیکہ ایسے سٹیزن کی ہمدردی غیر قانونی طور پر یہاں آبسنے والے تارکین کے ساتھ نہیں ہے۔ بڈھے امریکن کی صحت اچھی ہے، لیکن بڑھیا کو مہ وسال نے ہنڈا دیا ہے۔ اس کے کان شاید زیادہ نہیں سنتے، کیونکہ وہ گلے میں ہیرنگ ایڈ لٹکائے پھرتی ہے۔ ان دونوں کا گھر ہماری گلی سے دس منٹ کے پیدل راستے پر ہے۔ یہ اپنے مکان کا کچھ حصہ بھوتوں سے بچانے کے لئے کرائے پر اٹھائے رکھتے ہیں۔ کبھی چینی، کبھی میکسیکو، کبھی کیوبا کے اڈاری پاس رکھ کر وہ محفوظ محسوس کرتے ہیں، کیونکہ ایسے تارکین خوفزدہ پرندوں کی طرح جلدی سوتے اور صبح جلد اٹھ کر کاموں پر نکل جاتے ہیں۔

مسٹر اینڈ مسز ہارٹ عموماً مجھے Gizbo میں بیٹھے ملتے ہیں۔ دونوں اتنی لمبی مدت ساتھ رہنے کے باعث ہم شکل، ہم عمر اور ہم لباس لگتے ہیں۔ لیکن کہیں ان میں بھی ایک دوری ہے۔ وہ اس بات سے خوفزدہ نظر آتے ہیں کہ دونوں میں سے ایک کو اس سرائے عالمگیر سے پہلے اڑ جانا ہے اور ساتھی کو اکیلے اس گزبو میں بیٹھے بیٹھے لے جانے والی ہواؤں کا انتظار کرنا ہے...... مسز ہارٹ سوچتی رہتی ہے کہ اگر میرے بعد ہارٹ اس کی بیٹی کے پاس فلوریڈا چلا جائے تو شاید اسے قبر میں آرام مل سکے گا۔

لیکن پھر وہ سوچتی ہے، کیا میری ماں میرے پاس آ کر رہ رہی تھی؟ وہ تو مرتے وقت لاس اینجلز میں تھی...... اور اکیلے ہی مرنے کے مراحل سے سبکدوش ہو گئی تھی۔ اسے خیال آتا ہے کہ کیا تنہائی سفید فام کلچر کا حصہ ہے کہ اس کی ضرورت؟ کیا تنہائی آزادی کی

آرزو سے پیدا ہوتی ہے کہ Privacy کی خواہش نے فیملی یونٹ کو مالٹے کی پھانکوں سمان علیحدہ پیک کر کے ایک پھل کا حصہ بنا دیا ہے۔

میں یہ خیال آرائی کرتا ہوں کہ امریکی جوڑا اپنے متعلق یوں سوچتا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ ان دونوں نے کبھی بھی ان باتوں کے متعلق کچھ نہ سوچا ہو۔

معاف کیجئے ہم نے آپ کو زحمت دی بڑھیا کہتی ہے۔

نہیں آپ ویلکم ہیں میں دروازہ کھولتا ہوں۔

نہیں نہیں ہم اندر نہیں آنا چاہتے، کھڑے کھڑے بات ہو جائے گی۔

فرمائیے؟

بات یہ ہے کہ کچھ Racist اس علاقے میں رہتے ہیں۔ ہم نے ان کے خلاف ایک تحریک چلائی ہے۔ انہیں سمجھانے کی ضرورت ہے اور اس کے لئے مضامین لکھنے پڑتے ہیں۔ پمفلٹ چھاپنے پڑتے ہیں۔ سیمینار کرنے ہوتے ہیں۔ جس کے لئے چندہ جمع کرنا پڑتا ہے۔ کیا آپ کچھ پیسے Countribute کرنا چاہتے ہیں۔ عورتنیمقاصد کی تشریح کی۔

ضرور ضرور...... میں نے ہاتھ آپس میں ملتے ہوئے کہا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ لوگ پرانے تارکین میں سے ہیں؟ عجب بات ہے کہ آپ دو ایک نسلیں گزر جانے کے بعد امریکی ہو گئے، لیکن وہ مسلمان جو سپین سے اس وقت آئے جب یہاں Mexican سارے امریکہ کے مالک تھے اور وہ نیگرو جو اس وقت یہاں پہنچے جب یہاں کوئی سڑک، بازار نہ تھے...... وہ ابھی تک بلیک نیگرو ہیں، مسلمان ہیں اور احساس کمتری کا شکار ہیں اور امریکی نہیں ہو سکے۔

اسی کیخلاف، اسی تعصب کے خلاف ہم جنگ کرتے ہیں۔

آپ پیسے لے لیجئے لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کامیاب نہیں ہوں گے...... آپ ان کو شاید حقوق تو دے پائیں، لیکن آپ انہیں محبت اور انصاف نہیں دے سکیں گے......

وہ اپنی شکل اور رنگ کا تاوان اندر کے احساس کمتری سے ادا کرتے رہیں گے...... یہی آپ کی اوران کی سانجھی سزا ہے۔آپ احساس جرم سے اوروہ احساس کمتری سے گھٹتے بڑھتے رہیں گے۔

انہوں نے خاموشی سے دس ڈالر کا نوٹ پکڑ لیا اور رسید بنا کر مجھے دے دی۔شاید وہ بھی اندر سے Racist تھے اور اپنا احساس جرم مٹانے کے لیۓ رخت سفر باندھنے سے پہلے اللہ کو قرض حسنہ دینا چاہتے تھے۔

چالیس پچاس سال پہلے مشرق کا Extended فیملی ایک بہت بڑا Support سسٹم تھا۔اب یہ سسٹم کمزور پڑ رہا ہے۔مشرق میں زندگی خاندان کے تابع چلتی رہی ہے۔اگر خاندان طاقتور، امیر اور عزت والا ہو تو کبھی کبھی یہ مافیا کی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے۔فرد معاشرے کے تابع، خاندان سے وابستہ، روایت کا پابند، اپنی شخصی آزادی کو بھینٹ چڑھا کر عافیت کی زندگی بسر کرتا رہا ہے۔

سفید فام لوگ اور خاص کر امریکی معاشرہ خاندان کی زنجیریں توڑ چکا۔یہاں فرد نظام کا تابع ہے۔ ہر شہری پابند ہے۔حکومت چاہے ڈیموکریٹ کی ہو چاہے Republican کی، ہر شہری نظام کا پابند رہے گا۔ وہ حکومتی Infrastructure کو توڑ کر اپنی آزادی کا اعلان نہیں کرسکتا۔اسے لال بتی پر آدھی رات کے وقت بھی رکنا پڑتا ہے۔وہ ٹول ٹیکس پر بڑی رضا و رغبت سے رکے گا۔ٹیکس ادا کرنے پر مجبور ہوگا۔ہر شہری اپنی Free Will سے اس پابندی کو قبول کرتا ہے جو امریکی Countitution نے اس کی بہتری کے لئے بنائی۔کسی نظام کو توڑنا اور اپنی آزادانہ روش یا آزاد خیال کے پیش نظر کوئی خصوصی رعایت طلب کرنا امریکی نظام زندگی کے منافی ہے۔یہاں سفارش، کنبہ پروری، اس لئے نہیں ہوتی کہ یہاں خاندان کا تصور ہی ڈھیلا پڑ چکا ہے۔اقربا پروری کہاں سے آئے گی؟

امریکہ میں نبیوں کا بنایا ہوا نظام نہیں چلتا، کیونکہ یہاں بہت سی قومیں، مذاہب

نسلیں مستقلاً ایک دوسرے سے بھڑتی رہتی ہیں۔ جھگڑے اور تصادم سے بچنے کے لئے اور اکثریت کی خواہش کو مدنظر رکھ کر امریکی شہریت مذہب کو ذاتی لاکر میں بند کر کے ہیومن رائٹرز کا کریڈٹ کارڈ استعمال کرتا ہے۔

جونہی امریکی شہری نظام کا پابند ہو جاتا ہے۔ حکومت ماں باپ بن کر عام رعایا کی آزادی سلب کر کے اسے نظاموں میں جکڑ بند کر لیتی ہے۔ پھر حکومت شخصی آزادی پر پہرہ نہیں بٹھاتی۔ جب قانون اکثریت پر لاگو ہو چکتا ہے، قسطوں پر مکان، بیکار لوگوں کو وظیفے ملنے لگتے ہیں اور حکومت ویلفیئر سٹیٹ میں بدل جاتی ہے تو پھر وہ شخصی آزادی کے دروازے کھول دیتی ہے۔ وہ نیک دل امریکی جو سارا دن غلاموں کی طرح نظام کو پوجتے اور حکومتی حکم کو بجالانے کو ایمان سمجھتے ہیں، جو محنت کی اخلاقیات کو انسانیت کی معراج سمجھتے ہیں۔ شخصی زندگی میں سب زنجیریں توڑ کر من مانی کرنے کو بھی اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں اور تضاد کا پنڈولم نظاموں کی پابندی کے بعد شخصی آزادی کی طرف رواں ہو جاتا ہے۔ فرد ذاتی عمل میں اس وقت تک پورا آزاد ہے جب تک اس کا عمل کسی دوسرے کی آزادی میں خارج نہ ہو۔ فرد کی آزادی وہیں تک ہے جہاں سے کسی دوسرے شہری کی ناک شروع ہو جاتی ہے جب امریکی شہری کا مفاد حکومت کے نافذ قوانین سے ٹکراتا ہے تو لامحالہ حکومت شہری کے پر قینچ کر لیتی ہے۔ آپ شخصی زندگی میں رکھیل رکھیں یا سرے سے شادی نہ کریں اور فلرٹ کر کے ڈنگ ٹپائیں۔ شراب میں مست رہیں یا بال رنگ کر پنک بن جائیں۔ بچے خود پالیں یا کسی اور کے سپرد کر کے کام پر چلے جائیں۔ والدین کی خدمت خود کریں یا انہیں کسی بڈھا ہاؤس میں چھوڑ آئیں، حکومت دخل انداز نہیں ہو گی۔ آپ ہم جنسیت میں مبتلا ہوں اور حرت لوط کی قوم کے نافرمانوں میں سے ہو جائیں، حکومت آپ سے معذرت طلب نہ کرے گی۔ یہ آپ کا ذاتی مسئلہ سمجھا جائے گا۔ کوئی خاندان پوچھ گچھ کے لئے حاضر نہ ہو گا۔ حقہ پانی بند کرنے کا تصور امریکی معاشرے میں موجود نہیں۔ کوئی آپ کی شخصی

زندگی پر اثر انداز ہونے کی کوشش نہیں کرے گا۔لیکن ازلی تضاد یہاں بھی در آئے گا۔

نظاموں کے پابند معاشرے میں ذاتی زندگی آزاد ہوگی اور معاشرہ اسی شخصی آزادی کے باعث مشکلات سے دوچار ہوگا۔طمانیت، سکون شانتی کی کمی ہوگی۔ذہنی نفسیاتی بیماریاں بڑھیں گی۔طلاق کی شرح میں اضافہ ہوگا۔شلٹر ہومز بڑھیں گے۔فرد کا سپورٹ سسٹم نہ ہونے کی وجہ سے تنہائی کا روگ عام ہوگا۔لیکن اگر آپ شراب پی کر ڈرائیو کریں گے، چالان ضرور ہوگا۔بچے کو ماریں پیٹیں آپ کا بچہ پولیس کو فون کرکے آپ کی شکایت کر دے گا۔آپ پنک بن کروں گا، فساد کریں یا کوئی عورت آپ پر یہ ثابت کر دے کہ آپ اس سے شادی کا وعدہ کرکے وعدہ خلافی کے مرتکب ہوئے تو پھر شخصی آزادی ختم ہو جائے گی۔آپ کو حدود کراس کرنے کی سزا ملے گی۔

مشرق کا حساب اس سے برعکس ہے۔ہمارے معاشرے میں فرد پابند اور شہری آزاد ہے۔یہاں ابھی ہم خاندان سے منفی اور مثبت دونوں طریق سے وابستہ ہیں۔ہمارے رسم و رواج، لین دین، محبت اور نفرت کے سارے سرچشمے خاندان سے نکل کر بہتے ہیں۔خاندان حقہ پانی بند کرتا ہے۔شخصی آزادی پر کڑے پہرے ہیں۔ہم حکومت، قانون، نظام کی پابندی سے آزاد ہیں۔لال بتی کراس کر جائیں پرواہ نہیں، ٹیکس نہ ادا کریں، قانون شکنی پر دل میں ملال نہ لائیں۔قانون کا گلا قدم قدم پر گھونٹیں، کوئی عیب نہیں۔سرکاری زمین پر تجاوزات کرکے جنگلے چڑھا لیں، درخت لگائیں، باغیچے بنائیں۔غیر قانونی مکان تعمیر کرکے کچی آبادی بسا لیں، سب جائز۔حکومت سر پیٹتی رہے، قانون ٹھینگے دکھائے، سب چلتا ہے۔جن گھروں پر احتساب کی ہر لگتی ہے، ان سے میل ملاقات فخریہ جاری رہتا ہے۔یاں پابندی ہے تو صرف فرد کی ذاتی زندگی پر۔مشرقی لوگ شخصی زندگی میں رسم و رواج، کلچر، مذہب کے پابند ہیں۔ذات پات کی بندش کو فرد قبول کرتا ہے۔والدین ابھی ادب کے درجے پر ہیں۔بچے کی وجہ سے ناکام شادی کو نبھایا جا سکتا ہے۔رشتہ داروں کی رائے آپ کے شخصا

کا تعین کرتی ہے۔ آپ اپنے متعلق جو بھی خیال رکھیں، لیکن رائے آپ کے معلق وہی چلے گی جو آپ کا خاندان طے کرتا ہے۔ آپ بھاری تاوان، قیمت یا مشکلات کا سامنا کیے بغیر خاندان کا پھندا گلے سے اتار نہیں سکتے۔ آپ اچھا شہری بن کر معاشرے میں عزت حاصل نہیں کر سکتے۔ بلکہ اچھا شوہر، بھائی، بیٹا بن کر عزت کا مقام مل جایا کرتا ہے۔ مشرقی معاشرے میں رشوت، سفارش، دولت کی ہوس دراصل خاندان کی آبیاری کے باعث پھلتی پھولتی ہے۔ تعلقات آپ کو ایسے خودغرض کاموں کی طرف مجبور کرتے رہتے ہیں اور نظام چلنے نہیں دیتے۔ جب معاشرے میں محبت، مروت اور یگانگت کے رشتے ہوں تو پھر سپورٹ سسٹم کے باعث نفسیاتی مسائل کم، اسی سپورٹ سسٹم کے باعث تنہائی کم تر اور سکون، طمانیت قلب وافر انداز میں ملتی ہے، لیکن نظام نہیں چلتے اور نظام نہ چلنے کی صورت میں خاطر خواہ ترقی نہیں ہو پاتی۔

میں آپ سے یہ بات نہیں کر رہا کہ مغرب بہتر ہے یا مشرق کی حالت قابل رشک۔ میں اپنی سوچ میں بس یہاں تک سوچ پایا ہوں کہ ازلی تضاد دونوں جگہ موجود ہے۔ مغرب میں یہ تضاد فرد کی ٹوٹ پھوٹ پر منتج ہوا ہے اور مشرق میں اسی تضاد نے حکومتوں کے استحکام کی نفی کی ہے۔ مغلیہ بادشاہت کے زوال کی داستان بھی دراصل خاندان کے فتح کی کہانی ہے۔ مشرقی ممالک میں جمہوریت کے فیل ہو جانے کا راز بھی خاندان کی مضبوطی میں پنہاں ہے۔

مغرب اور مشرق اسی لئے کبھی مل نہیں سکتے کہ مشرق میں ابھی فلاح کی تلاش جاری ہے۔ فلاں کا سفر فرد سے شروع ہو کر بالآخر معاشرے میں ضم ہوتا ہے۔ ترقی کی منزل معاشرے کی فراوانی، آسائش و زیبائش کے بغیر ممکن نہیں ...... اور تنہائی پر منتج ہوتی ہے۔ دونوں طریقے مختلف ہیں۔ ایک شمال سے جنوب کا سفر ہے، دوسرا مشرق سے مغرب کی جانب بڑھنے کی مسافت ہے۔ کیا جانے نقطہ اتصال کہاں ہے؟ کیا فلاح اور ترقی بیک وقت ممکن بھی ہے اور کس قدر اور کہاں تک اور کیونکر؟

میں ایک جھکی بوڑھے کی طرح یہ تقابلی سوچیں پیش کرتا رہتا ہوں۔ بوڑھا آدمی عموماً ماضی میں پناہ لیتا ہے اور اسی طرح دائرے کے سفر میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ خوفزدہ رہتا ہے۔ جانتا ہے کہ سیدھی لائن کا سفر تو بالکل فنا میں ضم ہوتا ہے۔ ناکارہ تکلیف دہ زندگی کے باوجود بوڑھا فنا کو قبول نہیں کرتا۔

شام پڑ چکی ہے۔

بائی لین پر اکا دکا کار گزر جاتی ہے۔ لوگ کبھی کے گھروں کو لوٹ چکے۔ میں ارجمند کے لئے ہاف اینڈ ہاف کا دودھ اٹھائے گھر جا رہا ہوں۔ یہ پلاسٹک کی بوتل ویسی زمزمی سے مشابہ ہے۔ جس میں عمرے یا حج کے بعد لوگ آب زم زم لایا کرتے ہیں۔ اس نیم اندھیرے میں ابھی مجھے فٹ پاتھ پر کراس کر کے ایک آدمی گزرا تھا۔ اس کے پاؤں یوں پڑ رہے تھے جیسے وہ گھٹنوں چلا ہو۔ اس کی آنکھوں میں کسی مہربان چہرے کی تلاش تھی۔ تنہائی اسے اتنی جگہ سے ڈس چکی تھی کہ اب اس نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ زیادہ لوگ اپنے اپارٹمنٹس میں پہنچ چکے تھے۔ بتیاں جل چکی تھیں۔ ایک دکان میں دو نیگرو ایک ڈمی مینا کن کو سبز رنگ کا لباس پہنانے میں مشغول تھے۔ دور کہیں کاروں کا شور بھی اس خاموشی کو اجاگر کرنے میں معاون ثابت ہو رہا ہے۔

شاید زندگی کے مسائل سلجھانے کے لئے ایک زندگی کافی نہیں۔

ساری ضروریات کا اندازہ لگائیں تو ایک نوکری بھی کافی نہیں۔

ایک محبوبہ بھی اطمینان کا باعث نہیں، کیونکہ وہ بھی تحفے میں آپ کو اپنی بے اطمینانی ہی دے سکتی ہے۔ جس طرح وہ ایک کندھے کو جھکائے من من کا پاؤں اٹھاتا رکھتا گزرا ہے لگتا ہے۔ اس کے پاس کوئی نوکری، عورت، گھر یا شہر نہیں ہے۔ وہ خانہ بدوش ہے، لیکن اس کے پاس خانہ بدوشوں کا کنبہ نہیں۔ ان کے رسم و رواج بھی اس کے نہیں۔ وہ زندہ رہنے کی تقویت کہاں سے لے ...... ایسا فلنگ سٹیشن کہاں تلاش کرے، جہاں وہ اپنی ٹینکی میں کچھ عرصہ اور جینے کے لئے گیس بھروا لے۔ کیا وہ سان

ڈیگو چلا جائے؟ کیا نیویارک بہتر ہوگا۔ کیا کیوبک کے لوگ زیادہ مہرباں ہوں گے ......وہ باون ریاستوں کے امکانات کے متعلق سوچتا ہے۔ کبھی امید اسے آنکھ مارتی ہے، کبھی خوف اسے ڈسنے لگتا ہے۔

اس کے کانوں میں دادی کی آواز آتی ہے۔ ہمارے زمانے میں ایسے نہیں ہوتا تھا بیٹا۔

باپ کہتا ہے جب میں نوجوان تھا۔

چچا اسے وہ کہانیاں سناتا ہے جن میں سکول کی شرارتیں تھیں۔

ماں اسے باہر جانے سے روکتی ہے۔

لیکن ان سب کو تو وہ پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ وہ حفاظتیں روک ٹوک تو اس نے خود ختم کر دی تھیں۔

وہ تو امریکہ میں ہے جس میں آزادی کا مجسمہ ساحل میں جکڑے سمندر کے تلاطم کو صبح و شام دیکھتا ہے۔

یہ تو ایسا دیس ہے جس کی وادیوں میں ندیاں جنگلوں میں دریا بہتے ہیں۔ سمندر سے جڑے پہاڑ اور میلوں لمبے ریتلے ساحل ہیں۔ یہ بڑے بڑے بزنس مین کا دیس ہے جن کے ایسے بنک اکاؤنٹ ہیں جیسے کسی چھوٹے غیر ترقی یافتہ ملک کا بجٹ ہو۔ یہ پنٹا گون کا ملک ہے۔ ارلنگٹن کے قبرستانمیں یونیفارم سمیت دفن کئے ہوئے لوگوں کا دیس ہے......وہ یہ ملک ہے جو آزادی دینے اور چھیننے کا داعی ہے۔

اپنی آزادی ثابت کرنے کے لئے وہ افغانوں کی آزادی سلب کر سکتا ہے۔

اپنی طاقت کا ثبوت پہنچانے کے لئے وہ عراق کو تباہ کر سکتا ہے۔

وہ ترقی پذیر ملکوں کو انگوٹھا دکھا کر، گلہ دبا کر، مکا گھما کر اپنی شرائط پر قرض ٹھونس سکتا ہے اور پھر تباہ کرنے کے بعد تباہی سے بچا بھی سکتا ہے۔

یہ وہ اکیلی سپر پاور ہے جو زبردستی صحت مند معاشروں پر اپنے ایجاد کردہ علاج

ٹھونس سکتی ہے۔

ابھی جو آدمی ایک کندھا گرا کر میرے پاس سے گزرا ہے، اس نے کبھی ایسی باتیں نہیں سوچیں۔ وہ تو صرف جینے کا حق چاہتا ہے اور کچھ نہیں۔

ایک گھر...... ایک نوکری...... ایک گھر والی...... ایک بچہ وہ قناعت پسند، تھوڑی عزت پر راضی ایک نارمل وسطی زندگی گزارنے کا آرزومند ہے، لیکن شاید ایسا بھی نہیں ہے۔ وہ بھی امریکہ میں دولت کمانے زیب و زیبائش کی زندگی گزارنے کے لئے ملک بدر ہوا ہے۔ میں اس سے آگے گزر کر ہانپنے لگتا ہوں۔ اب کبھی کبھی مجھے خواہ مخواہ سانس چڑھ جاتا ہے۔ میں بلال سے اپنی صحت کے متعلق کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔ میری کنپٹی میں جو جلترنگ بجتا ہے۔ وہ یا تو انحد باجہ ہے یا ہائی بلڈ پریشر کی تمہید ہے۔ بلال سے بیماری کا ذکر اس لئے نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا دن پہلے ہی ضروری اور غیر ضروری مصروفیات سے اٹا پڑا ہے۔ ارجمند اور بلال نے ہر گھنٹے منٹ سیکنڈ کا پروگرام بنایا ہوتا ہے۔ اس لئے انہیں جینے کے لئے وقت نہیں پروگرام ہی پروگرام ملتے ہیں۔ مشاہدے، تخیل، وجدان کی ان کی زندگی میں کوئی گنجائش نہیں۔

میں شام کے جھٹپٹے میں ایک خالی بنچ پر بیٹھ کر ہاف اینڈ ہاف کا بوتلا پاس رکھتا ہوں، تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ بنچ پر پہلے سے کوئی بیٹھا ہے۔ وہ غیر شعوری طور پر ایک طرف کھسک جاتا ہے۔ گویا میرے لئے جگہ بنا رہا ہو۔ یہ خوبصورت گورا چٹا نوجوان یا تو یورپی ہے یا امریکن، وہ انگریز اس لئے نہیں لگتا کہ اس کے چہرے پر پرے پرے نہیں لکھا اور میری آمد پر اس نے اپنے چہرے کا دریچہ بند نہیں کیا۔

ہائے۔

وہ بھی ہائے کہہ کر جوابی پیش رفت کرتا ہے۔

اگر آپ چاہیں تو میں کسی دوسری بنچ پر بیٹھ جاتا ہوں۔ وہ امریکن لہجے میں انگریزی بولتا ہے۔

''نہیں نہیں...... میری خوش نصیبی ہے کہ تم جیسا خوبصورت نوجوان ہم نچ ہے''۔

فاصلے سے ایک کار ہم پر روشنی کا تختہ ڈال کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ اس سرچ لائٹ میں اس کے براؤن بال، نیلی آنکھیں اور سفید رنگ کی جاذبیت مجھے کھینچتی ہے۔ میں ہمیشہ سے کالی قوموں کی طرح جمال پرست ہوں۔

کیا آپ مجھ سے باتیں کرنا چاہیں گے؟ وہ یکدم اردو میں کہتا ہے۔

ضرور ضرور...... بسم اللہ......

میں اپنا تعارف کرا دوں۔ میں پشتون افغانی ہوں اور میرا نام عبدگل ہے۔ میرا باپ اپنا خاندان لے کر...... پشاور میں پناہ گزیں ہوا...... یہ تب کی بات ہے جب ہم امریکہ کی جنگ روس کے خلاف لڑ رہے تھے۔ تب ہمیں ہتھیار بھی ملتے تھے اور روپے پیسے کی مدد بھی حاصل تھی...... میرا باپ امیر آدمی تھا، اس لئے ہمیں پشاور میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ آپ جانتے ہیں امیر آدمی کو کہیں بھی دقت پیش نہیں آتی، وہ امریکہ میں ہو یا پاکستان میں، افغانستان ہو یا وہ زندگی کے وار دولت پر جھیل لیتا ہے۔ پھر میری ماں فوت ہوگئی۔ ماؤں کی بھی عجب مصیبت ہے۔ جب انکی بہت ضرورت ہو تو وہ قصداً فوت ہو جاتی ہے۔

ہم دونوں چند ثانیے خاموش رہے۔

''آپ بور تو نہیں ہو رہے بابا جان......''

''نہیں یار۔ عبدگل میں سمجھتا ہوں You have made my day میں ایسی ہی سر راہے گاہے ملاقاتوں پر تو زندہ ہوں...... اب تو ٹیلی فون اور خط بھی نہیں آتے کبھی۔

وہ میری بات سمجھ نہ پایا، کیونکہ ابھی وہ عمر کے ایسے حصے نہ تھا۔

''میرے باپ نے شادی کرلی۔ دوسری شادی...... یہ نہیں کہ اسے عورت کی ضرورت تھی، بلکہ وہ امیروں کی طرح کاہل تھا اور گھر کے چھوٹے چھوٹے کاموں پر وہ

درشت ہو جایا کرتا۔ میری نئی ماں بھی افغانی پشتون تھی، لیکن اس کا خاندان تین پشتوں سے لاہور میں مقیم تھا۔ اس میں پنجاب والوں کی طرح آگے بڑھنے کی صلاحیت تھی۔ اس نے مجھے بھی ترقی کے راستے پر ڈال دیا اور...... میں بڑی چھوٹی عمر میں اے لیول کرنے کے بعد یہاں آ پہنچا۔

عبدگل...... لیکن خیر...... بتاؤ یہاں آ کر تم نے کیا پڑھا؟

انجینئر کی...... نوکری کی، پیسہ کمایا، لنڈھایا، برباد کیا...... زندگی کو انجوائے کیا، کئی لوگوں کو عیش کرائی اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا بابا جان کہ میں نے اس سرزمین پر قدم دھرتے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اس سوسائٹی میں اسی وقت پھل پھول سکتا ہوں، جب میں لبرل رہوں...... آپ جانتے ہیں لبرل کون ہوتا ہے؟

''فراخ دل......''

''ضروری نہیں......''

''دوسروں کو قبول کرنے والا......''

''یہ بھی ضروری نہیں......''

''پھر میرا خیال ہے دوسروں کے کلچر اور مذہب کو بھی ایک حقیقت ماننے والا...... اختلاف پر پل تعمیر کرنے والا......''

''ہاں ۔۔۔۔'' دل میں ہلکی سی ٹیس اٹھی ۔۔۔۔ انسان کتنا مجبور ہے!

''آپ نہیں جانتے بابا جان......لبرل صرف وہ شخص ہوسکتا ہے جو کسی بھی کھونٹی سے نہ بندھا ہو......وہ کسی وطن پرستی کے جذبے سے سرشار نہ ہو......کسی خاص مذہب، مسلک، رسم و رواج کا پابند نہ ہو......وہ اس قدر خالی ہو کہ ہر وقت دوسروں کے سانچے میں اگر ڈھل نہ سکے تو کم از کم اپنی ذات میں دوسروں کا مذہب، کلچرل، رسم و رواج بھر سکے۔ نہ اس کا ضمیر اس تبدیلی پر اسے لعنت کر سکے، نہ ہی وہ کسی احساس جرم میں مبتلا ہو۔

کچھ لوگ بڑی آسانی سے نئی عورتوں کے ساتھ تعلق پیدا کر لیتے ہیں بابا جان کیونکہ ان کے اندر کسی عورت کا نہ بت ہوتا ہے نہ تصویر......وہ وفا کے جذبے سے آشنا نہیں ہوتے، اس لئے بدلتے رہنے میں انہیں مشکل پیش نہیں آتی......میں نے بھی یہاں گرگٹ کی طرح کئی رنگ بدلے، کئی موڑ کاٹے......پھر میرے والد واپس قندھار چلے گئے۔ یوپی سیڈ سے کمائی ہوئی ساری دولت انہوں نے میری دوسری ماں کے نام کر دی اور اپنی دونوں بیٹیاں ساتھ لے کر اپنے آبائی وطن چلے گئے......میں دو ایک بار قندھار گیا، لیکن میں لبرل آدمی تھا۔ میرا قندھار میں دل نہ لگ سکا۔ وہاں طالبان کی حکومت تھی، جو احکامات خداوندی کے پابند تھے۔ سب سے بڑی تکلیف مجھے وہاں داڑھیاں دیکھ کر ہوتی تھی، پھر عورتوں کے برقعے مجھے وحشت میں مبتلا کر دیتے۔ میری دونوں بہنیں پشاور میں برقعہ نہیں پہنتی تھیں، لیکن قندھار میں انہوں نے بھی شٹل کاک برقعہ اختیار کر لیا تھا۔ میں لبرل تھا، ہر قسم کے کلچر اور مذہب سے سمجھوتہ کرنے میں پہل کیا کرتا۔ ہر قسم کے کھانے، لباس، رسم و رواج قبول کرنے میں مجھے دیر نہ لگتی، لیکن برقعہ اور داڑھی دیکھ کر نہ جانے کیوں میں غصے میں آ جاتا۔ لبرل ہونے کے ناطے مجھے یہ کلچر بھی قبول کرنا چاہئے تھا، لیکن پتہ نہیں کیوں میرے اندر چڑ پیدا ہوگئی۔ آخری شام جب میں اپنے دادا سے رخصت ہونے مردانہ بیٹھک میں پہنچا تو میں سگریٹ پی

رہا تھا۔ میں چونکہ لبرل بھی تھا اور سچا بھی تھا، اس لئے میں نے سگریٹ بجھانے کی کوشش نہ کی۔ دادا نے مجھے منع نہ کیا۔ حسن اتفاق سے اس وقت ڈیرے پر کوئی نہ تھا اور دادا بڑے سے گاؤ تکیے سے کمر لگا کر تسبیح پھیرنے میں مشغول تھا۔ مجھے یوں بے باکی سے سگریٹ پیتا دیکھ کر اس کے چہرے پر ہلکی سی ناگواری بیدار ہوئی، لیکن دادا نے منہ سے کچھ نہ کہا۔

میں واپس جا رہا ہوں دادا جان۔

کب؟

آج شام کی فلائٹ سے اسلام آباد...... پھر وہاں سے ماں کو سلام کر کے امریکہ......

میرے دادا نے ماں کے نام پر ہلکی سی تیوری چڑھائی۔ گاؤ تکیئے پر اس کا وزن بڑھ گیا۔

تمہاری دوسری ماں نے ہماری سرزمین کو قبول نہیں کیا، حالانکہ وہ بھی پشتون خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس نے ہماری زبان، کلچر کو اپنانے کی کوشش نہیں کی...... پتہ نہیں کیوں؟

میں دادا کو بتا نہ سکا کہ وہ پتوں کے بغیر ننگی بوچھی ڈالی کو قبول نہیں کر سکتی...... طالبان کی حکومت میں کوئی ایسی دلکشی نہیں دادا...... جو ماں کو یہاں آنے پر آمادہ کرے۔ عورت اور بچہ، دادا، کھیل تماشے، لہو ولعب، عیش و عشرت کے بغیر سوکھنے لگتے ہیں، پتہ کے بغیر شاخ کس کام کی؟ اسے بنایا ہی اس لئے گیا تھا کہ بابا آدم کا دل لگائے...... وہ خوشی کے اصول پر پیدا کی گئی۔ اسے طالبان کی حکومت راس نہیں آسکتی۔ جہاں ہر وقت ضبط نفس کا کوڑا چلے۔

میں بھی دوسری ماں کی طرح برقعے والی عورتیں...... داڑھی والے مرد چھوڑ کر یہاں آ گیا۔

ایک لمبے ٹرک نے ہم دونوں پر اپنی سرچ لائٹ پھینکی اور پھر آگے بڑھ گیا۔ میں نے عبدگل کی طرف چور نگاہوں سے دیکھا۔ایک مرتبہ اخبار میں اس کے ہم شکل آدمی کی تصویر چھپی تھی، وہ بوسنیا کا مجاہد تھا۔اس کے ماتھے پر لمبے زخم کا نشان تھا اور اس پر جھکی ہوئی عورت نے سکارف سے اپنے بال ڈھانپے ہوئے تھے۔اصغری جو گم سم سائے کی طرح سلیپر کھسکاتی کمروں میں بند چڑیا کی طرح گھومتی رہتی۔اخبار اٹھا کر اس تصویر کو دیکھنے کے بعد بولی تھی...... کتنے خوبصورت لوگ ہیں بوسنیا کے......لوگ ان غریبوں کے کیسے بیری ہو گئے...... ہائے ہائے بڑا ظلم ہے بڑا ظلم ہے......

عبدگل کو دیکھ کر میرے دل میں بھی خواہ مخواہ کا غم موجزن ہو گیا۔شاید انسان بنیادی طور پر جمال پرست ہے۔وہ کسی کالے بھجنگے بچے پر اس طرح نہیں پسیجتا، جیسے وہ ایک نیلی آنکھوں والے گورے گول مٹول بچے کو دیکھ کر پوری طرح خوش آمدید بن جاتا ہے۔

اگر تم واپس جانا چاہو تو کہاں جاؤ گے افغانستان کہ پاکستان؟......

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

میں گیارہ ستمبر سے پہلے بہت لبرل تھا بابا جان ...... کیونکہ میں کسی خیال، مسلک، مذہب، **ملک**، خاندان سے وابستہ نہیں تھا۔نہ میری جڑیں کہیں تھیں، نہ میرا دماغ کہیں تھا...... جو آدمی کم ہیں بندھا ہو، وہ آسانی سے لبرل نہیں ہو سکتا...... میں سوچتا رہتا کہ کمیونزم نے فیل ہو کر فرد کے لئے بڑی مشکل پیدا کر دی ہے۔اب جمہوریت اور سرمایہ پرستی کے علاوہ اور کوئی مذہب قابل تقلید نہیں رہا۔

اتنا نہ سوچا کرو برخوردار...... جوانی عمل کا پریڈ ہے......تو ہمات کے پیچھے بھاگنا اور سوچ کا بیوپار میری عمر کا مشغلہ ہے......کھاؤ پیو اور بلے لوٹو۔

وہ میری بات نہیں سن رہا تھا۔وہ کہیں اور تھا، کھویا ہوا اور پریشان۔

گیارہ ستمبر کے بعد پتہ نہیں کیوں میں نے نوکری چھوڑ دی ...... اور تاریخ پڑھنا

شروع کر دی ...... میں بش کے ایکشن کا جواز ڈھونڈنا چاہتا تھا ...... میں نے ظلم کی تاریخ کو بہت مقامات پر سٹڈی کیا بابا جان ...... کشمیر ...... بوسنیا، چیچنیا، جلیانوالہ باغ، ہلاکو، نادر شاہ، چنگیز خان ...... کھال کھنچوانے کے واقعات، پنجروں میں بند قیدی ...... ہٹلر، ہیروشیما ...... اتنے سارے مظالم جو انسان پر ہو گزرے ہیں۔ انہوں نے مجھے اور لبرل کر دیا ہے ...... میں اب اتنا لبرل ہو گیا ہوں بابا جان ...... کہ اب میں اللہ سے بھی آزاد ہو گیا ہوں۔ میں اس اللہ کے تصور کو نہیں مانتا جو حدود تو مقرر کرتا ہے، تقدیر تو لکھتا ہے ...... لیکن پکارنے پر مدد کو نہیں آتا ...... اب میں اتنا لبرل ہوں کہ میں ہر انسان کے عمل کو اس کی ذاتی ذمہ داری تصور کرتا ہوں ...... اس طرح وہ ایسے ضبط نفس کو اپنے پر عائد کرتا ہے، جو کو ڈوہ خود بناتا ہے، وہ ایسی حدود رکھتا ہے جو اس کی خود ساختہ ہیں۔

یعنی تم آواگون میں یقین رکھتے ہوں ...... جو عمل تم کرو گے اس کا دوسرے جنم میں عذاب یا ثواب بھگتو گے؟

وہ چند لمحوں کے لئے مسکرایا اور پھر بولا ...... میں لبرل آدمی ہوں۔ میں چکروں کا قائل نہیں۔ جب ایک ہی چکر میں اس قدر غم و غصہ بھگت لیا تو دوبارہ یہاں آنے کا فائدہ؟

مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اسے کہاں پھاہا رکھوں ...... زخم کا دہانہ دکھتا، لیکن نظر آتا تھا۔ اس کی ٹیس کہیں نیچے تھی۔ میں اسے تسلی دینا چاہتا تھا۔

عبد گل

جی سر

کیا تم سارتر کی طرح فرد کے لئے مکمل آزادی چاہتے ہو ...... عمل کی مکمل آزادی؟ عمل کی پوری ذمہ داری۔

نہیں بابا جان ...... انسان دورخا ہے ...... وہ ہر جگہ ہر لمحہ دوئی کا شکار ہے کوئی شخص

پابند ہوئے بغیر آزاد نہیں رہ سکتا...... زندگی دن اور رات کا اکٹھا سفر ہے حق و باطل کی جنگ سدا بہار ہے۔ میں چاہوں نہ چاہوں، لیکن اتنا ضرور مان گیا ہوں، یہ زندگی پنڈولم کا سفر ہے...... انسان زندگی اور موت کی دوئی کے درمیان...... اگر کہیں وسط میں پنڈولم کو روک سکے...... اگر جنگ اور امن کے درمیان کہیں رہ سکے تو وہ لبرل ہو سکتا ہے۔ اگر وہ بندھا ہوا بھی ہو اور آزاد بھی رہے تو وہ خوشی محسوس کر سکتا ہے......

میں قندھار جا رہا ہوں بابا جان...... اس قندھار میں رہوں گا جہاں ڈیزی کٹر اور کلسٹر بموں نے میرا بوڑھا دادا...... میری برقعے والی بہنیں اور داڑھی والے باپ کو ختم کر دیا...... جب تک میں کسی مذہب، کسی وطن، کسی خاندان کا درد سینے میں نہ بسا سکا، میں یہ نہیں جان سکوں گا کہ دوسرے لوگ بھی میری طرح اپنے وطن، اپنے کلچر، اپنے خاندان سے محبت کرتے ہیں...... جبتک میں اپنوں سے محبت نہ کر سکا تو میں کیسے سمجھ پاؤں گا کہ دوسرے لوگ بھی اسی طرح محبت کے ہاتھوں مجبور ہیں...... میں لبرل ہونا چاہتا ہوں...... انسان دوست اور...... بابا جان کسی مسلک کا پابند ہوئے بغیر انسان آزاد کیونکر ہو سکتا ہے؟ بیچارہ دوئی کا مارا جب تک پابندی کو ساتھ لے کر نہ چلے آزاد کیونکر ہو؟ میں قندھار جا رہا ہوں، جہاں اب میرا کوئی نہیں۔ صرف ملبہ ہے میرے آبائی گھر کا۔

''تم بہت سیانے ہو عبدل گل...... لیکن ایک بات مجھ بڈھے کی بھی یاد رکھنا...... تم ابھی عمل تک پہنچے ہو...... ایک چیز بے عملی بھی ہوتی ہے۔ جب تک عمل کے ساتھ بے عملی کو نہ سمجھو گے دور تک نہ جا سکو گے۔ تم بیک وقت حدود اور آزادی کو ٹٹول رہے ہو، ان دونوں کی Interpretation اگر مذہب سے کشید کی تو فلاح پاؤ گے اور اگر ان دونوں کی سمجھ بوجھ ہیومن رائٹر سے اخذ کی تو آگے پھر دوئی کا سفر ہے، تضاد کا جال ہے۔ ہیومن رائٹر پنڈولم کا سفر تیز کر دیتے ہیں۔ اسے وسط میں لانے کا کرشمہ نہیں کر سکتے۔''

مذہب تو میں کبھی کا چھوڑ چکا۔ بابا جان، مجھے اس اللہ سے کوئی واسطہ نہیں جو ظلم ہوتے دیکھتا ہے اور چپ رہتا ہے...... میں اس کی منطق سمجھ نہیں سکتا۔

ابھی گیارہ ستمبر کا زخم تازہ ہے۔ ابھی پنڈولم غم وغصہ کی طرف سفر کر رہا ہے، لیکن وہ وقت آئے گا جب سکون و راحت کی طرف بھی پنڈولم جائے گا...... پھر یاد رکھنا کہ سکون اور راحت سوائے اوپر والے کے کسی کے پاس نہیں''۔

یہ بھی آپ کا خیال ہے دنیا کی ہر شے کا پیمانہ انسان ہے اور اس کے پاس غم وغصے کے علاوہ کچھ نہیں۔

بالکل بالکل انسان ہی پیمانہ ہے جس سے دنیا کی ہر شے ناپی تولی جا سکتی ہے، لیکن معیار ہمیشہ مسلم ہوتا ہے عزیزی...... جانتے ہو جب میٹر ہاتھ میں لیں اور کپڑا ناپیں تو سارے ملک میں میٹر کی لمبائی ایک ہوتی ہے۔ کلو، پونڈ، گرام ہر مقام پر وزن میں ایک ہوتے ہیں...... ہر انسان پیمانہ نہیں ہو سکتا...... پیمانہ بھی ایسا ہونا چاہئے جو ہر عہد میں ہر مقام پر پورا ہو......

''ہاں...... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں بابا جان......''

یہی تو سوچنے والی بات ہے جان من...... انسان پیمانہ نہیں، نبی پیمانہ ہے...... اسی پر عمل تولا جا سکتا ہے، اسی پر لبرل ازم کو جانچا جا سکتا ہے۔ وہی سوچ کی درستگی کا ضامن ہے۔ بغیر نبی کے تو انسان کو پرکھنے، جانچنے، ناپنے کے لئے اپنی اپنی عقل درکار ہوگی اور تم جانتے ہو ہر انسان کی عقل پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ہر معمولی انسان کی عقل یونیورسل پیمانہ نہیں بن سکتی اور تم یہ بھی سمجھ لو، اسی لئے نبی کا امی ہونا بھی ضروری ہے۔ اس کے پاس انسانی علم نہ ہو کوئی ڈگری، کوئی تعلیم نہ ہو، وہ کسی علم کی طرف پہلے سے راغب نہ ہو، اس کی ہوٹ لائین رب سے ڈائریکٹ ہو اور وہ اسی علم کے مطابق تعلیم دے اور اسی قدر راور وہی تعلیم دے جس کا امر ہو۔

وہ ایک لمبی سانس لے کر اٹھا...... بس بابا جان بابا جان بس...... میں اب کسی اللہ

کسی نبی کو ماننے کے لئے تیار نہیں...... میں جانتا ہوں......ہم افغانیوں سے کہیں کوئی غلط عمل ہوا ہے یا پھر......ہم ضرورت سے زیادہ مذہب پرست تھے۔اس کی بھی تو سزا ہوتی ہے ناں آدرشوں کے لئے مرنا پڑتا ہے ناں......اپنے مسلک کے لئے جان سے ہاتھ دھونا کبھی کبھی ضروری ہو جاتا ہے۔

اے نفس کے چیلے! بیٹھ جاؤ اپنے لئے امید رکھو......بغیر امید کے انسان شیطان کا چیلا بن جاتا ہے۔ہم اس قدر لبرل نہیں ہو سکتے کہ ہمارے لئے کوئی امید ہی باقی نہ رہے۔

وہ کسی اور دنیا میں گم تھا۔

میں اس کے ساتھ اٹھا، لیکن اس نے میرے ساتھ چلنا گوارا نہ کیا۔لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ بائی لین کراس کر کے اس مڑتی گلی میں غائب ہو گیا۔میں اس کے پیچھے جانا چاہتا تھا، لیکن میرے ہاتھ میں ہاف اینڈ ہاف Container تھا اور رار جمند دودھ کا انتظار کر رہی تھی۔

فون کی گھنٹی بجتی ہے۔

میں چونگا اٹھا کر کندھے اور کان میں فٹ کر لیتا ہوں اور وہ واشنگ مشین میں برتن بھی فٹ کرتا جاتا ہوں اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کئے جاتا ہوں۔

ابو آپ پلیز کچھ دن کے لئے ہمارے پاس آجائیں بہو شاہدہ کہتی ہے۔

''ہاں وہ......آنا تو تھا، لین یہ بچے اب مجھ پر پوری طرح قابض ہو چکے ہیں''

میرا بچہ بھی تو آپ پر قابض ہونا چاہتا ہے۔چاہے چند دنوں کے لئے ہی سہی اس کی آواز میں روٹھنے کی ٹون تھی۔

کیوں نہیں کیوں نہیں......ضرور، ضرور...... میں خوفزدہ بڈھے کی طرح بولا۔

ابھی آجائیں ناں پھر اگلے ہفتے ہمیں آنٹی اقبال کی طرف لانگ آئی لینڈ جانا ہے۔

پتہ نہیں کیوں میرے سارے پروگرام امریکہ پہنچنے کے بعد آنٹی اقبال کے تابع

ہو گئے۔ میں کچھ گھبرا سا گیا، آنٹی اقبال چھلاوہ تھی اور میں اس کے پیچھے بھاگنے والا۔

یہ تمہاری آنٹی اقبال نہیں چھوٹتیں شاہدہ؟ کہاں جاؤ گی اتنی دور......

یہاں کوئی جگہ دور نہیں۔ ہم امریکی لوگ ہوائی جہاز سے زیادہ کار کے سفر کو پسند کرتے ہیں ابو...... بچے کو انفر میشن ملتی ہے۔ سارے راستے میں اتنے اچھے Motels ہیں۔ پتہ ہی نہیں چلتا سفر کا......

اچھا بھئی اچھا جاؤ اپنی آنٹی اقبال کے...... ہم سے تو ہی اچھی......

شاہدہ پاکستان والی بہو نہ تھی۔ یہاں فیملی نہیں تھی، اس لئے اسے میری بھی کچی پکی ضرورت تھی۔

آپ نہیں جانتے ابو...... جب میں پہلے پہل یہاں آئی ہوں تو آنٹی اقبال نے میری کیسے مدد کی...... بالکل ماں کی طرح...... ہارون تو ان سے اتنا ہل گیا تھا...... اتنا ہل گیا تھا......

ماں کی طرح......

ماں کی طرح......

میں دیر تک فون پر جہانگیر سے باتیں کرتا رہا، لیکن کہیں دماغ میں ایک جھینگر گھس کر کہتا رہا ماں کی طرح...... ماں کی طرح۔ اقبال کے متعلق میں عجیب سے مغالطے میں مبتلا ہوں۔ مجھے ایک کہانی یاد آ رہی ہے۔

ہرات کے بادشاہ کی بیٹی چاند کا ٹکڑا تھی۔ جدھر سے گزر جاتی، دیکھنے والے ششدر رہ جاتے۔ ایک روز اپنی پالکی میں سوار بازار سے گزری۔ پالکی بردار حبشی زنخنے ایک عطار کے سامنے رکے۔ شہزادی نے پالکی کا پردہ اٹھا کر دکاندار سے بات کی۔

اس وقت سیڑھیوں پر ایک درویش بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ سے روٹی کا ٹکڑا زمین پر آ رہا اور سانس بند ہونے کو آئی۔ شہزادی نے اس کی جانب مسکرا کر دیکھا۔ اب تو درویش پر لرزہ طاری ہو گیا اور وہ نیم دیوانہ جذب کی کیفیت میں چلا گیا۔ اسی طرح وہ

سات سال ان ہی سیڑھیوں پر بیٹھا شہزادی کے لوٹنے کا انتظار کرتا رہا۔ رات کے وقت آوارہ کتے اس کے ساتھ آ کر لیٹ جاتے، دن میں بلیاں اس کے اردگرد منڈلاتی رہتیں۔ لوگ اسے مجذوب سمجھ کر روٹی ڈال دیتے۔ کچھ دیوانہ سمجھ کر پتھر مارتے، لیکن درویش وہیں بیٹھا رہتا۔ عطار بالآخر اس سے اس قدر بیزار ہو کر مارنے کی ٹھانی۔

اتفاق ان ہی دنوں ایک بار پھر شہزادی کا ادھر رخ ہوا۔ جونہی اس نے شہزادی کو دیکھا، سوکھے دھانوں پانی پڑا۔ اس نے شہزادی سے کہا...... ایک سال ہے اگر اس کا جواب دے ڈالے تو میں ہرات چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔

پوچھ کیا پوچھتا ہے۔

اے چودھویں کے چاند! اس روز تو مجھے دیکھ کر مسکرائی کیوں؟

شہزادی دوبارہ مسکرا کر بولی...... ''تیری ہونق حالت دیکھ کر محظوظ ہوئی، تجھ پر ترس آیا اور مسکرا دی...... اس سے زیادہ اور کچھ نہ تھا''۔

سر جھکا کر درویش بولا...... ٹھیک ہے آپ کی ادا ٹھہری۔

شہزادی عطار میں مشغول ہوگئی، درویش نے اپنا آپ سنبھالا اور ہرات سے رخصت ہوگیا۔

کہتے ہیں اس ملاقات کے بعد درویش کو ہوش آ گیا اور وہ بغداد شہر میں مد ہنے لگا۔ وہ شہر کا مشہور ترین مصور تھا، لیکن تعجب ہے کہ وہ ہر تصویر میں ایک ہی شہزادی پیش کیا کرتا۔ اس نے ہزار تصویریں بنائیں۔ گو شہزادی وہی رہتی، لیکن اس کی ایک تصویر دوسری سے نہ ملتی تھی۔ اس نے سات سال دیوانہ رہ کر زندگی کی نیرنگی کو یک رنگ کر لیا تھا۔

جمشید اور قیصر بڑے خودمختار بچے ہیں۔ وہ ہرگز مجھ پر قابض ہو کر اپنے آپ کو پابند نہیں کرنا چاہئے۔ میں سینگ کٹا کر کبھی کبھی بچھڑوں میں شامل ہو جاتا ہوں۔ اس

وقت ہم تینوں پیکن آئس کریم کھانے میں مشغول تھے۔

''دادا لاہور میں پیکن آئس کریم ہوتی ہے......''

ہوتی ہے، لیکن وہاں کلفی ہوتی ہے زیادہ......کلفا ہوتا ہے۔

کلفی......کلفا وہ دونوں یہ لفظ سن کر بہت محظوظ ہوئے۔ وہ عام طور پر ایسے لفظوں کا گانا بنا کر ایک دوسرے کو چڑایا کرتے۔ جمشید نے امریکی ریپ دھن میں کہا کلفا کلفا۔ Sat in a Saucer Crying for the old man To come for a Boxer.

کلفا......کلفی......یو......یو......یو

کلفا......کلفی......ہو......ہو......ہو

اب دونوں نے مل کر اسے گانا شروع کیا۔ ان کے جوگرز نے لکڑی کے فرش پر ایک خاص قسم کا ردھم قائم کر لیا، جو ان کے لئے بھی مسحور کن تھا اور میرے لئے بھی......اس وقت ارجمند پہلی منزل پر وارد ہوئی۔ اس کے ہاتھوں پر کندھے کے ساتھ گروسیرز کے تھیلے پیکٹ شاپر تھے۔ وہ فرانسیسی بیکری سے ڈبل روٹی، چینی دکان سے چاول، ہندوستانی شاپ سے اچار چٹنیاں، لبنانی نان بائی سے روٹیاں اور اطالوی شاپ سے پیزا لائی تھی۔ سوائے باسمتی کے اس کے سامان میں کچھ پاکستانی نہ تھا۔

''ہائے توبہ......پھر پھر کے دیکھ دیکھ کے بھرکس نکل گیا ابو......''

اسی شاپنگ کے باعث اس کا بہت سارے نسلی گروپوں کے ساتھ تال میل رہتا تھا۔

ایک ہی مارکیٹ سے سب کچھ خرید لیا کرو۔

ناں ابو......ایک ہی مارکیٹ میں چوائس نہیں ملتی......

چوائس بھی آج کے عہد کا اور ترقی کا بہت بڑا شاخسانہ ہے۔ اسی چوائس نے Consumers Society میں روح پھونک رکھی تھی۔ اشیاء تک تو خیر تھی، لیکن

اسی چوائس کی بدولت طلاق کی شرح بھی بڑھ گئی تھی۔ اسی کی بدولت بیروزگاری کا ہوا دندناتا پھرتا تھا اور اسی پسند ناپسند کے باعث انسان ہر شہر میں اکتایا رہتا تھا۔ نئی نسل نے اسی پسند ناپسند کے باعث خودسری سیکھ لی تھی۔ جس بچے سے ماں روز صبح پوچھتی ہو۔ ''انڈہ بائیل، سنی سائیڈ اپ یا آملیٹ'' وہ بچہ صاحب رائے ہو جاتا ہے پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس رائے میں ایسی پختگی آجاتی ہے کہ وہ کسی اور کی رائے برداشت نہیں کرسکتا۔

سامان کو جگہ رکھتے ہوئے ارجمند بولی میں نے کہا تھا آج آئس کریم کی اجازت نہیں۔ نو آئس کریم ٹوڈے......

دادا نے کہا تھا جمشید نے الزام مجھ پر دھرا۔

سو واٹ ماما......وائی ناٹ آئس کریم۔ قیصر نے سوال کیا۔

وہائی؟ ......کیوں......کس لئے؟ بچے ہر لمحہ سوال ہیں۔

کیوں کہ ہم لانگ آئی لینڈ جا رہے ہیں۔

کہاں ماما؟ کہاں......

کہاں......؟ کون سی سمت میں۔ کس قدر؟ آج کی پود سوال ہے، مکمل سوال۔

لانگ آئی لینڈ......وہاں ہمیں انکل نثار نے بلایا ہے؟ یاد ہیں انکل نثار......

''یاد ہے ماماں That tall guy''

وِد براؤن Whiskers

وہ دونوں کسی پرانی یاد کو آپس میں شیئر کر کے مسکرانے لگے......پھر جمشید نے آہستہ گایا۔

Uncle Nisar was little baby

Sitting on his Mama,s Knee

Big bend tunnel on C + O

وہ دونوں شرارت سے ہنسنے لگے۔ ان کے لطیفے کا میرے اور ارجمند کے پاس کوئی سرا نہ تھا۔ یہ ان کا کوئی ذاتی جوک تھا۔

بلال کی ایک یہ بھی ہابی ہے۔ وہ کمپیوٹر پر بیٹھ کر نئے راستے نکالتا رہتا ہے۔ اس کے جو کاغذات ڈسٹ بن سے نکلتے ہیں۔ عموماً اس پر راستوں کے نقشے ہوتے ہیں۔ میں تو شاید یہ نقشے پڑھ کر سفر نہیں کر سکتا، لیکن اسے خوب مہارت ہے۔ ایسے ہی ایک نقشے کے سہارے ہم لانگ آئی لینڈ کی طرف رواں دواں تھے۔

US Route 1 South 18.3 miles

Benn turn Pike exit 24 miles

Pike Portions tolls

1 - 76 East (Exit 24, tolwards)

Philadelphia 1-476

Valley forge. (U.S 202)

Merger 1-76 E

وہ میامی سے نیو یارک 1340 میل ساؤتھ کے راستے کا نقشہ بنا کر کئی دن فائل میں رکھ کر پھاڑ دیتا ہے۔ اسے لاس اینجلز سے 2875 میل کا سفر اگر کار سے کرنا ہوت تو اسے بخوبی راستہ آتا ہوتا ہوگا۔ شمال میں اگر وسکانسن سیٹ سے اسے نیو یارک پہنچنا ہو تو وہ راستے نہیں بھولتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے مشرق، مغرب، شمال، جنوب کے حساب سے چلنے والی مین U.S راوٹ کو کہاں پکڑنا اور کہاں چھوڑنا ہے۔ ہر میجر سے بہت پہلے وہ تیار ہوتا ہے اور Exit کا اسے بخوبی علم ہوتا ہے۔ وہ کہیں جائے نہ جائے، پلان اس نیہابی کیطور پر بنا رکھا ہوتا ہے۔ اسے بھی شائد اصلی شاہراہ کی تلاش ہے۔ جسے وہ دنیاوی راستوں میں ڈھونڈتا ہے۔

ہم مسز نثار سے ملنے لانگ آئی کہ طرف روانہ ہیں۔ راستے میں ہم بار بار Hov

والی سڑک پکڑتے ہیں، جو چار رویہ سڑکوں پر بالکل بائیں ہاتھ اور آخری ہوا کرتی ہے۔ اس پر وہ کاریں چلتی ہیں، جن میں دو سے زیادہ سواریاں ہوں۔ عموماً پولیس کی کاریں کہیں نہ کہیں جھاڑیوں میں چھپی، کسی نشیب میں نقاب لگائے تیز رفتار گاڑیوں کو اچانک اوورٹیک کرکے روک لیتی ہیں۔ پولیس بہت منظم اور مددگار ثابت ہوتی ہے، لیکن تیز رفتاری کے معاملے میں ٹکٹ بھی ضرور دیتی ہے۔ بلال بھی دو ایک بار یہ ٹکٹ حاصل کرکے جرمانہ بھر چکا ہے۔

ہم سٹیشن ویگن میں سوار ہیں۔ ارجمند اور بلال سامنے والی سیٹوں پر، بچے بالکل بیک پر ہیں اور میں درمیان میں دو والی سیٹ پر بیٹھا ہوا ہوں۔ میری سیٹ کے سامنے چھوٹا سا ٹیلی ویژن بھی لگا ہے، جسے جمشید اور قیصر کبھی کبھی آگے جھل کر دیکھتے ہیں۔

بلال ڈرائیو کرتے ہوئے جمشید اور قیصر سے کہتا ہے ایک ڈچ آدمی پیٹر منیوٹ نے چوبیس ڈالر کے ٹرنکس کے بدلے مین ہیٹن جزیرے کو ریڈ انڈین لوگوں سے خریدا۔ اس کے بعد اس ڈچ جزیرے کو انگریزوں نے چھین لیا، لیکن دس پندرہ سال کے بعد پھر مین ہیٹن آئی لین ڈچ ملکیت بن گئی۔ جب امریکی بغاوت ہوئی تو اس وقت نیویارک انگریزوں کے پاس تھا۔

ارجمند اس انفرمیشن سے نہ صرف بور ہوتی ہے، بلکہ نخ جاتی ہے۔ آرام سے کار چلاؤ بلال۔ یہ امریکن ہسٹری بیان کرنے کا کون سا وقت ہے۔

بچوں کو انفرمیشن دینا ماں باپ کا فرض ہے بلال غراتا ہے۔

یہ کون سی جگہ یا وقت ہے......تم بار بار غلط اوورٹیک کر رہے ہو۔ سڑکیں بدل رہے ہو اور پھر بچے اتنی پیچھے ہیں کہ تمہاری آواز بھی وہاں تک نہیں جا رہی۔

جو کچھ بھی ہے......میرے پاس صرف یہی وقت ہے۔ میں انہیں جاہل نہیں دیکھنا چاہتا......سکول میں بہت کوچیسی ٹیشن ہے۔

گھر پر تو تمہیں سوائے فٹ بال دیکھنے کے کوئی وقت ہی نہیں ملتا...... یہاں ساری

کسر نکال رہے ہو۔

اب وہی بحث چل نکلتی ہے جو آج کے ماڈرن میاں بیوی کی زندگی میں زہر گھولتی رہتی ہے۔ دونوں اپنے آپ کو Over Worked, misunderstood اور Under-appreciated لیکن نیک دل سمجھتے ہیں۔

ہم سمندر کے نیچے سے گزرنے والی ایک ٹنل سے گزر رہے ہیں۔ میں ایک لمبی اونگھ سے جاگا ہوں۔ بلال اور ارجمند میں کسی موضوع پر خوش دلی سے اظہار ہوا ہے اور وہ دونوں ہنس رہے ہیں۔ جمشید اور قیصر چپس اور ربر گر کھا رہے ہیں۔

ماما اس نے میرے گھٹنے پر کیچپ لگا دی ہے۔ جمشید چیختا ہے۔

ڈونٹ فائٹ ورنہ تمہارے بابا کوئی ڈرائیونگ کی غلطی کریں گے اور پھر پولیس آجائے گی۔ ٹکٹ ملے گا بابا کو قریباً ساٹھ ڈالر کا......

میں مضبوط پکی ٹنل میں سے گزر رہا ہوں جو غالباً ہڈسن دریا کے نیچے بنی ہوئی ہے یا سمندر کے کسی حصے سے نیچے بنائی گئی۔ یہ ٹنل مجھے آپا کی سہیلی اقبال تک لے گئی ہے۔ قریباً پینتالیس سال پہلے کے واقعات میرے ذہن میں گھومنے لگے ہیں۔ یہ پینتالیس سال سمندر کی طرف میرے وجود کے اوپر ہیں اور میں ایک ٹنل کے ذریعے اس وقت میں جا پہنچا ہوں، جب اقبال سے میری محبت اندر ہی اندر مجھے سرنگ کی طرح کھوکھلا کئے جا رہی تھی۔

اصغری کے ساتھ میں ٹمپل روڈ سے نکل کر سمن آباد میں جا بسا تھا۔ یہ آبادی بالکل نئی تھی اور اس میں صرف کچھ این ٹائپ گھر تعمیر ہوئے تھے۔ گلبرگ اور ڈیفنس کی آبادیاں ابھی مستقبل کی کوکھ سے برآمد نہ ہوئی تھیں۔ ماڈل ٹاؤن ایک پوش علاقہ شمار ہوتا تھا جس میں اونچے چھتنارے خوبصورت درخت تھے۔ بڑے بڑے Colonial بنگلے، آٹھ آٹھ دس دس کینال کے رقبوں میں جادوگر نظر آتے تھے۔ یہ ساری بستی ہماری سوچ اور پہنچ سے باہر تھی، کیونکہ نہر کے آگے ہماری کائنات ختم ہو

جاتی تھی۔

جب بھی آپیا اپنے سسرال سے آتی، اس کی کالج کی دوست اقبال ضرور ملنے آتی۔ اقبال کی وضع قطع، لباس انداز سب اونچے سرکاری افسروں کی طاقت کا غماز تھے۔ اسے دیکھ کر مجھے اور شاہد بھائی کو احساس کمتری کا سامنا رہتا۔ ہم دونوں شاہد الیکٹرونک سٹور کی ایک معمولی سی دکان پر کام کرنے جایا کرتے تھے۔ آپیا کی شادی کے بعد شاہد مستقل طور پر دکان کی دیکھ ریکھ میں مصروف رہتے۔ انہوں نے بی اے کا امتحان دینے سے انکار کر دیا تھا۔ میں بھی کالج سے واپسی پر چند گھنٹے شاہد الیکٹرونک سٹور پر گزارتا۔ شام کو کبھی اکٹھے اور کبھی علیحدہ علیحدہ ہم دونوں کافی ہاؤس جاتے۔ یہاں کی گرما گرمی، بحثا بحثی اور خیالات کے لئے دھینگا مشتی کی فضا ہم میں جینے کی امنگ پیدا کرتی۔ ہم دونوں چوری چوری شاعر بننے کا عزم کئے بیٹھے تھے۔ میرا خیال تھا ناموری اور عزت کے لئے شاعری ایک شارٹ کٹ ہے۔ میں اپنے کھوکھلے پروفیشن کے لئے اسے بطور خوبصورت پیکنگ کے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں شاعری میں نام پیدا کر کے اقبال کے والد پر خاطر خواہ رعب گانٹھ سکتا ہوں۔ اقبال کی محبت میں کیا کچھ ہوا، کیسے ہوا۔ یہ تو میں آپ کو پھر کبھی بتاؤں گا اور اس کی تفصیلات میں شاید آپ کو کچھ اتنی دلچسپی بھی نہ ہو، لیکن میری اس سے آخری ملاقات ان کے گھر پر ہوئی۔

اقبال کے والد ڈی پی آئی تھے۔ ان کا دفتر انارکلی شروع ہوتے ہی بائیں ہاتھ پر تھا، لیکن کوٹھی ان کی جیل روڈ پر تھی۔ ان کی یہ کوٹھی الاٹ شدہ تھی، حالانکہ وہ مہاجر نہ تھے۔ گھر سے کچھ ہی دور Observatory تھی۔ میں کبھی کبھی آپیا کو اقبال سے ملانے جیل روڈ لے جایا کرتا۔ اس روز میں نے سنا کہ اقبال کی منگنی ہونیوالی ہے۔ نہ جانے مجھے کیا ہوا، کیسے ہوا، لیکن میں اکیلا ہی جیل روڈ پر پہنچ گیا۔

کوٹھی کے کشادہ برآمدے میں کرسیاں میز لگا تھا۔ میں نے اسی برآمدے میں اس

ستون کے ساتھ اپنی سائیکل ٹیک میں رکھ دی جو سارا بوگن ویلا کی بیل سے ڈھکا تھا۔

کچھ دیر میں باہر کی کرسی پر بیٹھا رہا۔ پھر اندر طلب کرلیا گیا۔

اونچی چھت والا ڈرائنگ روم مئی کے گرم خشک موسم میں خنک تھا۔ ایک ملازم میرے لئے شربت لے آیا اور کوئی تیسری مرتبہ مودب طریقے سے گویا ہوا۔ سر گھر پر کوئی نہیں ہے۔ سوائے بی بی اقبال کے۔

اس سے پہلے میں نے کسی کا نام نہ لیا تھا۔ صرف یہ کہا تھا کہ میں انتظار کرلوں گا۔ اس بار میں نے بڑی جرات سے کہا۔ بی بی اقبال کو بتائیں میں انہیں آپیا کا پیغام دینا چاہتا ہوں۔

کچھ دیر بعد اقبال آ گئی۔ اس نے لٹھے کی سفید شلوار، چنا ہوا دوپٹہ اور پھولدار پرنٹ کی قمیض پہن رکھی تھی۔ اس کے دونوں شانوں پر لمبی لمبی دو چوٹیاں لٹک رہی تھیں۔ جن میں گلابی ربنوں کے پھول نمایاں تھے۔ چہرے پر کوئی میک اپ نہ تھا۔ لیکن کشمیری رنگت دغ دغ کر رہی تھی۔ ایوننگ ان پیرس کی خوشبو سے چھت تک کمرہ معطر ہو گیا۔

السلام علیکم جی۔

وعلیکم السلام

اقبال کھڑی رہی

میں بھی کچھ دیر بگلا سا کھڑا رہا۔

آپ بیٹھئے ناں۔

آپ بھی تو بیٹھیں۔

وہ صوبے پر گھٹنے جوڑ کر بیٹھ گئی۔

جی آپیا، وہ پیام آپیکا کا؟ جی۔

آپیا آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ اسے جلد ہی ساہی وال جانا ہے۔ ان کے سسرال

والے بضد ہیں۔ اگر آپ آج کل میں کسی وقت آسکیں تو......

جی میں آجاؤں گی جی...... آج کل میں ملنے۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی، جیسے مجلس برخاست کا نوٹس دے رہی ہو۔

ایک اور بھی بات تھی۔ ذاتی سی...... مجھے علم نہیں کہ وہ بات میں کر بھی سکتا ہوں یا مجھے کرنی بھی چاہئے لیکن......

وہ پھر گھٹنے جوڑ کر بیٹھ گئی۔

مجھے آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ اقبال کے ساتھ میرا کیا رشتہ تھا؟ ہم دونوں محبت کے کس مرحلے میں تھے۔ میرے گھر پر شاہد بھائی میرے لئے ایک رکاوٹ کا باعث تھے۔ مجھے ان کی نظروں سے اس تعلق کا پتہ چلتا جو میں بھی اپنے اندر محسوس کرتا رہا۔ اسی روک کے باعث میں اقبال کی جانب پوری سپیڈ سے بڑھ نہ سکا۔ جیل روڈ کی کوٹھی میرے لئے آؤٹ آف Bounds تھی جب بھی میں آپا کو لے کر اقبال کے گھر جاتا۔ عموماً ہم ٹیکسی ان کے گیٹ پر ہی چھوڑ دیتے۔ پھر میں تو برآمدے میں بیٹھا رہتا۔ کبھی چائے پیتا، کبھی اخبار پڑھتا، لیکن میری رسائی کم ہی ڈرائنگ روم تک ہوتی۔ اگر آپا کو سارا دن گزارنا ہوتا تو پھر میں گھر چلا جاتا اور شام کو عموماً شاہد بھائی آپا کو لے کر گھر آجاتے...... اقبال سے ملاقاتیں بہت رہیں۔ اس سے باتیں بھی ہوا ہی کرتی تھیں۔ مجھے یہ بھی وہم ہو گیا تھا کہ وہ میری طرف جی جان سے مائل ہے، لیکن اس کے باوجود ہم دونوں اظہار محبت میں گونگے تھے۔ اس روز میں سر سے پاؤں تک ارادے کا زور لگا کر اس کے پاس پہنچا تھا۔

میں نے سنا ہے کہ آپ کی منگنی ہو رہی ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ اس کی گلابی سی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔

جی۔

کون خوش قسمت ہے وہ۔

خوش قسمت نہیں بدقسمت...... اقبال نے جملہ مکمل نہ کیا۔

میرے ارادے میں جرات کا اضافہ ہوا۔

ایک نثار صاحب ہیں۔

بہت امیر کبیر؟ میں نے پوچھا۔

جی...... آئس فیکٹری ہے باپ کی، خود سول سروس میں ہیں۔

بہت ہینڈسم۔

ہاں جی...... ٹینس کھیلتے ہوئے اچھے لگتے ہیں اقبال بولی۔

پھر تو مجھے کوئی بات نہیں کرنا چاہئے۔ اتنی خوبیوں والے کے سامنے...... پٹرومیکس کے آگے دیا کیا جلے...... مجھے رونا سا آگیا۔ ہال روڈ پر وہ دکان جس میں پرانے ٹائپ رائٹر ریل والے ٹیپ ریکارڈ چھوٹے چھوٹے ریڈیو، استریاں ہیٹر پڑے تھے، نظروں میں وہ سارے شیلف الماریاں گھوم گئیں۔ اپنا وہ میز بھی یاد آیا جس پر کاویا، چھوٹے اوزارت، کرنٹ دیکھنے والا پیچ کس، پلاس، ہتھوڑی، برمے پڑے تھے۔ وہ ایک مستری کی بات کیا سنے گی۔ مستری بھی ایسا جس نے کسی انجینئرنگ کالج سے تعلیم حاصل نہ کی تھی۔ بس پرانے الیکٹرک گڈز کھول بند کر کے تجربوں سے کچھ شدھ بدھ حاصل کر لی تھی۔

میری تعلیم بھی ابھی مکمل نہیں۔

مجھے معلوم ہے۔

اگر مکمل بھی ہو جائے تو ایم اے پولیٹیکل سائنس کو کون پوچھتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ لیکچرار لگ جاؤں گا، کسی قصباتی کالج میں۔ اوپر سے مہاجر بھی ہوں۔

میں نے تو ابھی بی اے کا امتحان دینا ہے۔ جی کون جانے دیا بھی جاتا ہے کہ نہیں؟

پتہ نہیں کیوں یہ جملہ مجھے گلوکوز کی ڈرپ بن کر لگا۔

ابھی شہر میں کوئی ایم بی اے، ایم پی اے، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ٹیلی ویژن ڈش کیبل نہ

تھا۔ابھی تھرڈ ورلڈ کے لئے یہ سب کچھ ایجاد نہ ہوئے تھے۔ہم لوگ تو ابھی چھرے والی بوتل پی کر ہی خوش ہوتے تھے۔کون، آئس کریم کوکا کولا، کے ایف سی، میکڈونلڈ، چینی تھائی کھانے سب ابھی وقت کی ردا میں چھپے ہوئے تھے۔ابھی موسم آتے تو محسوس ہوتے۔محبت ہو جاتی تو اس کی خوشبو سوتے جاگتے ساتھ رہتی۔سارے نظام رب العزت چلاتا اور والدین کی حکومت زندگی اور گھر پر نافذ رہتی۔بہن بھائی سے رشتہ جڑا رہتا۔دوستی آسانی سے ٹوٹنے والی چیز نہ تھی......زندگی کی آبیاری کے لئے بازار، اشتہار، مادی سہولتیں درکار نہ تھیں۔پھر اونچ نیچ کا احساس شدید تھا۔بھانت بھانت کے لوگ مختلف علاقوں سے اکٹھے ہو گئے تھے اور نئے چہرے خوفزدہ کرنے کو کافی تھے۔لوگ گھرانوں میں ذاتوں میں، طبقاتی نشیب وفراز میں بٹے ہوئے تھے۔لوگ مختلف مقامات سے اٹھ کر پاکستان میں اس امید پر آئے تھے کہ سارے اختلافات مٹا کر ایک قومی تشخص کا حصہ بن جائیں گے۔میں بھی اسی امید کو لے کر آیا تھا کہ اقبال کی محبت وہ پل ہے جو ہال روڈ کی دوکان اور جیل روڈ کی کوٹھی کو ملا سکتا ہے۔

لیکن!

اگر اقبال......آپ شاعری کو کچھ اہمیت دیتی ہوں......تو میں......ایک کوالٹی ایسی پیش کر سکتا ہوں جو نثار صاحب میں نہیں ہے۔

میرے نزدیک تو شاعری الہام کے قریب ہے، لیکن ڈیڈی شاعری کو تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔

اچھا تو میں چلتا ہوں پھر۔

بیٹھئے ناں۔

اتنی دیر میں باوردی بیرا ایک گلاس وٹو کا اور لے کر آ گیا۔کمرے میں پہلے ایوننگ ان پیرس کی خوشبو پھیلی تھی اب اس میں وٹو کا اضافہ ہوا......وہ گلاس پکڑا کر رخصت ہو گیا۔

کیا میں آپ کے ابا جی سے بات کر سکتا ہوں۔

آپ؟ کیسی بات وہ گھبرا گئی۔

میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اقبال ...... میں نے یہ جرات اپنے ان خوابوں سے مستعار لی ہے جو میں کئی سالوں سے دیکھ رہا ہوں......

لیکن اب اس کا فائدہ......وہ فیصلہ کر چکے ہیں اور وہ فیصلے بدلہ نہیں کرتے۔

میں نے محسوس کیا یا شاید میری خواہش نے اسے یوں دیکھنے پر مجبور کیا۔ایک موٹا سا آنسو اس کی گال پر موتی سا لٹک گیا۔

اسی آنسو نے میرے حوصلے بلند کر دیئے۔میں اپنے اندر فرہاد کی روح کو کلہاڑے سے نہر کھودتے دیکھ رہا تھا۔

مجھے ایک بار......صرف ایک بار اپنے ابا جی سے ملا دو...... میں ان کے منہ سے انکار سننا چاہتا ہوں۔

اقبال نے منہ پرے کر لیا اور پھر اٹھتے ہوئے بولی...... ایکسوزمی ......پھر میں کبھی ڈیڈی سے محبت نہ کر سکوں گی......اسی لئے آپ ڈیڈی سے نہیں مل سکتے۔

وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔اس زمانے میں لڑکیاں غسل خانے میں چھپ کر رویا کرتی تھیں۔

وٹو کا گلاس ختم کرنے کے بعد میں ہال روڈ کی دکان پر چلا گیا۔متذبذب تھا کہ میں اقبال کے ڈیڈی کو کیا پیش کروں۔شاید میرے ساتھ ایوننگ ان پیرس کی خوشبو چلی آئی، کیونکہ گھر پہنچ کر شاہد بھائی نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

سٹیشن ویگن لانگ آئی لینڈ کے بہت قریب تھی۔

میں بوڑھوں کی لمبی اونگھ سے جاگ کر گردوپیش کو دیکھنے میں مصروف تھا۔نہ جانے پاس سمندر کا ساحل تھا کہ ہڈسن دریا بہہ رہا تھا۔ہم مین ہیٹن جزیرے سے گزر چکے تھے کہ نہیں۔میں لانگ آئی لینڈ کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا، لیکن

ارجمند اور بلال میں زور شور کی بحث ہو رہی تھی۔ مجھے خوف تھا کہ ان کی اس گرما گرمی کے باعث کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ مجھے مختار شیخانوف کی رزمیہ نظم یاد آ گئی۔ اس قازق شاعر نے روحانیت اور اخلاقیات کے بنیادی اصولوں کے انحراف کو انسانی تشخص کی بربادی کا ضامن ٹھہرایا ہے۔ میں آپ کو بیاض قدیم کی ایک کہانی سناتا ہوں۔ اس نثری نظم کا عنوان شاید یہ تھا۔ ایک نظر آدمیوں پر یا شاید ایک موقع جو ہمیشہ عورت کو ملتا ہے۔

سنا ہے کہ اوترار کے قدیم شہر میں ایک غریب کریم نامی آدمی رہتا تھا۔ اس کے پاس ایک شاہانہ، نسل در نسل صحیح نسب کا ایک گھوڑا تھا۔ گھوڑے کی صفت تھی کہ وہ کبھی کسی بدرو سے پانی نہ پیتا، بلکہ پیاسا رہ کر کسی شفاف ندی کے انتظار میں رہتا۔ کریم کی بیٹی نے ایک دن باپ سے کہا...... تمہارا گھوڑا بہت بدخو ہے، کیوں نہ ہم اسے بیچ ڈالیں یا کسی اور گھوڑے سے اس کو بدل ڈالیں ایسے درشت گھوڑے کا فائدہ؟

کریم دکھی ہو کر بولا...... ''دیکھ بیٹی! اس کی نازک مزاجی اس میں رواں اعلیٰ خون کے باعث ہے۔ یاد رکھ ایسا حساس گھوڑا ہی پلک جھپکنے میں سب سے آگے نکل سکتا ہے۔ اپنی نسل کا افتخار ہی اس ارادے کا مضبوط اور وفادار بناتا ہے۔ مجھے ڈر ہے بیٹی تم ایسا صاحب افتخار شجاع شوہر نہیں چن سکو گی جو مضبوط کردار کا مالک بھی ہو۔ تم ایک بوڑھا ٹٹو شوہر تلاش کرو گی جو اطاعت شعار مسکین ہو...... جدھر تمہاری رضا ہو، اسے ادھر کو ہانک سکو۔ تم اس پر بیٹھ کر سواری کرو گی۔ یاد رکھو کہ راکب اور مرکب ایک سے ہوا کرتے ہیں۔ میں تمہیں انتباہ کرتا ہوں کہ مرد کو احساس عزت و افتخار ہی مرد بناتا ہے۔ جو مانگے کے سائے میں چلتا ہو، اپنی رائے نہ رکھتا ہو، اسے مرد کیسے کہیں گے؟ ہر جنس کی اپنی کشش ہے، دانش بھری عورت وہ ہوتی ہے جو گردش کے راستوں پر چلتی ہے اور اپنے دکھڑے کسی کو نہیں سناتی، نہ ہی کسی کے سامنے روتی ہے...... یاد رکھو جو عورت یہ موقع کھو دیتی ہے وہ عمر بھر رقص زیست کو روتی ہے۔''

میں دیکھ رہا تھا کہ ارجمند نے روشن پیشانی، حساس نتھنے اورا کی گردن والے بلال کو چنا تھا......وہ شاہی گھوڑے سے بیاہی گئی تھی ، لیکن اطاعت شعار، مسکین ٹٹو کی خواہش نے اس کے رقص زیست کو جنگی ورزش میں دل رکھا تھا۔

ہم لانگ آئی لینڈ کے ایسے گھر میں بیٹھے تھے جو ہر جانب سے درختوں میں گھرا جنت کا ٹکڑا لگ رہا تھا۔

سامنے نثار صاحب بیٹھے تھے۔ان کی بارہ سالہ بیٹی میرے ساتھ صوفے پر تھی۔

پتہ نہیں ڈیزی کدھر چلی گئی ہے......خیر ابھی آ جائے گی۔

انکل آپ پہلی بار لانگ آئی لینڈ آئے ہیں؟ نثار کی بیٹی سارا نے مجھ سے سوال کیا۔

ہاں بیٹی پہلی بار آئے ہیں۔ آپ تو بڑے خوبصورت علاقے میں رہتی ہیں۔

یہاں بڑے ٹوپ نوچ لوگ رہتے ہیں۔ہلری کلنٹن نے بھی یہاں گھر خریدا ہے۔ میں آپ کو دکھا کر لاؤں گی انکل۔

جمشید اور قیصر دبادب چپس کھانے میں مشغول ہیں۔ بلال اور ارجمند تھوڑی دیر پہلے ہونیوالی بحث بھول چکے ہیں۔اس وقت لگتا ہے کہ کہ ارجمند چھوٹی سی لڑکی ہے اوراس کے تسمے باندھنے والا بلال حقیقت میں اس کا بڑا بھائی ہے۔

میں انہیں سیونگ پر لے جاؤں انکل بلال؟ سارا بولی۔

ضرور۔

لیکن......ارجمند کچھ گھبرا جاتی ہے۔

بالکل سیف ہے ارجمند سامنے ہی ہے۔ وہاں ایک گارڈ بھی ہر وقت موجود رہتا ہے۔

تینوں بچے باہر نکل جاتے ہیں۔

اقبال کا کہیں اتا پتا نہیں۔صرف پینتالیس برس پہلے میں نے اسے دیکھا تھا۔نہ جانے اب کیسی لگتی ہوگی۔کیا دانتوں کا Denture اسے سوٹ کیا ہوگا؟ کیا جسم

فربہ ہو چکا ہے؟ آواز میں وہ حلاوٹ رہی تھی کہ مردانہ نام نے اس نرمی کا گلا گھونٹ دیا؟ اقبال کے ساتھ اپنے اندرونی تعلق کا میں کبھی تعین نہیں کر سکا۔ اس میں کہیں شدت نہ تھی اور اس کے باوجود گرم پانی کی بوتل کا وہ سینک تھا جو میں ابھی تک محسوس کرتا چلا آتا تھا۔ بوتل جو ابھی تک ٹھنڈی نہ پڑی تھی۔ وہ ہیٹر نہیں تھی ایک کانگڑی تھی ادھ جلی، جسے میں گود میں اٹھائے پھرتا۔ مجھے اس سے کچھ لینا دینا تھا، نہ کوئی ایسی یادیں تھیں جنہیں ہم دونوں مل کر دوہرا سکتے بس...... بس شعاعیں سی تھیں جو ڈوبتے سمے دریا کی سطح پر پڑا کرتی ہیں۔

میں نے نثار کی جانب غور سے دیکھا۔ اس کی پشت پر ایک بوڑھے قازقستان کی بڑی سی تصویر ٹنگی تھی۔ مجھے لگا یہ کریم قازقستان میرے بھید کو جانتا ہے اور مجھے کوئی نصیحت کرنا چاہتا ہے۔ قبر میں گڑے مردے سے متعلق کوئی ایسا مقولہ اس کے پاس ہے، جو میرے اندر پڑی گانٹھ کو کھول سکتا ہے۔

سامنے نثار بیٹھا تھا۔

کیا یہی نثار تھا جس کے متعلق اقبال نے کہا تھا کہ وہ ٹینس کھیلتا بہت خوبصورت لگتا ہے۔ کیا وہ نثار کوئی اور تھا جس کے مرنے کی خبر اخبار میں پڑھ کر میں نے بڑی راحت محسوس کی تھی۔

نثار کا قد چھ فٹ سے کچھ کم تھا، لیکن اب اس خمیدہ قد میں شاہ بلوط کی خوبی نہ تھی۔ ماتھا فراخ ہو کر گنجے پن میں بدل گیا تھا۔ بال سارے سفید، لیکن چمک سے عاری تھے۔ میں اسے پوچھنا چاہا کہ وہ اپنی سروس میں کہاں رہے اور میں تب انسے کتنے فاصلوں پر رہا پھر سوچا یہ تفصیلات تو ارجمند سے بھی حاصل کی جا سکتی ہیں۔ پھر ان تفصیلات سے ملنا بھی کیا تھا۔ ایک ہی شہر میں کیا پرانے دوست اجنبی نہیں ہوتے کیا۔ مجھے لگا نثار تنہائی زدہ تھا۔ بلال اور ارجمند ایسے پیش آ رہے تھے جیسے بڈھے انکلوں سے ازراہ مروت پیش آیا کرتے ہیں۔ وہ امریکنوں کا مذاق اڑانے میں مشغول تھا۔

ساتھ ہی ساتھ یوں بھی لگتا تھا کہ اسے امریکن جی جان سے پسند آئے تھے۔ گھوم پھر کروہ پاکستانیوں کے خلاف بے شمار الزامات بیان کرنے میں مشغول ہو جاتا۔

یہاں ہم لوگ کو نہیں، بھانت بھانت کے پنچھی اکٹھے و گئے ہیں۔ جس قدر Ethnic ورائٹی امریکہ میں ہے اتنی تو کہیں اور نظر نہیں آتی۔ بلال نے کہا۔

نہیں جی یہ بات نہیں ہے۔ آدمی امریکہ کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی امی گرنٹ نہیں رہتا۔ امریکن ہو جاتا ہے۔ اس کی آنول کٹ جاتی ہے اسی وقت نثار نے جواب دیا۔

نثار صاحب کے خیالات میں کہیں کوئی ٹیڑھ، ترچھا پن، کجی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہ اقبال کے شوہر ہیں تو انہوں نے اس پیاری سی لڑکی کو کیسا ٹف ٹائم دیا ہو گا۔

پاکستانی لوگوں کا ایک المیہ ہے۔ نثار صاحب صرف ایک المیہ ...... میں نے کہا۔

بلال اور ارجمند ہم دونوں بڈھوں کی گفتگو سے تھوڑے تھوڑے اکھڑے گئے تھے۔ وہ اپنے انکل نثار کا حال چال پوچھنے آئے تھے اور اب باپ اور انکل سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ میں تو شاید انہیں نیچا دکھانے کے چکر میں تھا، لیکن نثار بھی طبعاً جھکی، جھگڑالو، جنگ جو بڈھا تھا۔

وہ المیہ کیا ہے بیان کیجئے۔

''ساری دنیا کے باشندے پہلے وطن پرست ہوتے ہیں۔ بعد میں ان کی دوسری تعریفیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جرمنی کا باشندہ پہلے جرمن ہے پھر عیسائی ہے۔ اس کے بعد اس کی دوسری کوئی کوالیفکیشن پیش کی جائے گی۔ امریکن اپنا تعارف پہلے امریکن کہہ کر کراتا ہے۔ اس کے بعد کوئی اور شناخت سامنے آتی ہے۔ مثلاً اٹالین، ڈچ، جرمن کے اصلی اوریجن کا بعد میں پتہ چلتا ہے۔ وہ خدا پرست ہے کہ سیکولر خیالات کا مالک ہے۔ یہ بعد کی شناخت ہے ہندی پہلے اپنے آپ کو ہندوستانی ظاہر کرتا ہے، بعد میں آپکو پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی کون سے

مذہب کا آدمی ہے۔چینی، جاپانی ...... ایرانی، عرب سب کی پہلی پہچان اور شان ان کا وطن ہے...... ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم بھوک اور شیخی میں آ کر سب سے پہلے اپنے آپ کو لبرل، انسان دوست ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ہم دنیا میں یہ ظاہر کرنے کے درپے ہیں کہ ہم میں کوئی تعصب، گھٹیا پن اور کمینگی نہیں۔ہم اس قدر اعلیٰ وارفع ہیں کہ وطنیت ایک چھوٹی، گھٹیا اور معمولی شناخت ہے۔ہم انسان دوست ایسی متعصب باتیں نہیں کیا کرتے۔جرمن ہر قدم پر جرمن رہتا ہے، امریکن ہر لمحہ امریکہ ہوتا ہے، لیکن پاکستانی ہر وقت انسان دوست، لبرل اور بلندیوں کا شاہین ہے، اسی لئے وہ اپنی چھوٹی چھوٹی شناختیں پیش کرتا ہے وہ بھی لجاجت اور خفت کے ساتھ۔زیادہ ضرورت پڑ جائے تو وہ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرے گا۔غریب شہر ہر اجنبی کو بتائے گا کہ وہ سندھی، بلوچی، سرحدی یا پنجابی ہے۔وہ لوگ جو پاکستان کو بھی دنیا کے نقشے پر Place نہیں کر سکتے، وہ اس تعارف سے ایک دم پریشان ہو جاتے ہیں۔وطن پرستی سے تو شناخت عامہ میں کچھ سہولت ہو سکتی تھی، لیکن اس تعارف سے جان بین میں دھند بڑھتی ہے۔پھر گرگٹ کی طرح رنگ بدلے کچھ پاکستانی اپنے آپ کو شامی، ترکی، ہسپانوی ظاہر کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ہم شیخی خورے اپنے آپ کو معتبر ثابت کرنے کے لئے جابجا دوسروں کی معتبری کو اپنا شناختی کارڈ بنا لیتے ہیں۔نثار سے مجھے بغض پیدا ہو چکا تھا۔حالانکہ اس کی بنیادی وجہ کوئی نہ تھی"

ہم لوگ یہاں وطن کے ستائے ہوئے آئے ہیں۔ہم کیا وطن پرست ہو کر دکھائیں گے؟بات اتنی سی ہے نثار فوراً بدل گیا۔

ہمیں وطن رحمت کے طور پر ملا، لیکن ہم اس کے شکر گزار نہ ہوئے۔ہم لوگ دراصل نعمتوں کا شکریہ ادا کرنا نہیں جانتے۔ہم نقص بین لوگ ہیں۔ہمیں من وسلویٰ راس نہیں آتا۔ہر نعمت میں کوئی کمی دریافت کر کے ہم احسان اور شکریے کے بوجھ سے نکلنا چاہتے ہیں۔اگر ہم نے یہاں اپنے آپ کو پاکستانی اور مسلمان ظاہر کیا تو ہم اندر سے

دوہری مار کھائیں گے۔ ایک تو ہمیں ان دونوں شناختوں کا شکریہ ادا کرنا پڑے گا۔ دوسری مصیبت پہلی سے بھی بڑی ہے۔ ہمیں پاکستان اور اسلام کی لاج نبھانے کے لئے ان شناختوں کے وقار کو قائم رکھنے کے لئے بہتر کردار پیش کرنا ہوگا۔ اسی لئے ہم چھوٹی موٹی شناخت سے گزارہ چلاتے ہیں۔

نثار ترنگ میں بولتا گیا۔

بات نثار بڑے پتے کی کہہ رہا تھا، لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس کا چہرہ گفتگو سب کچھ برا لگا۔

میں نے اپنی علمیت جتانے کے لئے اور نثار سے ون اپ ہونے کے انداز میں کہا۔

نثار صاحب ہم لوگ مغرب سے مرعوب ہو چکے ہیں۔ ہمیں بھول چکا ہے کہ ہمارے پاس بھی کوئی علم ہے یا تھا، بالکل منفرد......اور جو کام اس علم کی حدود میں رہ کر یا اس کے ضابطے پر پورا نہیں اترتا، وہ بیکار ہے۔ ہم ترقی کی چکا چوند سے اس درجہ متاثر ہیں کہ اب ہمیں فلاح کے راستے پر چلتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ہم اس خیال کو ترک کرنا چاہتے ہیں کہ فلاح کے بھی کچھ فائدے ہو سکتے ہیں اور فلاح کے ہمراہ بھی ترقی ممکن ہے......فلاح کا راستہ بالآخر انسان کو بدلنے اور انعام یافتہ لوگوں کے سیدھے راستے پر ڈالنے کا عمل ہے۔ اس راستے پر جو بھی تبدیلی آتی ہے، انسان کے لئے بہتر ہے۔ خیال ہی کی پنیری لگائی جاتی ہے اور جالی کا یہ کاڑھنا ایسے بیل بوٹوں سے مشابہ ہو جاتا ہے جن کا جمال حقیقی بیلوں سے بھی خوبصورت ہوا کرتا ہے، لیکن اب ہم خیال کو واہمہ سمجھتے ہیں اور فلاح کے خیال سے بھی بھاگتے ہیں۔

مغربی معاشرہ نے لوڈو کے کھیل میں اپنا چھکا ڈال کر ترقی کی گوٹی چلا دی ہے۔ اس فیصلے کے پیچھے سائنس کی ایجادات ہی نہیں، بلکہ بھانت بھانت کیلوگوں کے ساتھ فاصلے قائم رکھتے ہوئے اپنےفائدے کے لئے مفاہمت کے ساتھ رہنے کا نسخہ بھی ہے۔ نیگرو اور براؤن لوگوں کے ساتھ رگڑ کھائے بغیر اور ان کے مذاہب کے خلاف

تلوار نکالے بنا گزران کرنے کے عمل نے مغربی معاشرے میں بڑی واضح تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ان لوگوں میں دوسرے Ethnic Groups کے ساتھ افہام و تفہیم پیدا کرنے کے لئے کچھ تبدیلی کی اشد ضرورت تھی۔ان لوگوں نے جو اکثریت میں تھے اور ترقی کے خواہاں بھی تھے۔اپنے فائدے کے لئے بھاری جنگلوں کو کاٹنے، ریل کی پٹریاں بچھانے، عمارتیں اسارنے، سڑکیں بچھانے، انڈسٹری کو چالنے کے لئے جن کالے براؤن لوگوں کو درآمد کرلیا۔ان کے ساتھ سوشل جسٹس کی خاطر نہیں، بلکہ زیر دام لانے کی پالیسی کے تحت بڑی فراخ دلی دکھائی۔اپنے لوگوں کو Racist ہونے سے روکنے کے لئے ضروری تھا کہ مذہب سے وابستگی کو Bulldozer سے ہموار کیا جائے۔اب امریکن ہولے ہولے اپنے اعتقادات اور عیسائی Doctrine کے اصولوں کو نرم کرتے کرتے اور دوسرے مذاہب کے لئے گنجائش پیدا کرتے ہوئے اس قدر ترقی پسند ہو گیا ہے کہ اس کا ایمان ہی مذہب سے اٹھ گیا۔ دراصل لبرل انسان کے پاس ایمان جیسی کوئی چیز نہیں ہوتی۔وہ ہر راستے کا مسافر ہوتا ہے، جبکہ ایک راسخ خیال پر چلنے والا اپنا راستہ چھوڑتا نہیں اور کسی اور کی راہ پر جاتا نہیں۔وہ معاف کرسکتا ہے۔دوسرے لوگوں کے اعتقادات کو غلط جانتے ہوئے بھی ان پر تنقید نہیں کرتا، لیکن وہ کسی قیمت پر اپنے خیال کو چھوڑنے پر رضا مند نہیں ہوتا۔اپنے ایمان کی اتنی بھاری قیمت وہ ادا نہیں کرسکتا، یہی سارا بکھیڑا ہے۔

نثار صاحب کا چہرہ لال بھبھوکا ہو چکا تھا۔وہ قرولی لانے والا کھوجی بن چکا تھا۔اسی وقت اقبال آگئیں۔

آؤ آؤ اقبال۔بھئی کہاں رہ گئیں تھیں تم......

کہیں نہیں نثار...... ذرا گروسریز کرنے گئی تھی۔ذرا مجھے ہلپ تو کرنا۔

کار میں سے سامان نکال لاؤ پلیز۔

کمال ہے، نہ سلام نہ دعا۔اچھی بدتمیزی ہے ڈیزی۔

ارجمند اورلال مجھے معاف کر دیں گے کوئی بات نہیں۔ یہ دونوں بڑے سویٹ ہیں۔

میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں آنٹی ...... آیئے......

ارجمند اور اقبال باہر چلی گئیں۔

میں نے سکھ کا سانس لیا۔ یہ اقبال وہ نہ تھی جس کو میں تلاش کر رہا تھا۔ یہ ایک موٹی آنٹی تھی جس کا جسم اس بات کا غماز تھا کہ وہ خوب کھانے پینے اور خوش رہنے کا فن جانتی ہے۔ ایک خیال کے بدلتے ہی خیالات کی ساری قوس قزح بدل گئی۔ یکدم مجھے نثار ایک بڑا ہی اچھا مہذب انسان نظر آنے لگا۔ نہ ہم میں کوئی نظریاتی اختلاف تھا۔ نہ ہی ہم دونوں جھگی بڈھے تھے۔ اس کے بعد گفتگو خود بخود رواں اور ملائم ہو گئی۔

واپسی پر ارجمند نے مجھے سوال کیا...... ''ابا جی آپ کو شروع میں کیا ہو گیا تھا۔ خواہ مخواہ انکل نثار سے جھڑپ رہے تھے؟ وہ تو اتنے نائس آدمی ہیں۔ آپ انہیں Pinch کر رہے تھے بار بار...... بیچارے''

''وہ بیٹے ایک حجاب آ گیا تھا...... ایک خیال کی وجہ سے۔ بڑھاپے میں انسان وسوسے کا شکار ہو جایا کرتا ہے۔ وجہ ہو نہ ہو جھگڑنا چاہتا ہے۔ خون گرم کرنے کا یہ ایک بہانہ ہے۔''

''کون سا حجاب، کونسا وسوسہ؟'' بلال نے سوال کیا۔

''پلیز آرام سے ڈرائیو کریں۔ کوئی ضرورت نہیں باتیں کرنیکی Hov والی سڑک لے لیں......''

جمشید اور قیصر پچھلی سیٹ پر بحث کر رہے تھے۔ ایک بار پھر ارجمند نے بلال کو مشورہ دے کر اپنا آپ بہتر ثابت کرنے کی کوشش میں بلال کو بھڑکا دیا تھا۔ وہ دونوں اپنی اپنی برتری ثابت کرنے میں جھگڑتے چلے گئے۔

میں سوچ رہا تھا اگر نثار کی بیوی آپیا والی اقبال نکل آتی تو کیا پھر میں ایسا ٹھنڈا ٹھار بیٹھا ہوتا۔کیا لانگ آئی لینڈ میرے اندر لانگ یادوں کو جنم دے دیتا...... ؟ انسان بھی کیا احمق مخلوق ہے۔ حالات کو اپنے جذبات سے علیحدہ کر کے دیکھ ہی نہیں سکتا۔کسی ردعمل کو فروغ دینے سے پہلے کیا تفکر کی شرط ضروری ہے؟ کیا تفکر درست سمت کے لئے اہم ہے، ہولے ہولے اقبال کو نہ دیکھ سکنے پر میرے دل میں پہلے اطمینان ابھرا پھر خوشی در آئی اور آخر میں ایسی مایوسی چھائی جس کا کوئی نام نہ تھا......

فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔

رات کافی جا چکی تھی۔ میں نے باہر نکل کر دیکھا۔کوئی فون اٹھانے نہیں آ رہا تھا۔

جی......

دوسری جانب ایک لڑکی بولی...... سنیئے...... آپ کو نیویارک میں اردو مرکز میں پہنچنا ہے۔ یہاں ایک مشاعرہ ہو رہا ہے......لڑکی نے مشاعرے کی ساری تفصیل تاریخ اور مقام مشاعرہ مجھ زبانی سمجھایا۔

اس توجہ کا شکریہ لیکن...... میرا نام ہمایوں فرید ہے۔کیا آپ کو ہمایوں فرید ہی درکار ہے؟

ہم آپ کو ہوائی جہاز کا ٹکٹ نہیں دے سکتے، لیکن اگر آپ نیویارک اپنی کار پہنچ جائیں تو مہ آپ کو گیس کے پیسے دے دیں گے۔ دراصل یہ مشاعرہ آپ کے اعزاز میں ہی کیا جا رہا ہے۔

میرے اعزاز میں؟...... لیکن میں تو اپنے ملک میں بھی مشہور نہیں۔

میں حیران رہ گیا۔ یہ کیسا اعجاز ہے کہ یہاں پہنچ کر مجھے اچانک شہرت مل گئی۔

بی بی پاکستانمیں جب بڑے بڑے مشاعرے ہوتے ہیں تو مجھے مدعو نہیں کیا جاتا......

مجھے پتہ نہیں سر، لیکن مجھے صدیقی صاحب نے آرڈر دیا تھا۔ میں نے فون کر دیا۔

مجھے تفصیل معلوم نہیں۔ میں سوچنے لگا۔ یہ صدیقی صاحب کون ہیں۔

کسی نے تو میرا نام پرپوز کیا ہوگا بی بی......

ضرور کیا ہو گا جی......فون پر بی بی کی آواز آئی، لیکن مجھے معلوم نہیں...... پاکستان سے بھی چند شاعر شریک ہوں گے۔ آپ پلیز مجھے ابھی کنفرم کردیں۔ مجھے پاکستان بھی فون کرنے ہیں۔

یہ بھی عجیب ملک تھا۔ یہاں جو پہلے شہر کے دروازے پر دستک دے دیتا، وہی بادشاہ بن جاتا۔ یہاں للو کولیاں کر کے معتبر ہو سکتا ہے؟ کہاں شاعری کہاں میری تک بندی، لیکن جب دینے والے کو چھپڑ پھاڑ کر دینا ہو تو وہ کب پوچھتا ہے؟ عزت اور رزق کے بارے میں اس کی منطق تک انسان کبھی نہیں پہنچ پاتا۔

صبح جب میں نے ارجمند سے بات کی تو وہ بڑی خوش ہوئی...... دیکھا ناں ابا جی...... دیر آید درست آید...... آپ کا ٹیلنٹ بیکار نہیں گیا سب چلیں گے......؟ ہم سب، بچوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان کے نانا کتنے بڑے آدمی ہیں۔

لیکن میرا نام کس نے دیا......کون ہو سکتا ہے وہ۔

چھوڑیں ابو کوئی ہو...... یہ سوچنے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ کے اعزاز میں مشاعرہ ہے اتنا کافی ہے، آپ Celebrity ہیں ابو آج کے بعد۔

اردو مرکز کی جانب سے میرے اعزاز میں مشاعرہ کیا گیا تھا۔ تعجب! ہم لیٹ پہنچے، اس لئے فوراً مجھے ایکس پر بٹھا دیا گیا۔ ہوٹل کے بڑے شاندار ہال میں شائقین جمع تھے۔ پاکستان سے شاعروں کا ایک گروہ محض اس مشاعرے میں شرکت کے لئے آیا بیٹھا تھا۔ جب ساری ڈائیس سج گئی اور پیلے گاؤ تکیوں سے ٹیک لگا کر شاعر اور شاعرات براجمان ہو گئیں تو ایک میری عمر کا آدمی سٹیج پر دائیں جانب سے برآمد ہوا۔ اس نے سفید اچکن، چوڑی دار پاجامہ اور سلیم شاہی جوتا پہن رکھا تھا۔ اس کی چال راج ہنسوں کی طرح اور مسکراہٹ میں نمی نمی پھوار کی سی خنکی تھی۔ اتنا خوبصورت

ڈل ایج آدمی سارے ہال میں نظر نہ آیا۔ مسٹر گریس فل مائیک تک پہنچا۔ اس دوران سارا ہال تالیوں سے گونجتا رہا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ناظرین کا من چاہا ہے۔

بیٹھ کر اس نے نزت کے ساتھ مائیکروفون کو ٹسٹ کیا اور ریشمی کھرج میں بولا۔

''اردو مرکز کی جانب سے یہ مشاعرہ آپ کیخدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ آج کی شام میں نثار احمد صدیقی آپ کا میز بان ہوں۔ صاحب صدر! ہمایوں فرید صاحب کی اجازت سے سب سے پہلے ہی اپنا کلام سنانے کی اجازت چاہتا ہوں...... اجازت ہے''۔

ابھی جب وہ تعارف کرانے کے مرحلے میں تھا ہال کے بائیں دروازے سے ایک خواب برآمد ہوا۔ اقبال ہلکے گرے لباس میں چلی آ رہی تھی۔ سامنے کی ساری قطار بھر چکی تھی۔ وہ سیدھی آئی اور Reserve اکلوتی خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔ نہ جانے اس نے کون سی خوشبو لگا رکھی ہو گی، لیکن مجھے لگا سارے میں ایوننگ انپیرس کی مہک پھیل گئی۔

جس وقت نثار غزل کا چوتھا شعر پڑھنے کے عمل میں تھا۔ میں نے اسے بے تحاشہ داد دی۔ اقبال نے پہلی مرتبہ میری جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں ویسی ہی تھیں۔ اوپر والے ہونٹ پر تل بھی وہی تھا، لیکن رنگت اب میدہ وشہاب نہ تھی۔ باسی چنبیلی کے پھولوں کی طرح چہرہ سانولے پن کی طرف مائل تھا۔ بالوں کا رنگ کالا اور سفید مل کر سلیٹی سا نظر آتا تھا اور اس نے گرے لباس ان ہی بالوں کی مناسبت سے پہن رکھا تھا، لیکن وہ بوڑھی نہیں تھی۔ وہ پہلے سے بھی جاذب نظر تھی۔

انٹرول کے دوران ہم سب Refreshments کے لئے چلے گئے۔ اقبال ایک گول میز منتخب کر کے بیٹھ گئی...... ارجمند اور بلال کچھ فاصلے پر بیٹھے کھانے پینے اور بحث کرنے میں مشغول تھے...... بچے نہ جانے کہاں بیٹھے؟ میں کھسکتا ہوا اقبال کے پاس جا بیٹھا۔ ہم دونوں کو بات شروع کرنے میں چند لمحے وقت کا سامنا ہوا۔

السلام علیکم......وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔

وعلیکم السلام......میں نے بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ جہانگیر ارجمند یہیں امریکہ میں ہیں۔میں نے تعارف کے طور پر لایعنی سی بات کی۔

آپیا کیسی ہیں؟اس نے پوچھا۔

ٹھیک ہیں۔آپ کے بچے؟

اس نے لمبی آہ بھری......وہ......اللہ نے ایک بیٹی دی تھی، لیکن وہ نارمل نہیں ہے ......اسی کے علاج کے سلسلے میں ہم یہاں امریکہ آئے بیٹھے ہیں......یہاں آکر اسے بڑا فرق پڑ گیا ہے......اب کچھ کچھ ذمہ دار بھی ہو رہی ہے......پہلے تو......

اس نے ایک گرے رنگ کا ٹیشو آستین سے نکال کر آنسو پونچھے۔

''پتہ نہیں کیوں آپ کو دیکھ کر رونا آگیا ہمایوں صاحب......ورنہ اب تو......مونا کی باتوں پر بھی رونا نہیں آتا......''

مجھے لگا اندر ہی اندر کوئی میری عمارت منہدم کرنے میں مشغول تھا اور اس کے گرنے کی آواز اقبال تک پہنچ رہی تھی۔کچھ دیر کے بعد گریس فل نثار احمد صدیقی میزوں میں راستہ بناتا ہماری طرف آیا۔اس کے سارے بال قریباً سفید تھے، لیکن چہرہ بچوں کی طرح معصوم اور کھلا کھلا تھا۔صرف آنکھوں میں عمر نے شکستگی کا گرے رنگ بھر دیا تھا۔ چال میں ٹینس کے کھلاڑی کا لچکیلا پن تھا۔وہ قریب آیا تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔

بیٹھیے بیٹھیے۔السلام علیکم۔

ہم دونوں نے اکٹھے کہا۔

یہ ہمایوں صاحب ہیں۔آپیا کے بھائی۔

نثار ایکٹروں کی طرح حسین، ڈزائنر کپڑے پہننے والے ماڈل کی طرح خوش پوش ریڈیائی آواز میں بولا......''السلام علیکم......اقبال آپیا کی بہت باتیں کرتی ہے دراصل ان کی Infatuation ابھی ختم نہیں ہوئی۔یہ اسی عہد میں رہتی ہیں۔

ہم خوش دلی سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے، لیکن میں نثار سے مات کھا گیا۔ اس میں کچھ ایسا تھا کہ میں اس سے بغض بھی پال نہ سکا۔ وہ جتنا باہر خوبصورت تھا، اس سے کہیں زیادہ اندر حسین تھا۔ میری طبیعت اس وقت پھر خباثت کی طرف مائل ہو گئی اور میں نے اس میں ایسی باتوں کی تلاش جاری کر دی جو میری نفرت کی بنیاد بن سکتیں۔

امریکہ میں مشاعرے کی روایت کو بڑی خوبی سے نیا جنم دیا گیا ہے...... ادھر پاکستان سے ہر شاعر کی یہی آرزو ہوتی ہے کہ وہ مشاعرہ پڑھنے امریکہ پہنچ جائے۔ یہ آپ کے مشاعرے احیائے اردو کے لئے بڑی خدمت کا کام دے رہے ہیں۔ میں نے بات کرنے کی خاطر کہا۔

''انسان جب وطن سے بچھڑتا ہے تو کئی چیزیں اس کے ساتھ ایسی آ جاتی ہیں جن کا بادی النظر میں اسے احساس بھی نہیں ہوتا۔ شروع شروع میں تو یار لوگوں نے مجھے کمپیئر بنا لیا، پھر خود بخود شعر مجھ میں ابلنے لگے...... ایک بات کا کریڈٹ میں اقبال کو بھی دیتا ہوں۔ اس نے شاعری سے محبت کر کے مجھے شاعر بنا دیا...... اسی نے آج آپ کو صاحب صدر بھی چنا ہے۔'' نثار بولا۔

''آپ نے ٹھیک کہا۔ مشاعروں نے امریکہ میں اردو کو نیا جنم دیا ہے۔ مجھ جیسے لوگ تن من دھن سے اس کی خدمت کر رہے ہیں اور سمجھے یہی ہمارا قومی مشن ہے''۔

میں کچھ ہاری محسوس کر رہا تھا۔ پھر میں نے اپنی شیخی میں اسے نیچا دکھانے کا رخ پیدا کیا۔

یہ تو ٹھیک ہے کہ آپ نے ان مشاعروں کے طفیل اپنی طبیعت موزوں کر لی، لیکن پیدائشی شاعر کو یہ مجاہدہ نہیں کرنا پڑتا۔ اس کے اندر ہمیشہ سے یہ جوہر موجود ہوتا ہے

......

بالکل...... بالکل مجھے اقبال نے بتایا تھا کہ آپ پیدائشی شاعر ہیں۔ آپ نے بھلے اس کی طرف توجہ نہ دی، لیکن آپ سے تو مقابلہ نہیں کیا جا سکتا......

مجھے پھر ہلکا سا احساس شکست ہوا۔

اقبال نے میری جانب دیکھا۔ اس کی نظر میں گئے دنوں کا سراغ موجود تھا۔

پتہ نہیں کیا بات ہے ہمایوں صاحب...... جب میں سرکاری افسر تھا تب مجھے لگتا تھا ہے کہ میں اور کوئی کام نہیں کر سکتا۔ پھر امریکہ آ گئے۔ مجبوری تھی۔ یہاں میں نے کئی سال بنک کی نوکری کی۔ مجھے لگا کہ میں ہمیشہ بینکر رہا ہوں۔ اب سب کاموں سے فارغ ہو کر لگتا ہے کہ میرے اندر تو ازل سے ایک شاعر رہتا تھا اور وہی ایک حقیقت تھی۔ باقی سب جھوٹ تھا...... میں شاعر کے علاوہ اور کچھ کبھی تھا ہی نہیں......

میں نے کافی کا گھونٹ نگلتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو یہ اصلی نثار تھا۔ اصلی اور روڈا نثار۔ وہ نثار جس کے مرنے کی خبر میں نے پڑھی تھی اور خوش ہوا تھا۔ نہ جانے وہ کون تھا؟ اور لانگ آئی لینڈ والا نثار؟ اور واشنگٹن ڈی سی کا چھلاوہ؟ وہ سب! یہ خوش لباس، خوش اطوار گریک مجسمہ جسے میں آنکھ بھر کر نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ساتھ تو اقبال کی اچھی گزری ہو گی...... خوش رہی ہو گی ہمیشہ۔ میں نے تاسف سے سوچا۔

ایک نوجوان نے آکر نثار کے کان میں کچھ کہا تو وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

معاف کیجئے دو تین شاعروں میں لڑائی ہو گئی ہے، مجھے ایکسوز کیجئے۔

چند قدم چلنے کے بعد وہ لوٹا اور شرارت سے مسکرا کر بولا...... ہمایوں صاحب یہ تو بتائیے یہ جتنے شاعر لوگ پاکستان سے آتے ہیں، اتنے جھگڑالو کیوں ہوتے ہیں۔ ہم تو ان کے نخرے برداشت کرتے کرتے نڈھال ہو جاتے ہیں۔ کسی کو کمرہ پسند نہیں آتا۔ کوئی کھانے کا رونا روتا ہے، کسی کو کافی سیر میسر نہیں آتی۔ کوئی سمجھتا ہے ہم نے انہیں داد سے محروم رکھا...... عجب مشکل ہے یہ کہہ کر وہ جلدی سے چلا گیا۔

اس دیوتا روپی کے سامنے میں احساس کمتری میں مبتلا ہو گیا۔ عجیب قسم کی محرومی اور غصہ میرے اندر ابلنے لگا۔

آپ کیسی ہے؟ اقبال نے کچھ دیر سے کہا۔ اسے اس سے بہتر تعارفی جملہ سوجھ نہ رہا

تھا۔

ٹھیک ہے۔

خاموشی کا لمبہ وقفہ

آپ اپنے متعلق بھی تو کچھ بتائیں ناں۔ اقبال نے سوال کیا۔ مردوں جیسا نام رکھنے والی میں بڑی نسوانیت تھی۔

پتہ نہیں یہ برسوں سے دبی ہوئی باتیں تھیں یا ایک طرح کا غصہ تھا جو اچانک لاوہ بن کر پھٹ پڑا۔

میں نے کہا...... جب تم سے آخری بار مل کر آیا...... تو دل میں ایک ہی خواہش گڑ گئی اقبال۔ مجھے ہر لمحے یہ خیال رہنے لگا کہ اگر میں کسی طرح امیر کبیر ہو جاؤں...... تو پھر تمہارے ابا جی مجھ پر مہربانی کر سکتے ہیں۔ اس خیال کی آگ نے مجھے راکٹ بنا دیا۔ پہلے میں نے مال پر دکان کھولی پھر ڈیفنس میں کوٹھی بنائی۔ تم کسی نثار صاحب سے بیاہ کر اسلام آباد چلی گئیں، لیکن امیر ہونے کے خواب نے مجھے نہ چھوڑا...... میں بلاوجہ امیر کبیر ہوتا بھی چلا گیا، لیکن امیر ہونے کے خواب نے مجھے نہ چھوڑا...... میں بلاوجہ امیر کبیر ہوتا بھی چلا گیا، لیکن شاعر نہ رہ سکا۔ شاہد بھائی شاعر بن گئے، لیکن میں نے خیالوں کا، احساسات کا پیچھا کرنا چھوڑ دیا۔ میں صرف دولت اور اسی سے وابستہ ترقی کا گاہک تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کسی دن کوئی دیکھے اور افسوس کرے کہ اس نے میرے وجود میں کیا کھو دیا ہے۔

اور آپ کے بچے...... بیوی...... بھاری پپوٹوں والی نے پوچھا۔

دو بچے ہیں، ایک بیٹا جہانگیر اور ایک بیٹی ارجمند۔ بتایا ناں بیٹی وہ سامنے بیٹھی ہے اور جہانگیر بھی یہیں ہے امریکہ میں۔

اور آپ کی بیوی؟ آپ کے حالات۔

عجیب سی بات ہے۔ شاید سبھی کے ساتھ ایسا ہوتا ہے، لیکن میں نے اپنے ساتھ یہی

ہوتے دیکھا۔ دولت کے ساتھ مصروفیات بڑھ گئیں اور جب مصروفیات اشیاء سے وابستہ ہو جائیں ترقی منزل ہو تو پھر...... نہ روح کا مسئلہ رہتا ہے نہ محبت کا...... دولت کے دریا کا بہاؤ بہت تیز ہوتا ہے۔ اقبال! انسان اپنی مرضی سے چپو چھوڑ نہیں سکتا ......بس ترقی ہی کرتا چلا جاتا ہے۔

آپ کو...... اپنی بیوی......

وہ شاید پوچھنا چاہتی تھی کہ مجھے اپنی بیوی سے کتنا پیار تھا؟ عورتوں کو اس سوال میں بڑی دلچسپی ہوا کرتی ہے۔

بڑی اچھی تھی بیچاری۔ انتظار کا کشٹ کاٹتی کاٹتی چل بسی...... یہ عورت بھی بڑی بے بس ہے۔ کوئی اس پر انتظار ٹھونستا نہیں، لیکن اس کی روح میں انتظار ہے...... شاید وہ اس لئے راہ تکتی ہے کہ کوئی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے واپس جنت میں لے جائے۔

وہ یکدم کرسی کی پشت سے سر لگا کر بیٹھ گئی۔ ایک چھوٹا سا آنسو اس کی بائیں آنکھ سے نکل کر گال پر آٹپکا۔

دیکھئے ہمایوں مونا کی ذہنی معذوری نے مجھے نڈھال کر دیا ہے...... میں اب اور کچھ برداشت نہیں کر سکتی...... میں ریزہ ریزہ ہو کر بے معنی ہو چکی ہوں۔

آپ کو تو وہ سب کچھ ملا جس کی کوئی عورت آرزو کر سکتی ہے۔

جی ملا...... یقیناً میں کسی قسم کا گلا نہیں کر سکتی لیکن...... پتہ نہیں اتنا سب کچھ بھی کیوں کافی نہ ہو سکا۔

نثار بہت امیر ہیں۔

بہت اور پھر بخیل نہیں۔ شاہ خرچ بھی ہیں۔ وہ آہستہ سے بولی۔

ایسا خوبصورت آدمی میری نظر سے نہیں گزرا...... میں نے شرم ساری سے کہا۔ گویا اس کی خوبصورتی میں میرا کوئی ہاتھ تھا یا میرا کوئی نقص پنہاں تھا۔

ہاں...... یہ بھی حقیقت ہے...... امریکن بھی انکے حسن کی تعریف کرتے ہیں۔

پھر آپ کو شاعری کا شوق تھا...... وہ بھی پورا ہو گیا۔ نثار کے اشعار سن کر لگتا ہے کہ فیض اور منیر دونوں کا رنگ اکٹھا ہو گیا ہے۔ میں نے حسد میں ڈوبی ہوئی تعریف کی۔

ہاں جی...... یہ بھی درست ہے...... لیکن سب کچھ ہوتے ہوئے ہر آرزو پوری ہو چکنے کے بعد بھی دل کچھ اور مانگتا ہے......

میں اللہ جانے کیوں آرزو کا لفظ اس کے منہ سن کر بے تاب ہو گیا۔

اور؟ اور کیا؟

آپ یہاں امریکہ ہی میں رہنے کا ارادہ رکھتے ہیں ہمایوں صاحب۔

ارجمند کام کرتی ہے۔ اس کے بچوں کو میری ضرورت ہے...... جب وہ سکولوں سے واپس آتے ہیں تو گھر پر نہ بلال ہوتا ہے نہ ارجمند۔

اگر میں آپ سے کہوں کہ پاکستان لوٹ جائیے تو؟

لیکن کیوں اقبال! میرا تو وہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ اب تو اصغری بھی لوٹ گئی اپنے خالق کے پاس......

پھر بھی لوٹ جائیے۔

کیوں...... لیکن کیوں لوٹ جاؤں...... وہاں وطن میں اب کچھ باقی نہیں رہا۔ کچھ آگے چلے گئے ہیں۔ کچھ بوریا بستر باندھے پلیٹ فارم پر تیار بیٹھے ہیں۔ فیملی سسٹم ٹوٹ رہا ہے۔ اب وہاں وہی خاندان اکٹھے ہیں جو بھیڑیوں کی قبیل سے ہیں۔ فرد کو جب مصیبت پڑتی ہے، وہ اپنے بھیڑیوں کے غول کو اکٹھا کر کے حملہ آور ہو جاتا ہے۔ ویسے کسی کے پاس دوسروں کے لئے وقت نہیں ہوتا...... تم مجھے واپس کیوں بھیجنا چاہتی ہو...... کس کے پاس؟ کون ہے وہاں میرا؟ میں کیا کروں گا وطن جا کر؟۔

میں......؟ میں اب کسی امید کو اپنے اندر جنم دے کر بھسم نہیں ہونا چاہتی۔ اتنی مدت میں نے ہر صبح مونا کے لئے امید کا دیا جلایا اور رات کو اسے بجھا کر سوئی۔ میں موت

سے پہلے مر چکی ہوں ہمایوں ۔اب جو بھی مجھے پھونک مار کر زندہ کرے گا......میرا دشمن ہوگا...... میں سیلپنگ بیوٹی نہیں ہوں ۔مجھے کوئی پرنس چارمنگ درکار نہیں ۔

کیا نثار؟نثار تمہیں زندگی کی طرف نہیں کھینچتے ۔

جس شخص میں اتنی ساری خوبیاں ہوں جو سارا وقت اپنی پرستش میں لگا ہو......لوگ اس کی پوجا کرتے ہوں، اس کے پاس دوسروں کے لئے وقت کہاں؟ کامیاب انسان دوسروں کو بھی کامیاب ہی سمجھتا ہے۔وہ ناکامی کو سمجھ نہیں سکتا۔مایوسی کی زبان نہیں جانتا۔میرا جھگڑا نثار سے نہیں ہے۔ میں تو روز ازل سے بی بی حوا کی طرح آدم کی روح کی متلاشی ہوں ......میرا تو حساب کتاب ہی الٹا ہے۔ میں تو وہی چیز مانگ رہی ہوں جو اللہ کی اپنی امانت ہے۔پھر......ایسی صورت میں مجھے زندگی سے کیا مل سکتا ہے......نہ نثار سے نہ کسی اور سے۔

کیا نثار تم سے محبت نہیں کرتے؟

کرتے ہیں ۔کرتے ہیں ۔بہت کرتے ہیں لیکن......

لیکن کیا اقبال......بتاؤ ناں لیکن کیا......

میرے اندر ایک صحرا ہے ہمایوں مجھے محبت نہیں چاہئے۔شاید میں کسی کا خدا بننا چاہتی ہوں ۔ایب نارمل مونا کے ساتھ رہ کر میں نارمل نہیں رہی......اللہ کے لئے چلے جاؤ۔اگر تم نے امریکہ نہ چھوڑا تو میں کسی اور جگہ چلی جاؤں گی......اور میرا یہاں ٹھہرنا مونا کی صحت کے لئے ضروری ہے، بہت ضروری۔ وہ کچھ کچھ نارمل ہو رہی ہے ہمایوں جی۔

ایک بار وجہ بتا دو صاف صاف الفاظ میں......میں جاننا چاہتا ہوں آپیا کی خاطر۔

''میں آپ کو بتاؤں ...... یہاں آنے سے پہلے مونا کی ذہنی حالت کو دیکھ کر میں تلملایا کرتی تھی۔میں نے مونا کے بڑے علاج کئے ۔ایلو پیتھک ، بائیو کیمیک، حکیمی علاج، ہومیو پیتھک ۔میں......مونا کو......اپنی Retarted بچی کو لے کر میں کہاں

کہاں نہ گئی۔ پھر جب میں علاج سے مایوس ہونے لگی تو میں نے تعویذ، گنڈے، صدقات، وظیفے، پیر فقیر پکڑ لئے۔ درگاہوں پر حاضریاں دینے لگ۔ میں معجزے کے انتظار میں رہتی اور وہ ہونہ چکتا۔ میں پاؤں جلی ایک روز ایک درگاہ پر جاتی، دوسرے دن کسی اور ڈیرے پر...... میرے آنسو نہ رکتے تھے...... ایک بابا جی نے میری بے قراری دیکھ کر کہا۔"

بیٹا اب تلاش بند کر دے۔ علاج سے منہ موڑ لے۔ راضی برضا ہو جا...... میں نے چیخ کر کہا۔ کیوں؟ کیوں بابا جی میں تو آخری سانس تک مونا کے لئے جدوجہد کروں گی۔ میں جو کہتا ہوں تجویز چھوڑ دے بی بی...... آپی صحت ہو جائے گی اور اگر صحت نہ ہوئی تو قرار آ جائے گا۔ بس تجویز چھوڑ دے...... بابا جی بولے۔

میں چلاتی رہی...... کیوں تجویز نہ کروں، کیوں کیوں کیوں؟

ماننے کے لئے جاننا ضروری نہیں بیٹا...... پہلے مان لو...... پھر اللہ نے چاہا تو جان بھی جاؤ گی۔ بابا جی بولے۔

اقبال چپ ہو گئی۔

یہ چپ کا وقفہ ہم دونوں پر بھاری تھا۔

آپ پلیز جلد از جلد یہاں سے چلے جائیں...... میں اب کسی امید کے حوالے نہیں ہونا چاہتی۔ پلیز مان جائیے، مان جائیے پلیز۔

میں خاموشی سے اٹھ گیا۔ اقبال نے آہستہ سے اللہ حافظ کیا۔ میں ارجمند تک پہنچا اور اسے بتایا کہ میں باہر کار میں اس کا انتظار کروں گا۔ نثار صاحب سے معافی مانگ لینا۔

آپ کی طبیعت خراب ہے تو واپس چلتے ہیں انکل بلال نے کہا۔ وہ طبعاً بھی ڈاکٹر ہے کسی کو علیل دیکھ کر تلملا اٹھتا ہے۔

نہیں ایسی ویسی کوئی بات نہیں۔ مجھے نیند آ رہی ہے...... میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔

مان لینے کے لئے بعد مجھے تھوڑی دیر تنہائی کی ضرورت تھی۔

ابا پرانے زمانے کا باپ تھا۔وہ ٹمپل روڈ پر گھر والوں سے کٹ کر گھر کے برآمدے میں چارپائی ڈالے اپنی ریٹائرمنٹ کے دن گزارا کرتا۔کبھی کبھار اس کے دفتر والے آجاتے تو کچھ دیر کے لئے برآمدے میں رونق ہو جاتی۔ورنہ وہ اپنے خالی دن اور راتیں ان پرندوں کو دیکھنے میں بسر کرتا جو دیواروں پر آکر بیٹھتے اور اڑ جاتے۔ابا ساری عمر نوکری کی چکی میں پستا رہا۔اسے دوست بنانے کا وقت نہ ملا۔رشتہ داریاں نبھانے کی نوبت نہ آئی۔قیام پاکستان کے بعد اس کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ وہ نئے لوگوں سے رابطے بنا کر نباہ سکتا۔بس دوسروں کے ساتھ رگڑ کھانے کے بجائے اس نے اپنے آپ کو ساحل بنالیا۔ہم پانی کی طرح اس کے ساتھ ساتھ ضرورت تھے،لیکن ہم ساحل کی مجبوریوں سے ناواقف تھے۔

اس روز میں گھر میں داخل ہوا۔جھٹ پٹے کا وقت تھا۔مجھے ابا نظر نہ آیا۔میں اس روز طیش میں تھا۔برآمدے میں گھستے ہی میں نے ستون کو مکا مارا تو ابا نے کھنگار کر اپنے وجود کی اطلاع دی۔

سنو ہمایوں۔

سنانے کے لئے ابا نے آج تک کبھی نہیں بلایا تھا۔کان کھینچنے والے کام اماں کے سپرد تھے۔وہ ہمیں ابا سے ایسے بچایا کرتی جیسے مرغی چوزے کو چیل کے جھپٹے سے بچاتی ہے۔

بیٹھ جاؤ۔

یہ میرے لئے نئی بات تھی۔میں چپ چاپ پائینتی کی جانب بیٹھ گیا۔

میں جانتا ہوں شاید اور تمہارے لئے یہ مشکل وقت ہے......لیکن۔

وہ کچھ دیر چپ رہا،جیسے اپنے اندر بات کرنے کے لئے صحیح الفاظ کھدیڑ رہا ہو۔

ایک راستہ وہ ہوتا ہے جو باپ بیٹے کے لئے چنتا ہے۔ایک خواب وہ ہے جو بیٹا

اپنے لئے دیکھتا ہے۔ عام طور پر روایت سے بغاوت کا خواب ہر بیٹا دیکھتا ہے۔ میں تمھیں کوئی نصیحت نہیں کرنا چاہتا، کوئی راستہ تم پر تھوپنا نہیں چاہتا۔ بس ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں۔ سنو گے؟

جب خالق حقیقی نے کھنکھناتی مٹی سے بابا آدم کو بنایا اور اس میں اپنی روح پھونک کر ابلیس سے کہا کہ لے اب تو آدم کو سجدہ کر تو ہمایوں...... روایت تو یہی تھی کہ جو حکم اللہ دیتا فوراً مانا جاتا، لیکن بغاوت نے پہلی بار بہشت میں جنم لیا۔ ابلیس نے سوچا کہ میں آدم سے بہتر ہوں، اسی لئے اس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا پہلی نافرمانی کی ایک ہی سزا ہے۔ اب تو صاحب اختیار ہے، تجھ کو میں نے ماننے والوں میں سے نہ پایا۔ یہ چیلا ماننے والوں میں سے ہوگا۔ اب تک تو جو کچھ میں نے تخلیق کیا، میرے ماننے والے ہیں۔ ابلیس چونکہ نافرمانی کیا مرتکب ہو چکا تھا، اب صاحب اختیار بھی گردانا گیا۔ اسی وقت تکبر کا شکار ہوا۔ کہنے لگا باقی سارے اختیار تو میں نہیں مانگتا، بس اتنا اختیار دے کہ میں تیرے اس لاڈے کو تیری رحمت سے مایوس کر سکوں۔ جا تجھے روز قیامت تک مہلت ہے، اللہ نے ایک نافرمانی کے کے بدلے ابلیس کو صاحب اختیار کر دیا...... تو اب تک میں نے کیا سمجھایا ہمایوں فرید۔

نافرمانی کی سزا میں ابلیس صاحب اختیار رہوا۔

بالکل...... شاباش...... شاعر کو سمجھانا آسان ہے...... اب ابلیس تاک میں رہا کہ کیسے بابا آدم کو ورغلائے اور اللہ کی رحمت سے مایوس کرے۔ مدتیں گزر گئیں۔ اللہ کی ساری مخلوق سرشت بھر بدی کرتی اور سرشت بھر نیکی پر اکتفا کرتی۔ ابھی حضرت آدم کے اندر دوئی پیدا نہ ہوئی تھی اور اسی لئے تخلیق سے محروم تھے، اداس رہنے لگے۔ وہ نہ مادے سے کچھ بنا سکے، نہ ہی اپنے وجود کی فوٹو کاپی نکال سکنے پر قادر تھے...... اپنے ساتھ رہتے جب قرن بیت گئے تو اللہ نے ان کی پسلی نکال کر ان ہی کی ہم صورت ...... ان ہی کی جنس سے عورت کو جنم دیا...... اب تک دوئی حضرت آدم کے اندر تھی۔

اب باہر بھی صورت پذیر ہوگئی...... اب شیطان کے لئے حضرت آدم کو اللہ سے مایوس کرنا آسان ہو گیا۔ انہوں نے حضرت آدم میں تخلیق کی خواہش جگائی، نفس کی چنگاری جلائی۔ اماں حوا کی دوئی سے مدد لے کر حضرت آدم کو شجر ممنوعہ سے کھانے پر مجبور کیا۔ حضرت آدم ماننے والوں سے نہ رہے۔ وہ بھی اسی نافرمانی کے مرتکب ہوئے جو ابلیس کر بیٹھا تھا۔ اب باری تعالیٰ نے حضرت آدم اور مائی حوا سے کہا۔ جاؤ نیچے اتر جاؤ۔ آج سے تم صاحب اختیار ہو۔ پہلے تم ماننے والے تھے۔ تمہارے لئے ایک ہی راستہ تھا۔ اب تمہارے اندر دو ہیں، باہر دو ہیں۔ تم زوج اور متضاد کا شکار ہوئے۔ اب تمہارے اندر ایک راستہ رب کی اطاعت ہے ہے دوسری راہ ابلیس کی ہے۔ وہ تم میں ایسی خواہشات جگائے گا جن کا پورا کرنا یا ہونا ناممکن ہوگا...... تم انتظار کی صعوبت برداشت نہ کرسکو گے۔ صبر کی ڈھال لے کر نہ چل سکو گے...... ایسے میں تم مجھ سے مایوس ہو جاؤ گے...... پھر ابلیس تم کو اپنے گروہ میں شامل کرے گا...... آج کے بعد تم صاحب اختیار ہو۔ تمہارے اندر دونوں راستے ہوں گے۔ جو لوگ اللہ کے ماننے والے ہوتے ہوئے نبی کے آگے جھکنے اور اسکی حدود کو پار نہ کرنے والے ہوں گے۔ وہ ابلیس کے اغواء سے محفوظ رہیں گے اور جو بار بار اپنے نفس کے آگے جھکے، اپنی خواہشات کی رسی سے بندھے، وہ ابلیس کے یاروں میں سے ہوں گے...... تم آج کے بعد ابلیس کی طرح صاحب اختیار ہو...... یا اللہ کا راستہ چن لو یا ابلیس کا تمہیں اختیار ہے......

جی......

مجھے اور کچھ نہیں کہنا...... یاد رکھنا صاحب اختیار کی ذمہ داری بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اسے اپنے فیصلے کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔

میں چپ چاپ اٹھ کر اندر گیا تو اماں نے مجھے بلا کر کہا...... میں تیری منگنی اصغری سے کرنا چاہتی ہوں...... تیرا کیا خیال ہے۔

میں چپ رہا۔

تو نے اسے دیکھا ہے ناں......

ایک نوکرانی صفت مسکین سی چھچھوندر میں نے کبھی کبھی گھر میں رینگتی دیکھی تھی۔

آپا سعیدہ کی نواسی ہے۔ بڑے سکھ دینے والی ہے۔

جی ٹھیک ہے جیسا آپ مناسب سمجھیں......میں ماننے والوں سے ہوں۔

اماں بھی ٹھیک تھیں۔ اصغیر نے مجھے بڑے سکھ دیئے۔ یہ اور بات ہے کہ مجھے وہ خوشی نہ دے سکی، جس کی میں خواہش رکھتا تھا۔ میں نے اقبال کی مان لی۔ یہ فیصلہ بھی سکھ دینے والا تھا......ایک بار پھر مان کر میں شانتی بھون میں داخل ہو گیا۔

پاکستان واپسی کا پلان اچانک بنا۔ ارجمند اس تجویز پر بہت جز بز ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ میں انتہائی خودغرض والد ہوں۔ اس نے اگلے پچھلے ان گنت واقعات اپنی لاگ بک میں میرے خلاف درج کر رکھے تھے۔ میں اس دعویٰ زاید المعیاد کو خاموشی سے سنتا رہا۔ پہلی بار مجھے پتہ چلا کہ میں کتنا خودغرض، عیار، بدمعاش، کینہ ور بڈھا ہوں جو ساری عمر اپنی اولاد کے کام نہ آ سکا۔ بلال اسے چپ کرانے کے انداز میں چھوٹے چھوٹے تنبیہی جملے چھوڑتا رہا، لیکن ان امدادی حربوں کا ارجمند پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ باپ دادا کے رول کو اپنے طور پر زندگی وقف الاولاد سمجھتی تھی۔ بچوں کے بچے ہو جانے کے بعد ہر نانا، نانی، دادا، دادی کا منصبی فرض تھا کہ وہ بچوں کی اولاد پالیں اور بچوں کو فراغت، آرام، تفریح اور آزادی کا تحفہ بہم پہنچائیں۔ وہ بار بار چیختی رہی۔

سنا تھا کہ اصل سے سود پیارا ہوتا ہے، لیکن ابا کے سینے میں دل ہو تب ناں۔ ان کو تو جمشید اور قیصر سے بھی پیار نہیں۔ پھر یہ کیسے ہمارے پاس رہ سکتے تھے۔

میں بھی اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن پتہ نہیں کیوں میں نے عادی مجرم کی طرح سر جھکا دیا۔

اپنا سامان پیک کرنے کے بعد آخری بار میں بیلکونی میں جا بیٹھا۔ بلال اور ارجمند ابھی کاموں سے نہ لوٹے تھے۔ سامنے بیلکونی پر گریک بڈھا سگریٹ پی رہا تھا۔ نچلے گھر میں ہندو عورت جینز اور بغیر آستینوں کی بنیان پہنے بچوں کے چھوٹے سے پلاسٹک سوئمنگ پول میں ٹیوب سے پانی بھر رہی تھی۔

سڑک صاف نہائی دھوئی لیٹی تھی۔ کوڑا اٹھانے والے گھروں کے آگے سے سارا گاربیج اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ دور گزیبو میں ایک بوڑھا امریکن پائپ لگائے نیچے نشیب کی جانب دیکھ رہا تھا۔ جیسے کچھ سمجھنے سوچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ عام طور پر جمشید اور قیصر اپنے روبکو پر ہم رنگ پیلی، سفید، نیلی اور لال چوکوروں کا مربع بنایا کرتے ہیں۔ امریکن بھی اپنے زندگی کے روبکو کو ترتیب میں لا رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ ترقی کرنے والے یہ لوگ ہمیشہ پہلے جاننے کی کوشش کرتے ہیں اور پھر مانتے ہیں۔ جو باتیں ان کی سمجھ میں آ نہیں پاتیں، وہ انہیں شیلف کر دیتے ہیں اور وہ ریگستانی لوگ، پہاڑوں کی گپھاؤں میں سمادھی لگانے والے...... وہ لوگ جنہیں فلاح درکار ہوتی ہے اور جو ترقی کے بجائے فلاح کا انتخاب کرتے ہیں وہ پہلے سر جھکا کر مضبوطی سے ایمان کی ڈوری تھام لیتے ہیں۔ پھر بیکار تجسس سے ان کی وابستگی نہیں رہتی۔ راستہ طے کرنا ہی ان کی منزل بن جاتی ہے...... خوف و حزن ان کا ساتھی نہیں رہتا۔ وہ تبدیلی سے پہلے اپنے خیال میں تبدیلی سے خوفزدہ نہیں ہوتے...... بس صبر ہی ان کی ڈھال اور انتظار ہی ان کا واحد وسیلہ بن جاتا ہے۔

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔

پھر لاحول پڑھی...... یہ گھڑی بھی کیا ایجاد تھی۔ ہمیشہ اس کی سوئیاں بھاگتی ہی رہتی تھیں۔ اس کا کام دوسروں کو بھی بھگانا ٹھہرا۔ اگر غلطی سے کبھی سوئیاں رک جاتیں تو چابی دی جاتی، بیٹری بدل جاتی۔ میں بیلکونی سے سامان اٹھا کر باہر نکل آیا۔ اپنے دونوں بیگ میں نے پورچ کے سامنے رکھ دیئے۔ یہاں سے دور تک سڑک نظر آئی

تھی۔

بیگ رکھنے کے بعد میں ایک بار پھر اندر گیا...... کلائی سے گھڑی اتار کر میں نے ٹیلی ویژن پر رکھ دی۔ اتفاق سے یہاں ایک ڈی وی ڈی کا ویڈیو ٹیپ اور بچوں کا رو بیکو پڑا تھا۔ انسانی تخلیقات کا تعاقب کرنا میری عمر کے بس میں نہ تھا۔ اقبال نے مجھے ترقی کی دوڑ سے نکال کر ایک اور راستے پر ڈال دیا تھا۔ میں نے سوچا اگر صبر کے ساتھ ہی حکم ماننے کی شرط ہے تو پھر تو یہ گھڑی بالکل بیکار ہے۔ موت کے انتظار کے لئے موت کی جانکاری اس کے متعلق سارے استفسار بیکار ہیں۔ بھلا میرے بغیر انسان موت کی حقیقت کو جان بھی کیسے سکتا ہے...... گھڑی کو کلائی سے اتارنے کے بعد بعد میں جیسے رہا قیدی کی طرح باہر نکلا...... اور خالی سڑک پر دور تک نظریں جما دیں۔

خیال آرہا کہ انتظار فلاح کے راستے کا بڑا قیمتی ٹکٹ ہے۔ جو لوگ صحراؤں کا سفر کرتے ہیں، لیکن مان کر سر جھکا کر چلتے ہیں...... موت کی راہ تکتے ہیں، لیکن امید کے ساتھ...... جنہیں مسیح موعود کا انتظار ہوتا ہے، لیکن انتظار سے زیادہ وہ کچھ نہیں سوچتے ...... جو موسموں کو بدلتے دیکھ کر اپنی پسند کی رت کے منتظر نہیں ہوتے۔ وہ جن کو علم ہوتا ہے کہ ان کا ہیر امن طوطا انہیں کبھی مل نہیں سکتا اور پھر بھی وہ آہٹ سن کر دروازے کی جانب دیکھتے ہیں اور شانت رہتے ہیں...... وہ منتظر کرم جو حکم ملنے کے بعد مانتے ہی چلے جاتے ہیں، نہ تشریحوں میں پڑتے ہیں نہ تاویلوں میں۔ جنہیں نہ جاننے کی ضرورت ہوتی ہے، نہ حکم ماننے کے لئے کسی قسم کا لالچ درکار ہوتا ہے۔ نہ جنت کی خواہش، نہ دوزخ کا عذاب...... ایسے راضی برضا ہمیشہ اندر باہر ثابت قدم رہتے ہیں۔ نہ انہیں پلٹ کر دیکھنے کی خواہش ستاتی ہے، نہ کہیں لمبے راستے پر منزل نہ پانے کی آرزو غمزدہ کرتی ہے۔ ایسے لوگ...... فلاح کے راستے پر کتنی آسانی سے چلا کرتے ہیں۔ انتظار بھی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ نہ سخت دل بناتا ہے، نہ مایوس کر سکتا ہے فلاح کے بڑے پھاٹک کی چابی یہی مان لینا ہے۔

میں نے گھڑی ضرور اتار دی تھی، لیکن میں ابھی ماننے والوں میں پوری طرح شامل نہ تھا۔ میرے دل میں ان گنت ایسے سوال تھے جو اقبال سے جواب کے خواہش مند تھے ...... مجھے اچانک امریکہ چھوڑتے ہوئے دکھ ہو رہا تھا۔ وہاں پاکستان میں میرا کون تھا؟ وہاں تو میں اس خوشی سے بھی محروم ہو جاؤں گا جو جمشید اور قیصر مجھے دیا کرتے تھے ...... مجھے تو اس بیلکونی کو چھوڑنے کا بھی دکھ تھا جہاں بیٹھ کر میں دائرے کا سفر کیا کرتا تھا۔ ماضی کی گلیوں میں گھومتا تھا۔ ادھورے مسائل کو بار بار سلجھانے میں مصروف رہتا۔ بوڑھے آدمی کو اپنی ساری اہمیت خیال ہی سے تو ملتی ہے۔

مجھے وہ دن یاد آ گیا جب میں امریکہ پہلے روز اپنی ٹرولی میں دو بیگ دھرے آیا تھا۔ مجھے اتنے بڑے ایئر پورٹ پر درست Exit کی تلاش تھی۔ پھر لمبے برآمدے میں لوگوں کا ایک ریلا کسی نئی فلائٹ سے داخل ہوا اور Escalator پر سوار ہو گا۔ میں کافی دیر سے پریشان چلا آ رہا تھا۔ مجھے ارجمند اور بلال کہیں نظر نہ آئے۔ پھر مجھے ایک سردار جی نظر آ گئے۔ میں ان کے قریب گیا جیسے پیاسا کنوئیں کے پاس جاتا ہے۔ وہ ایک لفافے سے چپس کھا رہے تھے۔

سردار جی میں کچھ گڑ بڑا گیا ہوں۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی۔ باہر جانے کا راستہ کون سا ہے؟

انہوں نے مسکرا کر میری جانب دیکھا

پہلی بار امریکہ آئے ہیں ویر جی؟

جی سر ......

"بس یہ ملک ہی ایسا ہے۔ یہاں آ کر آدمی گڑ بڑاتا ضرور ہے ...... وہ سامنے گیٹ نمبر انیس سے چلیجائیں، لفٹ لگی ہے ...... نیچے جا کر کوئی مشکل نہیں ہو گی۔ سامنے سڑک نظر آتی ہے نہ سمجھ آئے تو ضرور کسی سے پوچھ لیں۔ یہ امریکی لوگ بڑے مددگار ثابت ہوتے ہیں۔"

''میری بیٹی اور داماد کو مجھے لینے آنا تھا۔وہ تو کہیں نظر نہیں آئے ......میرا تو رونے کو جی چاہتا ہے۔''

سردار جی ذرا سا مسکرائے اور بولے''واہگرو کی سونہہ ......امریکہ میں جب بھی کوئی آتا ہے تو اس کا رونے کو جی چاہتا ہے۔ستی ویہاں سو۔اس ملک سے جب کوئی جاتا ہے تو بھی وہ روتا ضرور ہے۔پتہ نہیں کیا بھید ہے۔آنے پر بھی رونا جانے پر بھی رونا......

میرا سامان جا چکا تھا۔صرف ایک ہینڈ بیگ کندھے سے لٹکا تھا۔

بلال اور ارجمند ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے اللہ حافظ کہہ رہے تھے......قیصر اور جمشید کے اب صرف چھوٹے چھوٹے ہاتھ نظر آ رہے تھے۔پاکستان والے گیٹ وے میں داخل ہو کر ٹنل نما راستے پر چلنے لگا۔

نہ جانے کیوں میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

سردار جی ٹھیک کہتے تھے۔اس دیس میں آمد پر بھی مسافر روتا ہے اور رخصت کے وقت بھی اس کی آنکھیں نم رہتی ہیں۔

اقبال کے ساتھ کسی قسم کا مرئی رشتہ نہ تھا، لیکن اس کی بات مان لینے کے بعد یہاں وہاں کچھ باقی نہ رہا تھا۔میں کسی کو کیا بتاتا کہ بابا آدم جب اماں حوا کی بات مان چکے تو ان کے پاس جلاوطنی کے علاوہ کوئی چوائس نہ تھی!

☆☆☆☆

The End --------ختم شد-------